# ک

## کَ (حرف)

کَ - حرف جر ہے - حسب ذیل معنوں کے لئے آتا ہے -

(۱) تشبیہ کے لئے - اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ (۷/۱۷۹) - وہ مویشیوں کی طرح ہیں - ان کی مثل - ان جیسے -

(۲) سبب یا مقصد (تعلیل) کے لئے بھی آتا ہے - وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰاکُمْ (۲/۱۹۸) - تم اسے یاد کرو (اس کے قوانین کو سامنے رکھو) اس لئے کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے (یہ معانی مرزا ابوالفضل نے اخفش کے حوالہ سے لکھے ہیں) - اگرچہ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ تم اسے یاد کرو جسطرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے -

(۳) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (۴۲/۱۱) -

## کَ (ضمیر)

کَ - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مذکر حاضر کے لئے آتی ہے - ضَرَبَکَ - اس نے تجھے مارا -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُکَ - تیرا غلام -

قرآن کریم میں ہے اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (۲/۱۸۶) - "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں" - دوسری جگہ ہے اُسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّۃَ (۲/۳۵) "تو اور تیری بیوی جنت میں رہو" -

## کِ (ضمیر)

کِ - ضمیر منصوب متصل ہے - واحد مؤنث حاضر کے لئے استعمال ہوتی ہے - قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ (۳/۴۱) - "اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاک کیا" -

(۲) نیز بہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے ۔ مثلاً لِيَذَنْبِكَ (۱۲/۲۹) ۔ ''اپنے قصور کے لئے'' ۔

## ک ا س

اَلْكَأْسُ ۔ پینے کا برتن جبکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو ۔ اگر پینے کی چیز موجود نہیں تو اسے کَأْسٌ نہیں کہا جائے گا قَدَحٌ کہا جائے گا* ۔ صاحب لطائف اللغة نے کہا ہے کہ خالی پیالے کو زُجَاجَةٌ کہا جائیگا ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ خالی پیالہ یا صرف شراب (پینے کی چیز) کو بھی کَأْسٌ کہدیا جاتا ہے** ۔ خود تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔ قرآن کریم میں کَأْسٍ مِنْ مَعِيْنٍ (۳۷/۴۵) آیا ہے ۔ آب رواں سے بھرا ہوا پیالہ ۔

## کَأَنَّ ۔ (حرف)

کَ (تشبیہ) + اَنَّ (تاکید) سے مرکب ہے ۔ اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں تشبیہ بہت قوی ہو ۔ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ (۲۷/۴۲) ۔ اس نے کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے ۔ گویا وہی ہے ۔ کبھی اس کی تشدید (شد) کو دور بھی کر دیتے ہیں ۔ جیسے كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا (۱۰/۱۲) گویا ہمیں پکارا ہی نہ تھا ۔ محیط نے لکھا ہے کہ اگر کَأَنَّ کی خبر اسم جامد نہ ہو تو اس کے معنے ظن کے ہوتے ہیں ۔

## کَأَيِّنْ

كَأَيِّنْ ۔ کتنے ہی ۔ یہ زیادہ تر تعداد میں ابہام اور کثرت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے ۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ (۳/۱۴۵) ۔ کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں ۔ یعنی تعداد متعین تو نہیں لیکن کم بھی نہیں ۔

## ک ب ب

كَبَّهٗ، يَكُبُّهٗ، كَبًّا ۔ اس نے اسے اوندھا کر دیا ۔ كَبَّهٗ لِوَجْهِهٖ فَانْكَبَّ ۔ اس نے اسے منہ کے بل گرا دیا تو وہ منہ کے بل گر گیا ۔ كَبْكَبَ الشَّيْءَ ۔ اس نے اس چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف گڑھے میں پھینک دیا ۔ كَبْكَبَهٗ ۔ اسے الٹا اور پچھاڑ دیا ۔ اہل لغت نے

*تاج ۔ **راغب ۔

کہا ہے کہ کَبْکَبَ میں بار بار اوندھا ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی جس چیز کو پھینکا جائے وہ بار بار اوندھی ہو کر نیچے کی جگہ قرار گیر ہو جائے *۔ اس ''قرار گیر ہونے'' کا مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔ [کَبْکَبَ رباعی ہے اس لئے اسے الگ لکھنا چاہئے تھا لیکن چونکہ بعض ائمّہ لغت نے اسے کبب کے تحت لکھا ہے اس لئے ہم نے بھی یہیں لکھنا مناسب سمجھا ہے]۔

اَلْمُکِبُّ وہ آدمی جس کا سر جھکا ہو اور اس لئے اسکی نگاہیں زمین کیطرف رہیں۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ۔ وہ منہ کے بل گر گیا۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ عَلٰی عَمَلٍ۔ وہ کسی کام میں لگ گیا *۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ فَکُبْکِبُوْا فِیْہَا (۲۶/۹۴)۔ انہیں اس میں اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔ (خاسر و نامراد اور ذلیل و خوار)۔ سورہ نمل میں ہے۔ فَکُبَّتْ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ۔ (۲۷/۹۰) انہیں اوندھا کرکے داخل جہنم کر دیا گیا۔ سورہ ملک میں مَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْہِہٖ کے مقابل میں ہے، مَنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶۷/۲۲)۔ اس سے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس غلط روش پر چلنے والے جو تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جائے۔ اوندھی کھوپڑی کے لوگ جو ذرا عقل و بصیرت سے کام نہ لیں اور سر نیچا کئے، بلا سوچے سمجھے، غلط راستے پر چلتے جائیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو صحیح، سالم سیدھے متوازن راستے پر چلے جائیں۔

## ک ب ت

کَبْتٌ۔ کے اصلی معنی کَبَّ کے آتے ہیں۔ یعنی منہ کے بل گرا دینا۔ رسوا اور ذلیل کر دینا۔ شکست دیکر لوٹا دینا۔ ازہری نے کہا ہے کہ کَبْتٌ کی اصل کَبْدٌ ہے۔ (دال کو تاء سے بدل دیا گیا ہے) جس کے معنی جگر ہیں جو غیظ و غضب کا مخزن ہے۔ لہذا اس کے معنی ہیں دشمن کو اسکے غیظ و غضب سمیت لوٹا دینا**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنی کسی کو تشدد اور تذلیل کے ساتھ واپس کر دینے کے ہیں***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور کسی چیز سے ہٹا دینے اور پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ یَکْبِتَہُمْ (۳/۱۲۶) یا انہیں ذلیل کر دے گا۔

*تاج - راغب - محیط - **تاج - ***راغب -

سورہ مجادلہ میں ہے - كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۸/۵) جسطرح ان سے پہلے لوگ جو حق کی مخالفت کیا کرتے تھے ، ذلیل و خوار ہوئے تھے ، اسی طرح یہ بھی ذلیل و رسوا کئے جائیں گے -

## ک ب د

اَلْكَبْدُ - وَ الْكِبْدُ وَ الْكَبِدُ - جگر - اَلْكُبَادُ - درد جگر - اَلْكَبَدُ - مشقت - سختی - ٹیلہ یا آسمان کا وسط - نیز اس کے معنی استقامت اور اعتدال کے آتے ہیں * - راغب نے كَبَدٌ بمعنی كُبَادٌ یعنی درد جگر بھی لکھا ہے ** - قرآن کریم میں ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْ كَبَدٍ (۹۰/۴) فراء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ اس میں پورا پورا اعتدال اور تناسب ہے - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ تمام مشکلات اور موانع کا مقابلہ کر سکتا ہے * - اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اسطرح پیدا کیا ہے کہ اس کی ذات کی نمود اور نشوو نما سختیوں سے تصادم میں ہوتی ہے - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور قوت کے بتائے ہیں -

## ک ب ر

كِبَرٌ اور كُبْرٌ کے معنی ہیں بڑا ہونا - صِغَرٌ کی ضد ہے - اَلْكَابِر اور اَلْكَبِيْرُ - بڑا - واضح رہے کہ كَبُرَ کے معنی ہیں بڑا ہونا ( مرتبہ یا جسامت وغیرہ میں) اور كَبِرَ کے معنی ہیں معمر ہونا - اَلْكِبْرُ - کسی چیز کا بڑا حصہ - وَ الَّذِىْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ (۲۴/۱۱) - ان میں سے جس نے اس معاملہ کا بڑا حصہ اپنے سر لیا - یعنی جس شخص پر اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے - كِبْرِيَاءُ کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں - اس کا مفہوم ، آج کی اصطلاح میں ، حاکمیت اعلیٰ ( Sovereignty ) ہے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَ لَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ - وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷) ”ارض و سما (جملہ کائنات) میں اقتدار اعلیٰ صرف خدا کا ہے - وہ (بڑے) غلبہ والا ، حکمت والا ہے“ - وہ اَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ ہے (۹۵/۸) - یہی مفہوم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا ہے - یہی اقتدار خدا کے علاوہ کسی اور کا نہیں -

*تاج و محیط - **راغب -

جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو حق کی دعوت دی تو اس نے (اسکی قوم نے) کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا منشاء کیا ہے - تم (دونوں بھائی) چاہتے ہو کہ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ (۱۰/۷۸) - ''ملک میں اقتدار اعلیٰ تم دونوں کا ہو جائے'' -

تَكَبَّرَ اور اِسْتَكْبَرَ کے معنی ہیں بڑا بننا - سرکشی اختیار کرنا - اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ (۲/۳۴) - كَبُرَ عَلَيْهِ الْأَمْرُ - معاملہ اس پر شاق گذرا - گراں گزرنے کے معنوں میں (۶/۳۵ و ۱۰/۷۱ و ۴۲/۱۳) میں آیا ہے - اَلْكَبِيْرُ - سردار - نیز معلم اور استاد کو بھی کہتے ہیں - اَكْبَرَتِ الْمَرْاَةُ - اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو حیض آجائے - اور اَكْبَرَ الرَّجُلُ جب مرد کو ''مادّۂ مردمیت'' آنے لگے - چنانچہ اول الذکر معانی کی رو سے مجاهد نے کہا ہے کہ سورۃ یوسف میں جو ہے کہ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا - اَكْبَرْنَهٗ (۱۲/۳۱) - تو اس کے معنی ہیں انہیں حیض آگیا (یا مادہ خارج ہوگیا) - یعنی اَكْبَرْنَ کے معنی ہیں حِضْنَ - اور ہاء وقف کیلئے ہے * - لیکن ہمارے نزدیک یہ مفہوم بے معنی اور رکیک ہے - اس کے معنی صاف ہیں کہ جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو انہیں بہت بڑا پایا -

قرآن کریم میں اِسْتَكْبَرَ ، سجدہ اور اطاعت کے مقابلہ میں آیا ہے - (۲/۳۴ و ۱۶/۴۹) - اور ضعیف اور کمزور لوگوں کے مقابلہ میں بھی لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا (۳۴/۳۱) آیا ہے - اَدْنٰى کے مقابلہ میں اَكْبَرُ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا - اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ (۱۷/۵۱) - یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت ہی مشکل ہے -

اَلْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) - خدا کی صفت ہے - تمام عظمتوں اور بڑائیوں کا مالک - اور چونکہ خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا مومن کی اصل زندگی ہے اس لئے اس معنی میں مُتَكَبِّر ہونا مستحسن ہے - (معیوب نہیں) یعنی —

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　غیرت او بر نتابد ہمسرے

اسی کو قرآن کریم نے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸) کہا ہے - تکبر وہ برا ہے جس کی رو سے انسان یہ چاہے کہ بغیر تعمیری نتائج پیدا کئے لوگوں

---

* تاج -

سے اپنی بڑائی منوائے۔ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ‏(۱۴۶/۷)۔ یہ استبداد ہے۔

لیکن اگر اس کا مفہوم اقتدارِ اعلیٰ لیا جائے تو پھر ”تکبر“ کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ صرف خدا کے لئے مختص ہوگا۔ اس اعتبار سے آیت (۱۴۶/۷) کے معنی یہ ہونگے کہ تکبر (اقتدار اعلیٰ) صرف اَلْحَقّ کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ کِبْرٌ کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی کے نیچے نہ رہنا۔ یہ بھی انسان کے لئے جائز نہیں کیونکہ اسے قوانین خداوندی کے تابع رہنا چاہئے۔

کُبَّارٌ۔ بہت ہی بڑا (۲۲/۷۱)۔ اَلْکُبَرُ۔ بہت بڑی مصیبتوں۔(۳۵/۷۴)۔ سورۃ مدثر میں ہے کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ (۲/۷۴) اٹھ، اور لوگوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے۔ اس کے بعد ہے۔ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (۳/۷۴)۔ پہلا حصہ (یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش سے باز رکھنا) تخریبی یا تمہیدی تھا۔ یہ دوسرا حصہ مثبت یا تعمیری ہے۔ یعنی ایسا نظام قائم کردے، ایسی صورتِ حالات پیدا کر دے، ایسا نقشہ جمادے، ایسا معاشرہ متشکل کردے، کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فی الحقیقت خدا کا قانون اور اس کا نظام تمام قوانین و نظام ہائے عالم سے بلند و برتر ہے۔ نظری اعتبار سے تو دنیا کی ہر قوم بھی کہتی ہے کہ ہمارا نظام (یا مذہب) سب سے اونچا ہے۔ لیکن تم ایسا کرکے دکھا دو جس سے ہر شخص بے ساختہ پکار اٹھے کہ بے شک ہر قسم کی عظمتیں اور بڑائیاں قانون خداوندی کے لئے ہیں۔ اسی کو وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا کہا گیا ہے (۱۱۱/۱۷)۔ اور وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (۴۵/۲۹)۔ اذان اور صلوٰۃ میں اللّٰہُ اَکْبَرُ* اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں سب سے اونچا، بڑا، اور غالب نظام صرف خدا کا نظام ہے جس کے قیام اور استحکام کے لئے ہم اٹھے ہیں۔ یہی وہ اعلان (تَکْبِیْر) تھا جس سے، نبی اکرمؐ کی مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں، اسلامی مملکت میں قریب پونے تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے وسعت ہوتی گئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا رقبہ قریب بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گیا تھا۔ اور قرآنی نظام، ایرانی

*یہ لفظ (اکبر) خدا کے لئے قرآن کریم میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے اکبر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اکبر ہے ہی وہی۔

اور روسی نظاموں پر غالب آگیا تھا ۔ غور کیجئے کہ کس قدر عظیم القدر تھا یہ اعلان اور عزم جو آج ایک بے روح رسم بن کر رہ گیا ھے ۔ اقبال نے کسقدر صحیح کہا ھے کہ

ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

# ک ت ب

کَتَبَ ۔ عرب اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کی شرمگاہ میں لوھے کا چھلہ سا ڈال دیتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کے اونٹوں سے حاملہ نہ ہونے پائیں ۔ اسے کَتَبَ النَّاقَةَ کہتے تھے ۔ ابن فارس نے بھی اس معنی کی تائید کی ھے ۔ ھمارے ھاں گھوڑیوں کے ساتھ ایسا کرتے ھیں ۔ اسی طرح جب وہ اونٹنی کے نتھنوں کو چمڑے کے باریک تسمہ سے سی کر بند کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے بچہ کو سونگھ نہ سکے تو اسے بھی کَتَبَ کہتے تھے* ۔ اسی سے مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی کر بند کر دینے کے لئے بھی کَتَبَ کہتے تھے ۔ یہیں سے لفظ کِتَابٌ ھے ، جس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کرکے انہیں اس طرح مجتمع اور یک جا کر دینا تھا جس طرح بوری میں سامان بند کرکے اسے اوپر سے سی دیا جاتا ھے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ھیں ۔ اس سے کِتَابٌ کا مفہوم واضح ھوجاتا ھے ۔

اس سے ظاھر ھے کہ جب قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَابٌ کہا ھے تو قرآن کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ھڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ھوا نہیں تھا ، بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب و مدون تھا ۔ منتشر حالت میں اسے کِتَابٌ کہا ھی نہیں جاسکتا تھا ۔

کَتْبٌ ۔ چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ھے اسلئے کَتَبَ کے معنی ''اس نے لکھا'' ھوگئے ۔ اور اِکْتَتَبَ کے معنی ھیں اس نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا یا کسی سے کہا کہ وہ بولتا جائے اور یہ لکھتا جائے ( ۲۵/۵ ) ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کے معنی گھڑلینے کے ھیں ۔

کِتَابٌ کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ھیں* ۔ قرآن کریم میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ( ۲/۱۷۸ )۔ یا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ( ۲/۱۸۳ ) ۔ فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ھے ۔ یعنی جو کام قانوناً

لازم قرار دیا جائے۔ اسی لئے مجموعہ قوانین کو کِتَابٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں گوناگوں احکام و اوامر جمع ہوتے ہیں۔ ابن فارس نیز صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلْکِتَابُ کے معنی اَلْفَرْضُ اور اَلْحُکْمُ لکھے ہیں۔ لہذا، جب قرآن کریم کو کِتَابٌ کہا گیا ہے تو اس کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے وَ الَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ (۲۴/۳۳) یعنی (تمہارے غلاموں میں سے) جو آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کرنا چاہئیں۔ تحریر مانگیں۔ (۲/۲۳۵) میں حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتَابُ اَجَلَہٗ کے معنی ہیں جب عدت کی حد جو از روئے قانون خداوندی مقرر ہو گئی ہے، اپنی آخری میعاد تک پہنچ جائے۔

سورۃ یونس میں ہے لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹)۔ ''ہر قوم کے لئے ایک میعاد ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتٰبٌ (۱۳/۳۸) ہر میعاد کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھالے۔ جو چاہے اسے گھٹالے۔ خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔ اس قانون کے مطابق اپنی مدتِ حیات کو گھٹانا بڑھانا، ہر قوم کے اپنے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سورۂ آلِ عمران میں ہے مَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴)۔ کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی میعاد کا تعین کرتا ہے۔ وَ مَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ (۳۵/۱۱)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا، خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کے مطابق اپنی عمر بڑھالے، جس کا جی چاہے اسے گھٹالے۔ (انسان جب جی چاہے خودکشی کر کے مر سکتا ہے۔ اور بد پرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدتِ عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی (۶۳/۱۱)۔

تفسیرالمنار میں ہے کہ کِتَابٌ بمعنی مَکْتُوْبٌ ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِکَ الْکِتَابُ (۲/۲) سے اشارہ کرنے میں

حکمت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف قرآن کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا * - قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا - لہذا مکتوب صورت میں صرف قرآن کریم ہی موجود تھا جسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے -

قرآن کریم میں کِتَاب کا لفظ قانونِ خداوندی یا ضابطہ قوانین خداوندی کیلئے آیا ہے - اور چونکہ قرآن کریم خود ضابطہ قوانین الٰہیہ ہے اسلئے یہ کتاب اللہ ہے - یعنی قوانین خداوندی کا مجموعہ مرتب اور محفوظ شکل میں -

قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے - یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا - قرآن کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے - سورۂ انفطار میں ہے وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ - كِرَامًا كَاتِبِيْنَ - يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ($\frac{۸۲}{۱۰-۱۲}$) تم پر (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لئے ہیں - وہ "معزز لکھنے والے" ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو - كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کی تفسیر يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ نے کردی - یعنی علم رکھنے والے - جاننے والے - ان معنوں میں یہ لفظ (كَتَبَ) اور جگہ بھی آیا ہے - مثلاً سورۃ طور میں ہے اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ($\frac{۵۲}{۴۱}$) - یہاں يَكْتُبُوْنَ کا مفہوم "جاننا" ہے - یا سورۃ انبیاء میں ہے وَ اِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ ($\frac{۲۱}{۹۴}$) - سورۃ نمل ($\frac{۲۷}{۲۸}$) میں كِتَاب کا لفظ خط کے لئے آیا ہے - یہی وہ کتاب (چٹھی) ہے جس کے علم کا ذکر ($\frac{۲۷}{۴۰}$) میں آیا ہے -

قرآن کریم میں كِتَاب اور حِكْمَت آیا ہے - اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے - (دیکھئے عنوان ح - ک - م) - كِتَاب کے معنی ہیں قانون - اور حِكْمَت کے معنی ہیں اُس قانون کی غرض ، غایت ، مقصد ، نتیجہ - (The why of it) - مثلاً كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ($\frac{۲}{۱۸۳}$) - تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں (یہ کتاب یا قانون ہے - اور) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ - اس قانون کی حکمت ہے - یعنی اس قانونِ خداوندی سے مقصد یہ ہے - اس کی غایت یہ ہے - اس کی علت یہ ہے - اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہو سکو - قرآن کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں - اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ

*تفسیر المنار ج/۱ - صفحہ ۱۲۳ -

مرتب ہو رہا ہے جیسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے ۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس قانون کی محض رسم پوری ہو رہی ہے ، فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہو رہا ۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآن کریم نے بیان کیا تھا ۔ اسی کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں ۔ اور ہم انہیں اسی طرح ادا کئے جا رہے ہیں ، اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی ، ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا ۔ حالانکہ قرآن کریم نے ان کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی ۔ اگر ان کے نتائج (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہورہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئیے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہورہا۔ لہذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہونگے ۔

کِتَاب° اور حِکْمَت° ( قانون اور اس کے نتائج ) دین کا بنیادی نقطہ ہے ۔ یعنی قرآن کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشندہ نتائج جو اس دنیا میں سامنے آ جاتے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے ۔ اس لئے جہاں قرآن کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا ۔ اگر قرآن کریم سے یہ معلوم اور متعین کرلیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے یا نہیں ۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے ۔

## ک ت م

کَتْم° کے معنی ہیں چھپانا ۔ رَجُل° کَتُوْم° ۔ راز کو چھپانے والا آدمی ۔ سِرٌّ کَاتِم° ۔ پوشیدہ اور چھپا ہوا راز*۔ قرآن کریم میں کَتْم° ۔ بمقابلہ اِبْدَاء° آیا ہے (۲/۳۳) ۔ نیز اِخْرَاج° ( باہر نکالنے ) کے مقابلہ میں ۔ (۲/۴۲) ۔ نیز بَیَّنَ ( ظاہر کرنے ) کے مقابلہ میں (۳/۱۸۶ ؛ ۲/۱۵۹) ۔ اور جَهْر° کے مقابلہ میں بھی (۲۱/۱۱۰) ۔ اس سے کَتْم° کے معنی واضح ہوجاتے ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ کَتْم° معانی کے پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اور سَتْر° محسوس اشیاء کے پوشیدہ رکھنے کو ۔

---

*تاج ۔

سورہ آل عمران میں ہے لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۳/۷۰) ۔ تم حق کو باطل کے ساتھ ملاتے کیوں ہو۔ اور حق کو چھپاتے کیوں ہو؟ یعنی حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم ۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہئے اور اسے ظاہر کرتے رہنا چاہئے ۔ قرآن کریم حق بلا آمیزش ہے ۔ لہذا قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کو نہیں ملانا چاہئے ۔ اور اسے نکھار اور ابھار کر سامنے لانا چاہئے۔

# ک ث ب

اَلْكَثْبُ ۔ کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور ڈھیر بنا دینا ۔ پانی وغیرہ کو اوپر سے گرا دینا ۔ اِنْكَثَبَ الرَّمْلُ ۔ ریت اکٹھی اور مجتمع ہو گئی ** ۔ اَلْكَثِيْبُ ۔ ریت کا ٹیلہ ۔ اَلْكُثْبَاءُ ۔ مٹی * ۔ قرآن کریم میں ہے کہ انقلاب عظیم کے وقت یہ بڑے بڑے سرداران قوم (جِبَالٌ) كَثِيْبًا مَهِيْلًا (۷۳/۱۴) ہو جائیں گے ۔ یعنی ایسے ریت کے تودے جو نیچے سے سرکتے ہوئے چلے جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنا مقام چھوڑ کر نیچے گر جائیں ۔ اَكْثَبَ الصَّيْدُ کے معنی ہیں شکار، شکاری کے ہتھے چڑھ آگیا ۔ (ابن فارس و راغب)

# ک ث ر

كَثْرَةٌ ۔ قِلَّت کی ضد ہے ۔ اسکے معنی ہیں زیادہ ہونا ، فراوانی ، بہتات ۔ اَكْثَرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بہت مالدار ہو گیا ۔ اِسْتَكْثَرَ مِنَ الشَّيْءِ ۔ کسی چیز میں سے زیادہ لینے کی رغبت کرنا * ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶) ۔ زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کر۔ اَلْكَوْثَرُ ۔ ہر چیز جو کثیر ہو ۔ خیر کثیر ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تفسیر المقام المحمود میں لکھا ہے کہ الکوثر سے مراد خود قرآن کریم ہے ، کیونکہ حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے اور قرآن کریم سراپا حکمت ہے ۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ اور آپ کی جماعت پر مخالفین کی طرف سے دنیا تنگ کی جارہی تھی اور حالات سخت نا مساعد ہو رہے تھے ، حتکہ نظر آتا تھا کہ آپ کو اپنا وطن تک بھی چھوڑنا پڑیگا ، توعین اس عسرت کے زمانہ میں آپ سے کہا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ، نظام خداوندی کی تشکیل

*تاج ۔ **محیط ۔

کا ابتدائی دور عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے اور تمہیں زندگی کی خوش گواریاں بڑی افراط سے ملینگی ۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸/۱) ۔ چنانچہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں یہ وعدہ حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آ گیا ۔

یہ خیال بھی ہے کہ عبرانی زبان میں کوشر حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں ۔ (چنانچہ یہودیوں کا ذبیحہ اب بھی کوشر کہلاتا ہے) اور کوثر اسی سے معرب ہے ۔ اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸/۱) کے معنی ہونگے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا" ۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے عنوان، ن ۔ ح ۔ ر) لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی خیر کثیر زیادہ موزوں ہیں ۔

كَثُرَ ۔ بہت ہونا ۔ زیادہ ہونا (ؔ) ۔ كَثَّرَ ۔ بڑھانا ۔ زیادہ کر دینا ۔ (۸۶/ ) ۔ اَكْثَرَ ۔ زیادہ کرنا ۔ (۱۱/۳۲) ۔ تَكَاثُرٌ ۔ ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھنے کی کوشش کرنا (۱۰۲/۱) ۔ اِسْتَكْثَرَ ۔ بہت زیادہ حاصل کر لینا (۱۸۸/ ) ۔ بہت فائدہ اٹھا لینا (۱۲۹/ ) ۔

قرآن کریم میں ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱۰۲/۱) ۔ ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس تمہیں زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے مال و دولت زندگی کی زینت کا باعث ہیں (۳/۱۴) اس لئے ان کے حصول کی خواہش کوئی بری بات نہیں ۔ لیکن زندگی کا مقصد یہ قرار دے لینا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے چلے جائیں تاکہ ہم دوسروں سے بڑھ جائیں اور ان کے مقابلہ میں فخر کر سکیں (۵۷/۲۰) بڑی پست سطح کی ذہنیت ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان میں اس قسم کی خواہش پیدا ہو جائے تو کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچکر اس کی ہوس کی تسکین ہو جائے ۔ انسان ساری عمر اس میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۲) حتکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ بھی معیوب نہیں لیکن اس کا میدان اور ہے ۔ تم ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو ذاتی جوہر اور نوع انسان کی عالمگیر بھلائیوں کے کام میں بڑھنے کی کوشش کرو جس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے (۵۷/۲۱) ۔ مال، مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ مقصود بالذات نہیں ۔ حتکہ انسان کی پوری طبیعی زندگی ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) ہے ۔

---

*تاج ۔

بجائے خویش مقصد (End) نہیں ۔ مال (یا طبیعی زندگی) کو مقصود بالذات اور زندگی کا منتہٰی سمجھ لینا بڑی غلطی ہے ۔ مقصود ، انسانی ذات کا نشوونما ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے ہوتی ہے ۔ مال کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ رہنا چاہیئے ۔

## ک د ح

اَلْکَدْحُ ۔ سعی و مشقت ۔ کوشش ۔ سعی پیہم ، مسلسل جدوجہد ۔ کَدَحَ رَأْسَهٗ بِالْمُشْطِ ۔ اس نے کنگھے سے اپنے بالوں کو سلجھایا ۔ کَدَحَ لِعِیَالِهٖ ۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ سے اپنے اہل و عیال کے لئے کمایا* ۔ اس میں دراصل ایسی مشقت کا پہلو ہوتا ہے جو جگر پاش ہو ۔ کیونکہ '' بِهٖ کَدْحٌ '' کے معنی ہوتے ہیں اس پر ذرا گہرا زخم لگا ہوا ہے* ۔

قرآن کریم میں ہے یَآاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (۸۴/۶) ۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ '' جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوجائیگا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش و خرم واپس آجائیگا ۔ لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائیگا وہ ہلاکت کو پکاریگا'' ۔

اس آیت (۸۴/۶) کا مفہوم دو طرح پر لیا جاسکتا ہے ۔ تاج اور محیط میں ہے کہ کَدَحَ لِنَفْسِهٖ کے معنی ہیں ''اس نے اپنے لئے اچھے یا برے کام کئے'' ۔ اس اعتبار سے آیۂ زیر نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان خواہ اچھے کام کرے خواہ برے ، ان کے نتائج اس کے سامنے آکر رہینگے ۔ '' خدا کی ملاقات '' کے معنی اس کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہیں ۔

لیکن اگر آیت کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ''اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف جانے کے لئے مشقتیں اٹھانی ہوں گی ۔ انہیں برداشت کر کے پھر اپنے رب کے سامنے جا سکیگا'' ۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کو بہرحال اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے ۔ لیکن اسکے لئے اسے مشقتیں اٹھانی پڑینگی ۔ اگر اس نے وحی کا اتباع کیا تو مخالفین کی طرف سے اسے تکلیفیں پہنچیں گی ۔ لیکن یہ راستہ مقابلۃً آسان ہوگا ۔ اور اگر اس نے وحی کا اتباع نہ کیا اور عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کیا تو اس سے اسے بڑی جگر پاش مشقتوں اور زخموں اور جراحتوں

---

* تاج و راغب نیز ابن فارس ۔

کے بعد وہاں تک پہنچنا نصیب ہوگا۔ اس کی مفاد پرستیاں اس کا رخ پیچھے کی طرف موڑینگی اور زمانے کے تقاضے اسے آگے کی طرف کھینچیں گے۔ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اسی منزل کی طرف آ رہا ہے لیکن چونکہ اس نے وحی کے بجائے عقل کا تجرباتی طریق اختیار کر رکھا ہے اس لئے اسے اس کے لئے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑ رہی ہیں۔ غور کیجئے! کسقدر کشت و خون کے بعد اس کا ایک قدم صحیح منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ اگر یہ وحی کی سمت اختیار کرتا تو اس کا راستہ مقابلۃً آسان ہوجاتا۔

## ک د ر

اَلْکُدْرَۃُ مِنَ الْاَلْوَانِ۔ گدلا پن (خواہ کسی رنگ میں ہو) رنگ کا صاف نہ ہونا۔ بعض نے کہا ہے کہ کُدْرَۃٌ کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور کُدُوْرَۃٌ کا استعمال پانی اور چشمہ میں۔ اور کَدَرٌ کا استعمال ہر چیز میں۔ کَدِرٌ کَدِیْرٌ۔ گدلی اور میلی چیز جو صاف نہ ہو۔ اَلْکَدَرَۃُ مِنَ الْحَوْضِ۔ تالاب کی تہ نشیں مٹی یا اس پر چڑھ جانے والی کائی۔ اَلْکَدَرَۃُ۔ مٹی کا بڑا سا ڈھیلا یا بڑا پتھر جسے زمین سے اکھیڑ کر الگ کر لیا گیا ہو۔ اِنْکَدَرَ۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف جھپٹا۔ اَلْاِنْکِدَارُ۔ کسی چیز کے بکھر جانے سے جو تغیر واقع ہوتا ہے اسے کہتے ہیں **۔ اِنْکَدَرَ عَلَیْہِ الْقَوْمُ۔ قوم گروہ گروہ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) گدلا پن، صفائی کی ضد اور (۲) حرکت کے ہیں۔ نیز اِنْکَدَرَ کے معنی ہیں تیز رفتار ہوا۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ (۸۱/۲)۔ اس کے لفظی معنی ہیں جب ستارے گدلے ہو جائیں گے۔ یعنی ان کی روشنی مدھم پڑ جائے گی۔ یا جب وہ بکھر جائینگے۔ اگر "نجوم" کے مجازی معنی لئے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوجائینگی۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی۔ کیونکہ اگر اَلْقَمَرُ سے مراد عربوں کی ریاست اور اَلشَّمْسُ سے ایران کی سلطنت لی جائے (دیکھئے عنوان ق۔م۔ر اور ش۔م۔س) تو اَلنُّجُوْمُ سے مراد چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوں گی۔ لیکن اگر اس سے مراد کائنات کا طبعی انقلاب ہے تو پھر ان الفاظ کے حقیقی معنی لئے جائیں گے۔

---

* تاج۔ ** راغب۔

# ک د ی

اَلْکُدْیَۃُ ۔ سخت زمین ۔ بڑی سخت چٹان ۔ اَکْدَی الرَّجُلُ ۔ اس نے بخل کیا۔ اَکْدَی الْحَافِرُ ۔ زمین کو کھودنے والا اس مقام پر جا پہنچا جہاں سخت زمین یا چٹان آگئی اور وہ مزید کھدائی سے رک گیا۔ اَکْدَی الْمَطَرُ ۔ بارش کم ہوگئی***۔ قرآن کریم میں ہے اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی ( ۵۳/۳۴ ) ۔ وہ تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے ۔ پھر ہاتھ روک لیتا ہے (ابن فارس)۔ مومن کی روش زندگی تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھتا ہے اور باقی سب کچھ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے دے دیتا ہے ۔ لیکن جو شخص اس نظام پر دل سے یقین نہیں رکھتا ، صرف مصلحتاً اس جماعت کے ساتھ رہتا ہے ، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ گریز کی راہیں نکالتا رہتا ہے ۔ (تَوَلّٰی ۔ ۵۳/۳۳ ) ۔ یعنی تھوڑا سا دیدیا اور اس کے بعد پھر ہاتھ روک لیا اور بہانہ سازیاں شروع کردیں ۔

# ک ذ ب

الکَذِبُ کے معنی ہیں جانتے بوجھتے کسی چیز کے متعلق خلاف حقیقت خبر دینا ۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ عمداً ہو یا سہواً ، دونوں صورتوں میں کَذِبٌ کا لفظ بولا جائیگا* ۔ اَکْذَبَ الرَّجُلُ اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کو پکارا جائے اور وہ سوتے ہوئے کی طرح چپ سادھ لے۔ کَذَّابَۃٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا یا چھاپا جائے** ۔ کَذَبَ فِیْ سَیْرِہٖ کے معنی ہیں اونٹ سست رفتار ہوگیا ۔ یعنی جس رفتار سے وہ چل سکتا تھا اس رفتار پر نہیں چلا یا وہ بری چال چلا*** ۔ بعض اوقات کَذَبَ کے معنی واجب ہونے کے بھی آتے ہیں*** ۔

قرآن کریم نے سورۃ منافقون میں کہا ہے کہ ( اے رسول ) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے ۔ اس کے بعد ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے کہ تو واقعی اس کا رسول ہے لیکن وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ( ۶۳/۱ )۔ یہ منافق یقیناً کاذب ہیں ۔ یہاں سے کِذْبٌ کے معنی واضح ہوگئے ۔ یعنی کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ کِذْبٌ

*محیط ۔ **اقرب الموارد ۔ ***تاج ۔

ہے - اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کِذْبٌ نہیں کہینگے- وہ بات اس کے عدمِ علم پر محمول کی جائیگی - یعنی یہ کہینگے کہ اسے صحیح واقعہ کا علم نہیں - یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے اس کی بڑی سخت تاکید کی ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (۱۷/۳۶) - اس لئے وہی بات زبان سے نکالنی چاہئے جس کے متعلق تحقیق کر لی جائے -

سورۃ یوسف میں ہے بِدَمٍ کَذِبٍ (۱۲/۱۸) - جھوٹ موٹ کا خون یعنی ایسا خون جو اس کا نہ تھا جس کا وہ بتایا گیا تھا - کَاذِبٌ - جھوٹا (۱۱/۹۳) - کَذَّابٌ - بہت بڑا جھوٹا (۴۰/۲۸) - مَکْذُوْبٌ - جھوٹ کہا ہوا (۱۱/۶۵) - کَذَّبَ - جھٹلایا (۲۳/۲۶) - تَکْذِیْبٌ - جھٹلانا (۸۵/۱۹) - مُکَذِّبٌ - وہ جو جھٹلائے جائے اور کبھی نہ مانے (۵۶/۵۱) -

وحی (قرآن کریم) اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا ہے اور دلیل و برہان سے اس کی تائید کرتا ہے - وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو - (۲/۱۱۱)- یہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا صحیح طریقہ - لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے یہ فیصلہ کرلے کہ مجھے فریقِ مقابل کے دعویٰ کو بہر حال جھٹلانا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا - یہ ہے وہ تَکْذِیْبٌ جسے قرآن کریم نے سخت جرم قرار دیا ہے - علم و بصیرت کی بارگاہ میں اس سے بڑا جرم اور کونسا ہوگا؟

نیز تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدعی ، اس کا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے - سورۃ الماعون میں دیکھئے ، کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱۰۷/۱) - کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کے بعد بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا - یہ وہ نمازی ہیں جو صلٰوۃ کی غرض و غایت کو فراموش کئے ہوئے ہیں- جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات ہی کو اصلِ صلٰوۃ سمجھے ہوئے ہیں ، اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہئے تھا ، بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۰۷/۲-۷) - اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے "تکذیب دین" کون کرتا ہے - اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہے؟

# ک ر ب

اَلْکَرْبُ ۔ شدید غم کو کہتے ھیں ۔ اس کی اصل کَرْبُ الْاَرْضِ سے ھے۔ جس کے معنی زمین میں ھل چلانے کے ھیں ۔ یا یہ کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ھے ۔ جس کے معنے ھیں سورج غروب ھونے کے قریب ھو گیا ۔ اَلْکَرْبُ ۔ رسی بٹنے کو بھی کہتے ھیں ، نیز بیڑی کو تنگ کرکے سختی سے باندھنے کے لئے بھی ۔ کَرَبٌ ۔ اُس رسی کو بھی کہتے ھیں جو ڈول کے ساتھ بندھی رھتی ھے اور ھر مرتبہ پانی میں ڈوبتی ، بھیگتی اور اس طرح جلد گل سڑجاتی ھے۔ کَرَبَ النَّاقَۃَ ۔ اس نے اونٹنی پر بوجھ لاد دیا ۔ اَلْکَرِیْبُ ۔ وہ زمین جس پر کبھی کاشت نہ کی گئی ھو* ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ھوتے ھیں ۔

ان معانی سے اَلْکَرْبُ کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے ۔ یعنی شدید غم ، جس سے انسان بری طرح جکڑا جائے ۔ گرانبار ھو جائے ، اس کے آسرے ٹوٹ جائیں ۔ اس کا قلب الٹ پلٹ ھوجائے۔ یہ ھے وہ کَرْبٌ جس کے متعلق کہا ھے کہ اس سے نجات کا ذریعہ صرف ایک ھے اور وہ ھے قانون خداوندی کی اطاعت ۔ قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیْکُمْ مِّنْھَا وَ مِنْ کُلِّ کَرْبٍ ( ٦/٦٤ ) ۔ اسی طریق سے خدا کے بندوں کو کرب سے نجات ملتی ھے ( ۲۱/٧٦ ) ۔

اَلْکَرُوْبِیُّوْنَ ۔ عبرانی زبان کا لفظ کَرُوْبِیْمُ ھے ۔ جس سے مراد مقرب فرشتے ھیں** ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) ۔

# ک ر ر

اَلْکَرُّ ۔ کسی چیز کو پلٹانا، موڑدینا، لوٹادینا، پھیردینا۔ موٹی رسی یا رسی کو کَرٌّ کہتے ھیں**۔ اَلتَّکْرِیْرُ ۔ وَالتَّکْرَارُ ۔ کسی چیز کو بار بار دھرانا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے اکٹھا کرنا اور پلٹانا بتائے ھیں ۔ تکرار اور تاکید میں فرق یہ ھے کہ تاکید اسے کہتے ھیں کہ ایک بات کہی جائے اور اس کے ساتھ ھی اس پر زور دیا جائے نیز تاکید تین بار سے زیادہ نہیں کی جاتی ۔ لیکن تکرار میں یہ دونوں باتیں ضروری نہیں*** ۔

قرآن کریم میں کفار کی اس حسرت کو متعدد مقامات پر دھرایا گیا ھے کہ لَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً ( ۲/١٦٧ ) ۔ اگر ایک مرتبہ زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹا کر پھر وھی حالات پیدا کر دئیے جائیں تو ھم یہ کریں اور وہ کریں ۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

لیکن اسکی نفی کی گئی ہے (۳۹/۵۸-۵۹) ۔ اسلئے کہ زندگی جوئے رواں ہے ۔ اسکا جو پانی ایک مرتبہ آگے نکل گیا وہ پھر واپس نہیں آ سکتا ۔ اسی طرح دنیا کی اس اسٹیج پر کوئی فرد دوبارہ نہیں آسکے گا ۔ اس لئے تناسخ (آواگون ۔ دنیا میں بار بار آنے) کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ قانونِ ارتقاء میں اعادہ اور تکرار نہیں ۔ یا آگے بڑھنا ہے (جسے جنت کہتے ہیں) یا ایک مقام پر رک جانا (جسے جہنم کہتے ہیں) ۔

سورۂ النّٰزعٰت میں ہے ۔ تِلْکَ اِذاً کَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹/۱۲) ۔ یہ مر کر پھر زندہ ہونا تو بہت نقصان دہ ہوگا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ۔ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْھِمْ (۱۷/۶) ۔ پھر ہم نے حالات کو ایسا پلٹا دیا کہ وہ تمہارے حق میں ہو گئے اور تمہارے دشمنوں کے خلاف ۔

## ک ر س

اَلْکِرْسُ ۔ اصل و بنیاد* ۔ اَلْکُرْسِیُّ ۔ کرسی جس پر بیٹھتے ہیں ۔ اَلْکُرْسِیُّ وَالْکِرْسِیُّ ۔ حکومت و اقتدار ۔ یا علم ۔ چنانچہ اس صحیفہ کو جس میں علم ہوتا ہے کُرَّاسَةٌ کہتے ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کُرَّاسَةٌ ان اوراق کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے ملا دئے گئے ہوں ۔ کیونکہ اَلتَّکْرِیْسُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملا دینا* ۔ آج کل کاپی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے اوپر تلے جم جانا یا اکٹھا ہو جانا بتائے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲/۲۵۵) ۔ خدا کی ''کرسی'' تمام کائنات کو محیط ہے ۔ اس میں کُرْسِیُّهٗ کے معنی باعتبار لغت بھی اور صاحب المنار کے نزدیک بھی ، علمِ خداوندی ہیں ۔ اگرچہ اسی کے معنے حکومت و اقتدار بھی ہوسکتے ہیں ۔ ''علم'' کا مفہوم اس لئے قابلِ ترجیح ہے کہ اس سے پہلے یہ آیا ہے وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔ '' وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کرسکتے مگر اس کے قانونِ مشیت کے مطابق'' ۔

سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے تختِ حکومت کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۳۸/۳۴) ۔ اس میں بھی کُرْسِیِّهٖ کے معنے تخت یا ''بیٹھنے کی جگہ'' کے نہیں ، بلکہ اقتدارِ حکومت ہے ۔ ''تخت'' ۔ ''کرسی'' وغیرہ الفاظ ، اقتدار اور منصب کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔

# ک ر م

اَلْکَرَمُ اس صفت کو کہتے ہیں جو کمینگی کے خلاف ہو۔ عربوں میں کمینگی بد ترین خصلت تھی ، اس لئے کَرَمٌ بہترین صفت تھی۔ دراصل اس کے معنی تھے کسی ایسے بوجھ کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور اس کی جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ یعنی بڑے گرانقدر اجتماعی امور اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ کرنا یا سعی و کوشش کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَرَمٌ کسی کو بغیر ذاتی غرض و منفعت کے بقدر ضرورت فائدہ پہنچانا ہے۔ اس کے معنی خلوص کے بھی ہیں۔ اَلْاِکْرَامُ وَ اَلتَّکْرِیْمُ۔ کسی کو اسطرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی یا ذلت نہ ہو، ساتھ ہی یہ کہ جو نفع پہنچایا جائے وہ بلند اور با شرف ہو*۔ اس اعتبار سے عربوں کے ہاں اَلْکَرِیْمُ ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں ، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جاتی ہو۔ نیز الکَرِیْمُ کے معنے ہیں آزاد اور شریف۔ نجیب۔ سخی۔ خوش نہاد۔ جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے ، نرم خو ، خلیق ، وسیع الظرف ، عمدہ حسب و نسب والا ، پسندیدہ صفات کا مالک ، با عزت۔ وہ گھوڑا جس پر جہاد کیا جائے۔ وہ اونٹ جس پر پانی لاد کرلایا جائے۔ نیز ہر پسندیدہ اور منتخب چیز*۔ کثیر بارش کو بھی کَرِیْمٌ کہتے ہیں۔ اَرْضٌ مَکْرَمَۃٌ۔ ایسی زمین جسے جوت کر، کھاد وغیرہ ڈال کر اچھی طرح تیار کر لیا جائے۔ نیز وہ عمدہ زمین جس میں بہت اچھی پیداوار ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ کَرُمَتْ اَرْضُہٗ الْعَامَ۔ کھاد ڈالنے کی وجہ سے اس سال اس کی زمین بڑی زرخیز ہوئی اور اس میں بہت فصل ہوئی۔ کَرَّمَ السَّحَابُ تَکْرِیْمًا۔ بادل خوب اچھی طرح برسا*۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک کَرِیْمٌ نہیں کہا جاسکتا جب تک اس سے کَرَمٌ کا ظہور نہ ہو چکا ہو**۔

قرآن کریم نے جہنم کے دخانی سایہ کے متعلق کہا ہے۔ لَابَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ (۵۶/۴۴)۔ جس میں نہ ٹھنڈک ہےنہ خوشگواری یانفع بخشی۔ مومنین کی صفات میں ہے۔ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ جب کسی لا یعنی اور لغو بات سے ان کا گذر ہو جائے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گذر جاتے ہیں۔

*تاج۔ **راغب۔

سورۃ علق میں خدا کو اَلْاَکْرَمُ (۹۶/۳) کہا گیا ہے ۔ اسی کو ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵/۲۷) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ کَرَّمْتَ (۱۷/۶۲) اور اَکْرَمَ (۸۹/۱۵) کے معنی عزت و تکریم عطا کرنا ۔ بمقابلہ اَھَانَ (۸۹/۱۶) ۔ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (۲۱/۲۶) ۔ معزز بندے ۔

مُکْرِمٌ (۲۲/۱۸) عزت دینے والا ۔ رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۸/۴) ۔ رزقِ باشرف ۔ عزت کی روزی ۔ جنتی معاشرہ کے خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں رزق کریم ملے گا ۔ یعنی سامانِ زیست بکثرت اور فراواں بھی اور عزت و توقیر کے ساتھ بھی ۔ کیسی خوش بخت ہے وہ قوم جسے رزق کریم میسر ہو ۔ لیکن یہ نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے ہی سے مل سکتا ہے ۔ (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی) ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ۔ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو صاحب کرم بنایا ہے ۔ یعنی خدا نے ہر فرزندِ آدم کو محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے ۔ تکریم آدمیت کا یہ اعلان عظیم سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف سے ہوا ۔ یعنی ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے قابل احترام ہے ۔ ہر فرد کو عزت و شرف کا یہ بنیادی حق (Fundamental Right) قرآن کریم کی بارگاہ سے عطا ہوا ۔ یہ انسان کا پیدائشی حق ہے ۔ اس کے بعد اس عزت و تکریم کے مدارج ، جو ہر ذاتی اور اعمال کریمانہ کے اعتبار سے قائم ہوتے ہیں ۔ جو جتنا زیادہ قوانین الٰہیہ کی نگہداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ واجب التکریم ہو جاتا ہے ۔ حتّٰی کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ غور کیجئے ۔ قرآن کریم نے کس طرح عزت و شرف کے پرانے معیاروں (حسب و نسب ۔ مال و دولت وغیرہ) کو بدل کر ان کی جگہ احترام و تکریم کے نئے پیمانے دے دئے ، جن کی رو سے ہر انسان ، بحیثیت انسان ہونے کے ، واجب الاحترام ہے اور جو جس قدر زیادہ قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوتا جاتا ہے ، یعنی عزت کا معیار جوہرِ ذاتی قرار پا گیا ، نہ کہ اضافی نسبتیں ۔ اسی ایک معیار سے بادشاہت ، برھمنیت ، پیشوائیت ، سرمایہ داری کے تمام نظام کہن حرف غلط کیطرح مٹ جاتے ہیں ۔ یعنی ہر انسانی بچہ ، خواہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو یا فقیر کے ۔ برھمن کا بیٹا ہو یا چمار کا ۔ انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے ۔ اور باپ کی وجاہت یا عزت اسے دوسرے بچوں سے ممتاز نہیں کر سکتی ۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ باعزت ہونا اس کے ذاتی جوہر اور عمل کی بنا پر ہوگا ۔

# ک ر ہ

اَلْکَرْهُ - اَلْکُرْهُ - سخت نا پسندیدگی - مشقت - بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ جس کام پر خود تمہارا نفس ناخواستہ طور پر تمہیں مجبور کرے ، وہ کُرْهٌ ہے اور جس پر کوئی دوسرا مجبور کرے وہ کَرْهٌ ہے - راغب نے کہا ہے کہ جو تکلیف کسی انسان پر خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی لاد دی جائے تو وہ کَرْهٌ ہے اور جو اسے خود اپنے آپ سے پہنچے وہ کُرْهٌ ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ کُرْهٌ تو مشقت کو کہتے ہیں اور کَرْهٌ یہ ہے کہ تم کو کسی بات کے کرنے کے لئے کہا جائے اور تم اسے بادل ناخواستہ کرو - قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْهًا آیا ہے- (۳/۸۲) - طَوْعًا کے معنی ہیں بہ طیب خاطر اور کَرْهًا کے معنی زبردستی- سورۃ بقرہ میں ہے - كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (۲/۲۱۶) تم پر جنگ کو قانوناً ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ تمہاری طبیعتیں اسے بادل ناخواستہ قبول کرتی ہیں ، یا حالانکہ وہ تمہاری طبیعتوں پر ناگوار گذرتی ہے - سورۃ احقاف میں جنین کے متعلق ہے حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا (۴۶/۱۵) - اس کی ماں بڑی مشقت سے حمل کے دن گزارتی ہے اور وضع حمل میں بھی تکلیف اٹھاتی ہے - سورۃ نحل میں اِکْرَاہٌ زبردستی کے معنوں میں آیا ہے - یعنی جو کام دل کی مرضی سے نہ کیا جائے (۱۶/۱۰۶) - سورۃ بقرۃ میں کَرِهَ کا لفظ اَحَبَّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۱۶) - اسی طرح (۴۹/۷) میں کَرَّهَ حَبَّبَ کے مقابلہ میں - کَارِهُوْنَ (۹/۴۸) نا پسند کرنے والے - مَکْرُوْهٌ (۱۷/۳۸) نا پسندیدہ -

قرآن کریم جس جماعت کے ہاتھوں آسمانی انقلاب کو لاتا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور نظام کو اپنے دل کی مرضی سے (بلا جبر و اکراہ) اپنی زندگی کا نصب العین بناتی ہے - لہذا اس کا اعلان یہ ہے کہ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) - اس سوسائیٹی کا ممبر بطیب خاطر بنا جاسکتا ہے ، کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں - رسول اکرمؐ سے کہا گیا کہ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) - کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ اکراہ ، طبعی (Physical) بھی ہوتا ہے - جیسے کسی کے گلے پر تلوار رکھکر اس سے بات منوا لی جائے- اور ذہنی بھی - جیسے کسی کو شعبدہ دکھا کر اس سے اپنی بات منوا لی جائے -

*تاج -

تیسری قسم کا اکراہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو روایات چلی آتی ہیں اور جو تصورات اور نظریات، معتقدات و خیالات، ہمیں اسلاف سے وراثتاً ملتے ہیں، انہیں ہماری تعلیم و تربیت کا جزو بنا کر دلوں میں راسخ کر دیا جائے، عام اس کے کہ انہیں خدا کی کتاب کی سند حاصل ہے یا نہیں۔ یا وہ علم و بصیرت اور عقل و فکر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ یہ اکراہ کی سنگین ترین شکل ہے۔ غلط تعلیم و تربیت سے بڑھ کر شدید اکراہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ قرآنی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی قسم کے اکراہ کی بھی اجازت نہیں۔ وہ ہر بات کو دلائل و براہین سے پیش کرتا اور دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس جماعت میں داخل ہونے پر کسی قسم کا جور و اکراہ روا نہیں رکھا جا سکتا، اس میں سے نکلنے کے لئے بھی پوری آزادی ہونی چاہئیے۔ اگر آپ اس سے نکلنے کی راہیں بند کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو جور و اکراہ سے اس کے اندر رکھتے ہیں۔ لہذا ہمارے ہاں جو سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے تو یہ چیز قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی اس شخص کو مسلمان رہنے پر مجبور کرتا ہے جس کا دل اسلام پر مطمئن نہ ہو۔ ایمان نام ہی دل و دماغ کے کامل اطمینان اور رضامندی کا ہے۔

سورۃ نحل میں ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ۔ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (16/106) ۔ جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرتا ہے۔ تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ لیکن ان میں وہ شخص شامل نہیں جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن اسے کفر (انکار) پر مجبور کر دیا جائے۔ کفر اُس کا کفر ہے جو اپنے سینے کی کشاد (دل کی پوری رضامندی) سے کفر اختیار کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر جور و اکراہ سے کسی سے کفر کا اقرار کرا لینا اُسے کافر نہیں بنا دیتا، تو جور و اکراہ سے کسی سے ایمان کا اقرار لے لینا، یا اسے اس مسلک پر رہنے پر مجبور کر دینا، اُسے کس طرح مومن بنا سکتا ہے۔ مومن وہی ہے جو بطیب خاطر قرآن کریم کی صداقتوں کا اقرار کرے اور پھر دل کی پوری رضامندی سے اس مسلک پر قائم رہے۔ جہاں ذرا سا بھی جور و اکراہ آیا، وہاں ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم تو ان لوگوں کو بھی مومن قرار

نہیں دیتا جو اسلامی مملکت کی شان و شوکت کو دیکھکر (خود عہد نبوی میں) اسلام لے آئے تھے ۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ تم یوں کہو کہ ہم اس جدید نظام کے تابع فرمان ہو گئے ہیں (اَسْلَمْنَا) ۔ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوا ۔ (۴۹/۱۴) ۔ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) خود آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں ، لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳) ۔ تو ان پر بہرے اور اندھے بنکر نہیں گر پڑتے ۔ یعنی انہیں بھی آنکھیں کھول کر قبول کرتے ہیں ۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی شخص کو اسلامی نظام میں مجبوراً داخل نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نظام میں بطیب خاطر داخل ہو گیا ہے ، تو اس کے بعد اسے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ جب تک اس نظام کا ممبر رہیگا ، اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی ۔ اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائے ۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی نظام یا سوسائٹی کا ممبر بھی رہے اور اس کے قواعد و ضوابط میں سے جسے چاہے تسلیم کرے اور جسے چاہے مسترد کر دے ۔

## ک س ب

کَسْبٌ کے اصلی معنی جمع کرنا ہیں ۔ اس کے بعد اس کے معنی تلاش معاش کے بھی آتے ہیں ۔ اور کسی چیز کو حاصل کر لینے اور اسے پا لینے کے بھی * ۔

وَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ (۲/۷۹) انہوں نے جس چیز کو (یعنی دین میں تحریف کو) اپنے لئے وجہ معاش بنا رکھا ہے وہ ان کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہے ۔ اس سے ذرا آگے ہے ۔ مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً (۲/۸۱) ۔ جس نے ناہمواریاں پیدا کیں ۔ یہاں کَسَبَ کے معنی "کرنے" کے ہیں ۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے لئے ناہمواریوں کو اکٹھا کر لیا ۔

قرآن کریم میں آتا ہے ۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) ۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جس نے اچھے کام کئے ان کا فائدہ

*تاج ۔ نیز ابن فارس ۔

اس کے لئے ہے (لَہَا) اور جس نے برے کام کئے اس کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے (عَلَیْہَا) ۔ لیکن یہاں '' نیک اعمال ،، اور ان کے فائدوں کے لئے کَسَبَ آیا ہے اور '' برے کام ،، اور ان کے نقصانات کے لئے اِکْتَسَبَ ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَسْبٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات کے فائدے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کے فائدے کے لئے کرے۔ اور اِکْتِسَابٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے ۔ راغب کے اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نفع مند صرف وہی کام ہو سکتے ہیں جن میں اپنا اور دوسروں کا (سب کا) فائدہ مد نظر ہو ۔ لیکن جن کاموں میں صرف اپنا ذاتی مفاد ہی پیش نظر ہو ان سے انسان کی ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی ۔ وہ اس کے لئے موجب نقصان ہوتے ہیں (عَلَیْہَا کے یہی معنی ہیں) ۔ یہ چیز قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اس نے کہا ہے کہ وَ اَمَّامَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ($\frac{۱۳}{۱۷}$) ۔ بقاء صرف ان کاموں کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوں ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ کَسَبَ ، خیر کے لئے آتا ہے اور اِکْتَسَبَ ، شر کے لئے ۔

لیکن راغب یا صاحب لطائف اللغۃ نے کسب اور اکتساب کے معنوں میں جو فرق بتایا ہے وہ کلیہ نہیں ۔ قرآن کریم میں ان شکلوں کا استعمال اس کے خلاف بھی ہوا ہے ۔

## ک س د

کَسَدَ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اسقدر معمولی ، گھٹیا ، اور بے قدر ہونے کے ہیں کہ کوئی اسکی طرف رغبت نہ کرے۔ تہذیب میں ہے کہ کَسَادٌ کے اصلی معنی خراب ہو جانے اور بگڑ جانے کے ہیں ۔ پھر اس کا استعمال ، سامان اور بازار کے چالو نہ رہنے کے معنوں میں ہونے لگ گیا ۔ کَسَدَ الْمَتَاعُ ۔ بازار میں اس سامان کا چلن نہیں رہا ۔ کَسَدَتِ السُّوْقُ ۔ بازار سرد پڑ گیا ۔ اَلْکَسِیْدُ ۔ گھٹیا ۔ کم درجہ ۔ کمینہ * ۔ قرآن کریم میں (سورۂ توبہ) میں ہے وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا ($\frac{۹}{۲۴}$) ۔ وہ تجارت جس کی کساد بازاری (مندا پڑ جانے) سے تم ڈرتے ہو۔

---

*تاج و محیط ۔

# ک س ف

اَلْكِسْفَةُ - چیز کا ٹکڑا۔ جمع كِسَفٌ و كِسْفٌ (۴۴/۹۲ ; ۳۰/۴۸)*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں ایسی خرابی آجانے کے ہوتے ہیں جو پسندیدہ نہ ہو۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے کاٹ دینا اور الگ کر دینا - سورۂ الطور میں ہے - اِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِنَ السَّمَآءِ (۵۲/۴۴) - اور سورۃ شعراء میں ہے فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَآءِ (۲۶/۱۸۷) - اس کے معنی عذاب ناگہانی یا تباہی و بربادی کے ہیں - كَسَفَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں اس نے کپڑے کو کاٹا - كَسَفَتِ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ - سورج اور چاند گہن میں آگئے - كَسَفَتْ حَالُهٗ - اس کا حال خراب ہو گیا - رَجُلٌ كَاسِفُ الْبَالِ - بد حال آدمی - يَوْمٌ كَاسِفٌ - نہایت ہولناک اور شدت کی تکلیف کا دن * - جس دن آسمان پھٹ پڑے -

# ک س ل

اَلْكَسَلُ - کسی ایسے کام میں واماندگی اور گرانباری کا اظہار کرنا جس میں گرانباری اور تکان کا اظہار کرنا نہیں چاہئیے - اَلْكِسْلُ - روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو**۔ ظاہر ہے کہ اُس وقت کمان اور تانت دونوں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں باھمی رابطہ نہ رہنے سے روئی نہیں دھنی جا سکتی - دونوں بیکار ہوتی ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی کام کے کرنے سے گرانباری محسوس کرنا اور اس کی تکمیل سے، یا اسے کرنے سے جی چرانا -

اس مفہوم کو سامنے رکھئیے اور پھر اس آیت پر غور کیجئیے جس میں منافقت برتنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ - اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى (۴/۱۴۲) - نیز (۹/۵۴) - یہ نظامِ صلٰوۃ میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس اندازسے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ - یعنی ظاہری طور پر سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا -

یہ نقشہ، جسے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ یہ "رسول اللہؐ کے زمانے کے منافقین" کی حالت کا بیان ہے، درحقیقت ہماری

* تاج و راغب - ** تاج و محیط -

ھی حالت کا نقشه ھے ۔ غور کیجئے که کیا ھماری نمازیں بے تانت کی کمان نہیں ۔ [نیز دیکھئے سَاھُوْنَ (۱۰۷/۵) عنوان س ۔ ھ ۔ و]

## ک س و

اَلْکَسْوَۃُ ۔ اَلْکِسْوَۃُ ۔ لباس ، کپڑا جو پہنایا جائے*۔ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ (۲/۲۳۳) ۔ ان کا کھانا اور کپڑا ۔ کَسَاہُ کَسْوًا ۔ اسے کپڑا پہنا دیا * ۔ فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ۔ (۲۳/۱۴) ھم (جنین کی) ھڈیوں کو گوشت کا پہناوا پہناتے ھیں ۔

## ک ش ط

اَلْکَشْطُ ۔ کسی چیز پر سے اس پر چھائی ھوئی چیز اٹھا دینا ۔ کَشَطَ الْغِطَاءَ عَنِ الشَّیْءِ ۔ اس نے اس چیز سے ڈھکنا ھٹا دیا ۔ کَشَطَ الْجِلْدَ عَنِ الْجَزُوْرِ ۔ اس نے ذبح کردہ اونٹ سے کھال اتار دی ۔ اَلْکِشَاطُ ۔ اتاری ھوئی کھال ۔ کَشَطَه ۔ اس نے اسکو کھول دیا **۔ اِنْکَشَطَ رَوْعُه ۔ اس کا خوف جاتا رھا *** ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ وَاِذَا السَّمَاءُ کُشِطَتْ ۔ (۸۱/۱۱) اس کے معنی ھیں جب " آسمان " سے پردہ اٹھا دیا جائیگا ۔ جب اس کا پوست اتار دیا جائیگا (اور اسطرح فضائے کائنات کے اندر کی چھپی ھوئی قوتیں بے نقاب ھوجائینگی) ۔

## ک ش ف

اَلْکَشْفُ ۔ پردہ اٹھا دینا ۔ کسی بات کو ظاھر کر دینا ** ۔ قرآن کریم میں ھے فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَاءَکَ (۵۰/۲۲) ۔ ھم نے (تیری آنکھوں سے) پردہ اٹھا دیا اور اسطرح حقائق تجھ پر منکشف ھو گئے ۔ نیز اسکے معنی ھٹا دینے ، دور کر دینے کے بھی ھیں ۔ سورہ اعراف میں ھے لَئِنْ کَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ (۷/۱۳۴) ۔ اگر تو ھم سے یه عذاب دور کر دے ۔ کَشْفُ الضُّرِّ (۱۰/۵۶) تکلیف کا دور کر دینا ۔ کَاشِفٌ ۔ دور کر دینے والا (۶/۱۷) ۔

قرآن کریم میں ایک جگه ملکهٔ سبا کے متعلق ھے وَکَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْھَا (۲۷/۴۴) ۔ اور دوسری جگه سورہ قلم میں ھے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۴۲) ۔ یه عربوں کا محاورہ تھا جسے وہ اسوقت بولتے تھے جب کوئی سخت مرحله سامنے آجائے * ۔ چنانچه راغب نے لکھا ھے که اسکی اصل

---

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰی سَاقٍ ہے ۔ جسکے لفظی معنے ہیں جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی مطلب یہ ہے کہ پورے زور و شور سے شروع ہو گئی ۔ گھمسان کا رن پڑا ۔ اسی سے سَاق* امر شدید کے لئے آتا ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسکی اصل تَذْمِیْرُ النَّاقَۃِ سے ہے جس سے مراد ہے آدمی کا اونٹنی کے رحم میں ہاتھ ڈال کر بچہ نکالنا ۔ ایسے موقع پر کَشْفُ عَنِ السَّاقِ کہا جاتا ہے** ۔ بہرحال ، اس کے معنی شدت کی سختی اور گھبراہٹ کے ہیں ۔

یہ جو ہمارے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ ہے اسکی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ہمکلام ہو سکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے ، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے ۔ اب انسانوں کے لئے علم کے سر چشمے صرف دو ہیں ۔ قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور عقل انسانی (مزید تفصیل عنوان ل ۔ ہ ۔ م ۔ میں دیکھئے)

# ک ظ م

اَلْکَظْمُ ۔ اَلْکَظَمُ ۔ حلق ۔ منہ ۔ سانس کے باہر نکلنے کا راستہ ۔ مخرج *** ۔ اس اعتبار سے اسکے معنے کسی چیز کے باہر نکلنے کے ہیں ۔ لیکن دوسری طرف اَلْکُظُوْمُ سانس کے رک جانے کو بھی کہتے ہیں ** ۔ کَظَمَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ کا جگالی نہ کرنا ، اور جو کھایا ہو اسے اندر روک لینا ** ۔ اس سے کَظَمَ الْبَابَ کے معنی ہیں دروازہ بند کر دینا**** ۔ اسی سے اَلْکُظُوْمُ کے معنی خاموش ہو جانے کے آتے ہیں **** ۔ اَلْکَاظِمُ اس اونٹ کو بھی کہتے ہیں جس کے پیٹ کا پانی خشک ہو گیا ہو اور وہ سخت پیاسا ہو* ۔ لیکن کَظِیْمٌ اور مَکْظُوْمٌ کے معنی سخت غمگین و فکر مند اور مضطرب و بیقرار انسان کے ہیں۔**** بے چینی اور بیقراری کے معنوں میں سورہ المومن میں ہے ۔ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ ($\frac{۱۸}{۴۰}$) ۔ جب قلوب اچھل کر گلے تک آجائیں گے اور وہ لوگ سخت مضطرب و بیقرار ہونگے ۔ یا وہ اپنے قلوب کو دبا رہے ہونگے کہ کہیں وہ باہر ہی نہ نکل پڑیں ۔ سورہ القلم میں ہے ۔ وَھُوَ مَکْظُوْمٌ ($\frac{۴۸}{۶۸}$) ۔ وہ بے چین اور بیقرار تھا ۔ سورہ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ہے فَھُوَ کَظِیْمٌ ($\frac{۸۴}{۱۲}$) ۔ وہ یوسف کی جدائی میں بیقرار تھا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و لطائف اللغۃ و راغب ۔ ****محیط ۔

سورہ آل عمران میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے ۔ كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (۳/۱۳۴) ۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں غصہ کو دبانے والے ۔ یہ مفہوم صحیح نہیں ۔ قرآن کریم غصے کو دبانے (Suppression) کی تلقین نہیں کرتا ۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے كِظَامَةٌ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں ۔ جن زمینوں میں پانی کم ہو (جیسا کہ عرب کی سرزمین) وہاں ایک کنویں کے قریب ہی دوسرا کنواں کھود دیتے ہیں اور ان کنوؤں کے نیچے زمین دوز راستہ (Subterranean Channel) بنا دیتے ہیں جس سے ایک کنواں دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے ۔ اگر ایک کنویں میں پانی کم رہ جاتا ہے اور دوسرے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس کا زائد پانی اس دوسرے کنویں کی طرف آجاتا ہے ۔ اس زمین دوز نالی کو كِظَامَةٌ کہتے ہیں * ۔ لہذا اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی وجہ سے ان (مومنین) کی مشتعل ہونے والی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان قوتوں کو وحشیوں کی طرح یونہی تخریب میں صرف کردیں وہ انہیں دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اس طرح ان سے تعمیری کام لیتے ہیں ۔ اسے كِظَامَةٌ کہا جائیگا ۔ اسی کو دور حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں (Sublimation) کہتے ہیں ۔ یعنی زائد قوتوں کا دوسری طرف منتقل کرکے توازن قائم رکھنا ۔ توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس حلقے کو بھی اَلْكِظَامَةُ کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کرکے باندھی جاتی ہیں ۔ نیز اس میخ کو بھی جس کے ساتھ ترازو کی زبان گھومتی ہے اور بتاتی ہے کہ دونوں پلڑوں میں سے کونسا بھاری اور کونسا ہلکا ہے ۔ جب ان کا وزن برابر ہو جاتا ہے تو یہ زبان درمیان میں ٹھہر جاتی ہے * ۔ نیز اَلْكَظِيْمَةُ ۔ توشہ دان کو کہتے ہیں جسمیں زائد کھانا رکھ لیا جاتا ہے ۔ لہذا كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کے معنی ہیں زائد توانائیوں کو اس طرف منتقل کرکے جہاں ان کی ضرورت ہو ، اپنی ذات اور معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے ۔ قرآنی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف افراد کی توانائیوں کا جائزہ لیتا رہے ۔ جہاں جہاں ان کی ضرورت ہے انہیں اسطرف منتقل کرکے ، کظامت کے ذریعے ، معاشرہ کا توازن قائم رکھے اور معاملات میں درستگی پیدا کرتا رہے ۔ اس طرح ایک فرد کی ذات میں بھی توازن قائم رہے گا اور سارے معاشرہ میں بھی ۔ یوں جماعتِ مومنین اَلْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ہو جائیگی ۔ واضح رہے کہ جس چیز کو (Rational) کہا جاتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ اسمیں صحیح (Ratio) ہوتی ہے ۔ جماعت

---

*تاج ۔ نیز ابن فارس ۔

مومنین چونکہ اپنی ذات اور معاشرہ میں صحیح صحیح توازن رکھتی ہے اسلئے اسکی ہر بات (Rational) ہوتی ہے اور یہ (Ratio) کظامت کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے - توازن یا تناسب (Ratio) کے صحیح ہونے کا نام حسن ہے - اسی سے قرآن کریم نے "نیکیوں اور بھلائیوں" کے لئے حسنات کا لفظ استعمال کیا ہے - اور صفات خداوندی کو الاسماء الحسنیٰ سے تعبیر کیا ہے - (تفصیل ان نکات کی ح - س - ن کے عنوان میں ملیگی) -

## ک ع ب

اَلْکَعْبُ - ہڈیوں کا ہر جوڑ - ابھری ہوئی ہڈی جو پاؤں کے اوپر یا پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہوتی ہے - یا بالخصوص پاؤں کا ٹخنہ - سورۃ مائدہ میں کَعْبَیْنِ - دونوں ٹخنوں کے لئے آیا ہے (۵/۶) - اَلْکَعْبُ - اَلْکَعْبَۃُ - مربع ہڈی (جس پر نشانات لگے ہوتے ہیں اور) جسے کھیلنے میں پھینکا جاتا ہے* - (عام طور پر ان سے جؤا کھیلا جاتا ہے - انہیں پانسہ کہتے ہیں) کَعْبَۃٌ - اونچی اور مربع جگہ کو کہتے ہیں - ہر چوکور مکان کو** - لیکن اَلْکَعْبَۃُ خانہ کعبہ کےلئے مخصوص ہوگیا- اَلْکَعْبُ - شرف اور بزرگی کو بھی کہتے ہیں* - اَلْکَعْبُ - ابھرا ہوا پستان - اسی جہت سے اَلْکَاعِبُ - نوجوان لڑکی کو کہتے ہیں - جمع کَوَاعِبُ - سورۃ النبأ میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے لئے کَوَاعِبَ اَتْرَابًا آیا ہے (۷۸/۳۳) - انہی کو دوسری جگہ عُرُبًا اَتْرَابًا کہا گیا ہے (۵۶/۳۷) - اور اس کی تفسیر ذرا پہلے فُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ کہکر کر دی گئی ہے (۵۶/۳۴) - یعنی عالی مرتبت ، بلند پایہ خواتین - اس لئے کَوَاعِبُ میں جوانی کی تندرستی کے ساتھ ساتھ شرف و مجد (اَلْکَعْبُ) کی طرف بھی اشارہ ہے- (نیز دیکھئے ع - ر - ب اور ت - ر - ب) قرآن کریم کی رو سے کعبہ کا صحیح مقام کیا ہے ، اس کے لئے عنوان ، (ق - ب - ل) ، میں لفظ قِبْلَۃٌ دیکھئے -

## ک ف أ

کَافَاَہٗ عَلَی الشَّیْءِ - مُکَافَاَۃً - کِفَاءً - اس نے اس چیز پر اسے بدلہ دیا - کَافَاَہٗ - اس نے اس کی برابری کی - اس کا ہم پلہ ہوا - تَکَافَاَ الشَّیْئَانِ - دونوں چیزیں برابر سرابر ہوگئیں - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس) -

---

*تاج - **لطائف اللغۃ -

اسی لئے كُفُوٌ و كَفْؤٌ و كِفْؤٌ کے معنی اس کی مثل و نظیر اور اس کے هم پله کے هیں - اَلْكَفَاءَةُ فِي النِّكَاحِ اسی سے ماخوذ ہے - یعنی شوهر کا اپنی بیوی سے حسب ، نسب ، گھرانے وغیرہ میں برابر ہونا* -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے - وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (۱۱۲/۴)۔ اس کے برابر، همسر ، هم پله کوئی نہیں۔ یه چیز ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ هر (Personality) منفرد (Individual) اور یگانه (Unique) هوتی ہے - اور خدا کی ذات چونکہ مطلق اور مکمل ہے اس لئے اس کی انفرادیت بھی یکسر مکمل اور بے نظیر ہے - سورۃ اخلاص بالخصوص ، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Characteristics) کی شارح ہے - اس میں احدیت ، ذات کی یگانگت (Uniqueness) پر دلالت کرتی ہے - صمدیت ، اس کی آزادی (Freedom) کی شہادت دیتی ہے - عدم تولد ، یه بتاتا ہے که ذات ، انسانی جسم کی طرح سلسلهٔ توالد و تناسل کی رو سے وجود میں نہیں آتی - اور کفواً اس کی انفرادیت (Individuality) کی طرف اشارہ کرتا ہے - (مزید تشریح متعلقه عنوانات میں دیکھئے) -

# ک ف ت

كَفَتَ الشَّيْءَ إِلَيْهِ - اس نے چیز کو اپنے اندر لے لیا - كَفَتَ الشَّيْءَ - اس چیز پر قبضه کر لیا** - جمع کر لیا **- راغب نے لکھا ہے که كَفْتٌ تیز هانکنے کو بھی کہتے هیں - كَفَتَ الطَّائِرُ - پرندے نے اڑنے میں پر سمیٹے اور تیز اڑا - اَلْكِفَاتُ - وہ جگه جہاں کسی چیز کو جمع کیا جائے - چنانچه عرب كِفَاتُ الْأَحْيَاءِ مکانوں کو اور كِفَاتُ الْأَمْوَاتِ قبروں کو کہتے تھے** -

قرآن کریم میں ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا (۷۷/۲۵) - کیا هم نے زمین کو كِفَاتٌ نہیں بنایا - یعنی اس میں هر قسم کی چیزیں جمع کر دیں - جمادات - نباتات - حیوانات - پانی - هوا وغیرہ - نیز جیسا که اوپر کہا جا چکا ہے ، كَفَتَ الطَّائِرُ کے معنی هیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی (اڑنے میں پروں کو سمیٹا) - فَرَسٌ كَفْتٌ - اس گھوڑے کو کہتے هیں جو یک بارگی اچھل پڑے اور سوار کا اس پر قابو پانا مشکل هو جائے*** - اس اعتبار سے زمین کے كِفَاتٌ سے مراد یه هوگی که یه تیزی سے چل رهی ہے - یا دونوں معانی کو یک جا کرنے سے مطلب یه هوگا که یه تمام چیزوں کو اپنے اندر لئے هوئے نہایت تیزی سے چل رهی ہے -

---

*تاج و محیط و راغب - **تاج - ***راغب و ابن فارس

# ک ف ر

کُفْرٌ کے معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے آتے ھیں ۔ الرمانی نے اَخْفٰی ۔ سَتَرَ اور اَجَنَّ کو کَفَرَ کا مرادف لکھا ھے** ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے کئے ھیں ۔ چنانچہ اس شخص کو جو اس طرح ھتھیاروں میں ڈوب جائے کہ اس کا بدن نظر نہ آئے کَافِرٌ کہا جاتا ھے۔ رات کو بھی کَافِرٌ کہتے ھیں کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ھے ۔ سیاہ بادل کو بھی کَافِرٌ کہتے ھیں ۔ نیز دریا اور سمندر کو بھی کیونکہ یہ اپنی اندرونی چیزوں کو چھپائے ھوئے ھیں ۔ کسان کو بھی کَافِرٌ کہتے ھیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ھے* ۔ تاج، نیز صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ھے کہ قبر کو بھی اَلْکَفْرُ کہتے ھیں ۔ ان معانی کے اعتبار سے مومن کے مقابل میں کَافِرٌ اُسے کہا جائے گا جو ٹھوس سچائیوں کو پس پردہ رکھنا چاھے ۔ جو خدا کے دئے ھوئے ابدی حقائق کو پوشیدہ رکھے اور انہیں ابھر کر سامنے نہ آنے دے ۔ یا جو اپنی یا دوسروں کی صلاحیتوں کو چھپائے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے ۔ ان کی نشو و نما نہ ھونے دے ۔

چھپانے کے مفہوم کی وجہ سے اس کے معنی انکار کرنے کے بھی ھو گئے۔ اِیْمَانٌ کے مقابل میں کُفْرٌ کے یہی معنی ھوتے ھیں ۔ یعنی قرآنی صداقتوں کا انکار کرنا ۔

کُفْرٌ بمقابلہ شُکْرٌ بھی آتا ھے ۔ اس لئے کہ شکر کے معنی ھیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا (دیکھئے ش ۔ ک ۔ ر) ۔ لہذا کُفرانِ نعمت کے معنی ھیں نعمتوں کا چھپا لینا ۔ انہیں نوع انسانی کے فائدے کے لئے کھلا نہ رکھنا ۔

کَفَّارَۃٌ کو کفارہ اس لئے کہتے ھیں کہ وہ غلط کام کے ضرر رساں نتیجہ کو ڈھانپ لیتا ھے* ۔ کَفَرَ کے تین مصدر ھیں ۔ (۱) کُفْرَانٌ ۔ (۲) کُفْرٌ اور (۳) کُفُوْرٌ ۔ کُفْرَانٌ کا استعمال عام طور پر انکارِ نعمت کے لئے ھوتا ھے اور کُفْرٌ کا استعمال دینی معاملات کا انکار کرنے کے لئے ۔ اور کُفُوْرٌ ان دونوں میں استعمال ھوتا ھے* ۔ صاحب تاج نے البصائر کے حوالہ سے لکھا ھے کہ بیشتر کَافِرٌ (بمعنی کافر دین) کی جمع کُفَّارٌ آتی ھے ۔ ($\frac{۳۸}{۲۹}$) اور کَافِرٌ (بمعنی کافرِ نعمت) کی جمع کَفَرَۃٌ* ۔ (مثلاً $\frac{۸}{۴۲}$ میں)۔ لیکن

---

*تاج ۔ **الالفاظ المترادفۃ ۔ ***راغب ۔

ہمارا خیال ہے کہ قرآن کریم میں کُفَّارٌ - کَفَرَةٌ اور کَافِرُوْنَ سب ہی جمعیں بلا تفریق، کافر دین کے لئے استعمال ہوئی ہیں - کَافُوْرٌ - ویسے تو اس خول کو کہتے ہیں جو شگوفہ کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے* لیکن یہ ایک مشہور خوشبودار دوائی کا بھی نام ہے جس کا اثر حدت کو کم کر دینا ہوتا ہے۔

کَفُوْرٌ - بڑا ناشکرا ، بڑا منکر حق - اس میں کافر سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۳۱/۳۲) - اور کَفَّارٌ بھی کَفُوْرٌ کے ہم معنی ہے ، بلکہ اس میں کبھی کَفُوْرٌ سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے (۵/۲۴)** ۔

قرآن کریم میں کُفْرٌ بمقابلہ اِیْمَانٌ متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۲/۴ ؛ ۲/۹ میں) - اور شُکْرٌ کے مقابل بھی (۱۳/۲) - سورۂ انبیاء میں مومن کے متعلق کہا ہے کہ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ (۲۱/۹۴) - یعنی اسکی کوششوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا - وہ بے نتیجہ نہیں رہینگی (اس لئے کہ شُکْرٌ کے معنی ہیں کوششوں کے بھر پور نتائج مل جانا) - اسی طرح وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ (۳/۱۱۴) کے بھی یہی معنی ہیں - یعنی ان کا ہر عمل خیر پورا پورا نتیجہ مرتب کریگا ۔

سورۂ بقرہ میں اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ کے مقابلہ میں کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کی تاکید آئی ہے (۲/۲۵۶) - اس کفر بالطاغوت کی تشریح دوسرے مقام پر وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) کہکر کر دی - یعنی غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کرو - اس کی تفسیر سورۂ نساء میں ان الفاظ سے کر دی کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (۴/۶۰) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین سے کرائیں حالانکہ ان سے کہدیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قانون سے اجتناب کریں - اُن سے انکار کر دیں - کہدیں کہ ہم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے ۔

لہذا اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ (یا اللہ کی عبادت)*** کے معنی ہیں خدا کے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اور کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کے معنی ہیں غیر خدائی قانون سے اجتناب کرنا - اس سے ظاہر ہے کہ ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذہن تک محدود ہوں - ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ہے - قرآن کریم کے قانون کی صداقت کو

---

*تاج - **راغب - ***وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶)۔

تسلیم کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اسکے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے - چنانچہ (۳۰/۴۴) میں کَفَرَ کے مقابلہ میں عَمِلَ صَالِحًا آیا ہے -

انکار کے لحاظ سے اس کے معنی بری الذمہ ہونے کے بھی آتے ہیں - سورۂ ابراہیم میں ہے اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ (۱۴/۲۲) - تم نے جو مجھے شریک بنایا تو میں اس سے بری الذمہ ہوں - *کاشتکار کے معنوں میں کُفَّارٌ جو کَافِرٌ کی جمع ہے (۸۰/۴۲) میں آیا ہے* - کَافِرَۃٌ کی جمع کَوَافِرُ (۶۰/۱۰) میں آئی ہے - کَفَّارَۃٌ (۵/۴۵) - وہ عمل یا شے جس سے کسی سابقہ لغزش کی تلافی ہو جائے -

سورۂ دھر میں ''جنت کی شراب'' کا مزاج کَافُوْرًا بتایا گیا ہے (۷۶/۵) - یعنی جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات میں سکون پیدا کرنے والی - لیکن یہ انسانی ذات کی اصلاح کا پہلا مرحلہ ہے - اس سے اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں اس ''شراب'' کا مزاج زَنْجَبِیْلًا - (۷۶/۱۷) بتایا گیا ہے - یعنی مناسب قوت اور حدت پیدا کرنے والی - برودت اور حدت (ٹھنڈک اور گرمی) کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے ، سیرتِ مومن -

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

قرآن کریم کی رو سے کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان (Statement of Fact) ہے - آپ ایک پارٹی بناتے ہیں - جو لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں انہیں اس کا ممبر کہا جاتا ہے - جو اس میں شامل نہیں ہوتے وہ غیر ممبر (Non-Members) کہلاتے ہیں - یہی فرق مومن اور کافر کا ہے - اسلامی معاشرہ کے ممبروں کو مومن کہا جاتا ہے - اور جو اس معاشرہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں وہ ''نان ممبرز'' (کافر) ہوتے ہیں -

ان ''غیر ممبروں'' (کافروں) کے متعلق جس جس عذاب (تباہیوں) کا ذکر آیا ہے وہ ان کی غلط روش کے نتائج ہوتے ہیں جسے وہ صحیح راستہ کے انکار سے اختیار کرتے ہیں - یعنی صحیح راستہ کی پیروی چھوڑ کر (۲/۳۸) غلط راستہ اختیار کر لینا (۲/۳۹) اور اس طرح تباہیوں میں جا گرنا۔ (۲/۳۹) -

کَفَّرَ عَنْہُ کے معنی ہیں دور کردینا - (۲/۲۷۱) -

اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آئیے کہ قرآن کریم نے کفر کا لفظ عملِ صالح کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے (۳۰/۴۴) - لہذا ایمان اور کفر صرف نظری (Theoretical) اعتقاد نہیں بلکہ عمل اور بے عملی (یا صحیح

عمل اور غلط عمل) کا نام ہے۔ یہیں سے سورۃ البقرہ کی اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور غلط مفہوم سے طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورۃ بقرۃ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں، انہیں قرآن کریم صحیح روش کی طرف راہ نمائی دیتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''جو لوگ کافر ہوگئے ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے''۔ ''کافروں'' سے مراد لئے جاتے ہیں ''غیر مسلم''۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے۔ مسلمان نہیں ہوتے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں (کافروں) کو رسول کا انذار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر رسالت اور تبلیغ ہے کن لوگوں کے لئے؟ مومنین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اور کافروں کو یہ کچھ فائدہ نہیں دیتا! نیز جب نبی اکرمؐ نے انذار شروع کیا ہے تو اس وقت ساری دنیا ''کافر'' ہی تھی۔ اگر حضورؐ کا انذار کفار کے لئے بے سود تھا تو حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی (معاذ اللہ) کچھ نہیں تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں کفار سے مطلب سب غیرمسلم نہیں۔ یہ غیر مسلموں کے ایک مخصوص گروہ کا نام ہے۔ جہاں تک ''غیر مسلموں'' کا تعلق ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائلی باشندے، یا قطب شمالی کے اسکیمو، جنہوں نے ابھی تک اسلام یا قرآن کریم کا نام بھی نہیں سُنا، وہ بھی غیر مسلم ہیں۔ لیکن ان کا شمار کفار کے زمرے میں نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے، کفر، ایمان کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ایک شخص کے سامنے قرآن کریم کی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں۔ اسے ان کا مفہوم اور مطلب سمجھایا جاتا ہے۔ وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کے بعد برضا و رغبت انہیں تسلیم کر لیتا ہے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے۔ اس کے سامنے بھی اسی طرح قرآنی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اسے کافر کہینگے۔ ان لوگوں کے انکار کی کئی وجوہات اور متعدد محرکات ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اس سے سرکشی برتتے ہیں۔ خود بھی اس راستے سے رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر غیرمسلم، کافر نہیں ہوتا ۔ کافر وہی ہوتا ہے جس کے سامنے حق کو پیش کیا جائے لیکن وہ تمام دلائل و براہین کے باوجود، اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور پھر لاکھ کوشش کرو، وہ اپنی ضد پر اڑا رہے ۔ کفار کی اس ذہنیت ، اور اس کے بعد حق کی مخالفت میں ان کی تگ و تاز کا ذکر ، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کیا ہے ۔ مثلاً

(۱) وہ اہل کتاب کے متعلق کہتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (۲/۸۹) ۔ "جب ان کے پاس وہ آیا جسے وہ پہچانتے تھے ، تو انہوں نے اس سے انکار (کفر) کر دیا" ۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ، ان کے ایمان لانے کے بعد ، پھر کفر کی طرف لوٹا دیں ، مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۰۹) "بعد اس کے کہ حق ابھر کر ان کے سامنے آگیا" ۔ سورۃ محمد میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷/۳۲) ۔ "یقیناً جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد اس کے کہ ہدایت ان کے سامنے ابھر کر آچکی ہے ۔ ۔ ۔" ۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ ، حق اور صداقت (ہدایت) کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد ، اس سے انکار کئے جانا ، کفر کہلاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے کفر اور ایمان کے امتیاز کا ذکر ہی حق کے سامنے آجانے کے بعد کیا ہے ۔ سورۃ کہف میں ہے وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ ۔ ۔ (۱۸/۲۹) ۔ "اور (ان سے کہو کہ) حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے ۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرلے" ۔ سورۃ دھر میں ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳) ۔ "ہم نے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے ۔ اب اس کا جی چاہے تو اس کا قدردان بن جائے اور چاہے تو اس سے انکار کردے" ۔ سورۃ زخرف میں ہے وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ ۔ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۳/۳۰) ۔ "اور جب حق ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ ہے اور ہم اس سے انکار کرتے ہیں" ۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اس سے انکار کرنا ، کفر کہلاتا ہے ۔ جن لوگوں کے سامنے حق آیا ہی نہیں وہ غلط راستے (ضلالت) پر تو ہیں لیکن انہیں کافر نہیں کہا جائے گا ۔ ان کا شمار ضَآلِّیْن میں ہوگا ۔ یعنی راہ گم کردہ ۔ غلط راستے پر چلنے والے ۔

(۲)　سورۃ توبہ میں ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ( ۹/۲۳ ) ۔ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں ۔ اس سے واضح ہے کہ کفر ، اس انکار کی راہ کا نام ہے جسے انسان اپنی پسندیدگی سے اختیار کرے ۔ اسی طرح سورۃ النحل میں ہے کہ کفر اس کا ہے مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا ( ۱۶/۱۰۶ ) ۔ ''جس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے'' ۔ لہذا کفر وہ ہے جسے انسان اپنے اختیار و ارادہ (Choice) سے پسند کرے ۔

(۳)　اس قسم کے انکار کے کئی محرکات ہوتے ہیں ۔ مثلاً اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ بَغْيًا ایسا کرتے ہیں ( ۲/۹۰ ) ۔ یعنی ضد اور سرکشی کی بنا پر ۔ یا حسَدًا ایسا کرتے ہیں ( ۲/۱۰۹ ) ۔ عام مخالفین حرب کے متعلق ہے کہ وہ اس دعوت سے انکار کرتے تھے اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ ( ۳۵/۴۳ ) ۔ ''تکبر کرتے ہوئے اور بری تدبیریں کرتے ہوئے'' ۔ یعنی انہوں نے ظلم اور استبداد ، اور دجل و فریب سے جو قوت اور دولت حاصل کر رکھی تھی ، وہ اس کے نشے میں بدمست ہو کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی ۔ ( نیز دیکھئے ۳۵/۴۳ ) ۔ سورۃ نمل میں ہے کہ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ( ۲۷/۱۴ ) ۔ ''انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہماری آیات سے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا'' ۔

(۴)　بعض اوقات انسان ، محض بات کی پچ میں حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے ۔ یعنی اگر ایک دفعہ منہ سے نہ نکل گئی تو پھر (محض اپنی بات پر جمے رہنے کی خاطر) نہ کرتے چلے گئے ۔ سورۃ اعراف میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۔ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ( ۷/۱۰۱ )۔ ''اور یقیناً انکے پاس رسول واضح دلائل لیکر آئے ۔ مگر وہ ایسے نہ تھے کہ جس بات کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا ، اس پر ایمان لے آتے'' ۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں ۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ( ۷/۱۰۱ ) ۔

(۵)　یہ لوگ ، ضد ۔ حسد ۔ ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے بعد ، دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ وہ اسے تسلیم نہ کر لیں ۔ وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ ( ۶/۲۶ ) ۔ '' وہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور

رهتے هیں "۔ دوسری جگہ هے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ .... (۴۷/۳۲) " یقیناً وہ لوگ جنہوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے هیں " (وہ اپنا هی نقصان کرتے هیں ، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) ۔ ان کی کیفیت یہ هوتی هے کہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ وہ لوگوں کو تاکید کرتے رهتے هیں کہ اس قرآن کریم کو مت سنو ۔ وَالْغَوْا فِيْهِ ۔ اور (جہاں کہیں اس کا چرچا هوتا هو) اس میں شور مچاؤ ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶)۔ شاید تم (اس طریق سے ان پر) غالب آسکو۔

یہ هیں وہ لوگ کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) ۔ چاهے تو انہیں (ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرے یا نہ کرے، ان کے لئے برابر هے ۔ یہ کبھی ایمان نہیں لائینگے ۔ اسلئے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ هوتا هے کہ ان میں سمجھنے ، سوچنے ، دیکھنے ، سننے کی صلاحیت هی باقی نہیں رهتی (۲/۷) ۔ یہی وہ لوگ هیں جن کے متعلق قرآن کریم کہتا هے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) ۔ ان کا ٹھکانہ جہنم هے (۷/۱۷۹)۔ " ان کے دل هیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے ۔ اور ان کی آنکھیں هیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ۔ اور ان کے کان هیں لیکن ان سے سنتے نہیں ۔ یہ لوگ (یونہی شکل و صورت سے انسان نظر آتے هیں ورنہ درحقیقت) حیوانات کی سطح پر زندگی بسر کرتے هیں ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ " (کیونکہ وہ کم از کم اپنی جبلت پر توقائم رهتے هیں)

سوال یہ هے کہ یہ کفر کی زندگی هے کیا ؟ یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی هے کہ ایک تصور زندگی یہ هے کہ انسانی زندگی بس یہی طبیعی زندگی هے۔ کھایا ، پیا ، زندہ رهے ، بچے پیدا کئے اور مر گئے ۔ اس کے بعد ختم ۔ دوسرا تصور زندگی یہ هے کہ انسان ، اسی طبیعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم هو جاتا هے ۔ اس میں ایک اور چیز بھی هے جسے انسانی ذات (Personality) کہا جاتا هے ۔ اس ذات کی نشوونما سے انسان حیات جاوید حاصل کر سکتا هے ۔ موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ حیوانات کو " ذات " نہیں دی گئی ۔ یہ صرف انسانوں کا خاصہ هے ۔

پہلا تصور زندگی ، کفر هے ۔ اس میں انسان ، حیوانات کی سطح پر رهتا هے ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ ۔ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲) ۔ " جو لوگ کفر کی روش اختیار

کرتے ہیں ، وہ سامان زیست سے متمتع ہوتے ہیں ، اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ہیں)۔ جہنم ان کا ٹھکانہ ہے''۔ یہ زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف ذات کی نشوونما کے لئے ہوتی ہے)۔ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں ، اور ان جذبات میں ایسے ڈوبتے ہیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ سورہ الجاثیہ میں ہے أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ ۔ کیا تو نے اسکی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ خدا کا قانون ، اس کے علم کے باوجود ، زندگی کی صحیح راہ اس کے سامنے نہیں لاتا ۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهِ غِشٰوَةً ۔ (جذبات میں بہ جانے سے اسکی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ) اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کے علاوہ کوئی اور قانون صحیح راستے کیطرف اسکی راہ نمائی نہیں کر سکتا ۔ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ اس سے نصیحت نہیں پکڑتے ؟ (۴۵/۲۳)

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اسطرح جذبات کے پیچھے کیوں بہ جاتے ہیں اور زندگی کی بلند اقدار کا اتباع کیوں نہیں کرتے ؟ اس لئے کہ وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا ۔ اور کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ نَمُوْتُ وَنَحْيَا ۔ ہم (طبیعی قوانین کے ماتحت) مرتے اور جیتے ہیں ۔ وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۔ وقت گزرنے سے ہمارے قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور ہم مرجاتے ہیں ۔

یہ ہے ان کا تصورِ زندگی ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) ۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ۔ یونہی اپنے قیاسات سے باتیں کرتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے ۶/۲۹)

اسی کا نام کفر ہے ۔ یعنی انسان کا اپنی ذات سے انکار ۔ اس انکار کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے ، نہ وحی اور رسالت پر ۔ اور آخرت کی زندگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہٰذا ، کفر درحقیقت مادی تصورِ حیات کا دوسرا نام ہے ۔ یعنی (Materialistic Concept of Life) ۔ اس تصورِ زندگی کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین ، انسان کا منتہائے زندگی قرار پا جاتا ہے اور زندگی کی بلند اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

جب انسان اس تصور زندگی کو عین حقیقت سمجھ لے ، تو جن امور سے بلند انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے ، اسے ان سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے ۔ حیوان کو آپ کیا سمجھا سکتے ہیں کہ دیانتداری کی زندگی بہت بلند ہوتی ہے اور بددیانتی سے شرف انسانیت کا زیاں ہوجاتا ہے !

# ک ف ف

اَلْکَفُّ ۔ (۱۳/۱۴) ۔ پہنچے تک ہاتھ کو کہتے ہیں ، کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مدافعت کرتا اور دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے سے روکتا ہے ۔ کَفَفْتُہٗ عَنْہُ (۵/۱۱) ۔ میں نے اسے اس بات سے روک دیا ۔ ہٹا دیا ۔ موڑ دیا ۔ فَکَفَّ ھُوَ ۔ پس وہ رک گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پکڑنا اور سکڑنا ہیں ۔ ہاتھ کو کَفٌّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ چیزوں کو پکڑ لیتا ہے ۔ اَلْکُفَّۃُ ۔ کسی چیز کے آخری کنارے کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ اسی کو کِفَافُ الشَّیْءِ بھی کہتے ہیں ۔ کِفَّۃٌ ۔ ترازو کے ایک پلڑے یا بازو کو کہتے ہیں ۔ کَافَّۃٌ اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اُس کی انتہا تک لے جا کر روک دے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں جو ہے وَقَاتِلُوْا الْمُشْرِکِیْنَ کَافَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَافَّۃً (۹/۳۶) ۔ تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ "مشرکین سے ایسی جنگ کرو جو انہیں ظلم و ستم سے روک دے ۔ یا جو تمہیں ان کے اثرات سے روک دے ۔" اس صورت میں کَافَّۃٌ صفت ہوگی حَرْباً یا مقاتلۃً کی جو مقدر ہے ۔ اسی کو حد آخر تک جنگ کرنا کہا جائیگا ۔ اور (جیسا کہ راغب نے آگے چل کر لکھا ہے) یہ بھی کہ مشرکین سے اجتماعی قوت سے (جماعۃً) جنگ کرو ۔

عام لغت و تفسیر کی رو سے اس آیت میں کَافَّۃً کے معنی ہیں "کل ۔ تمام کے تمام ۔ جمیع" ۔ لیکن قرآن کریم میں انہی مشرکین سے جنگ کرنے کا کہا گیا ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ۔ یہ نہیں کہ جو مشرک جہاں بیٹھا ہو اس پر دھاوا بول دیا جائے ۔

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (۲/۲۰۸) کے معنی ہیں ، تم اسلام میں وہاں تک پہنچ جاؤ جہانتک اس کے شرائع کی آخری حدود ہیں * ۔ یعنی اس کی انتہا تک پہنچ جاؤ ۔ یونہی تھوڑا سا چل کر رک نہ جاؤ ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی جَمَاعَۃً بھی کئے ہیں ۔ یعنی اجتماعی طور پر** ۔ لیکن اس کے معنی روکنے یا حد آخر کے مفہوم سے

*تاج ۔ **راغب ۔

زیادہ واضح ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ خود راغب نے آیت وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ ۔ (۳۴/۲۸) کے معنی کئے ہیں ہم نے تمہیں معاصی سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے***۔

روکنے کے معنی میں یَکُفُّوْنَ (۲۱/۳۹) میں آیا ہے ۔ اور (۴/۳۸) میں بھی۔ نیز بَسْطٌ کے مقابلہ میں (۵/۱۱) میں ۔ اَلْکَفَافُ مِنَ الرِّزْقِ ۔ رزق کی اتنی مقدار جو انسان کو دوسرے انسانوں کا محتاج بننے سے روک دے*۔ اسی لئے اَلْکَفُّ کے معنی نعمت کے ہیں*۔

# ک ف ل

اَلْکَفَلُ ۔ کھولھے یا کولھے کے نچلے حصے کو کہتے ہیں*۔ اِکْتَفَلَ بِہٖ ۔ اسے پیچھے کر دیا*۔ اسی سے اَلْکَافِلُ اور اَلْکَفِیْلُ کے معنی ذمہ دار اور ضامن کے آتے ہیں ۔ کَفَّلَہٗ ۔ اسکی خبر گیری کی ۔ اس پر خرچ کیا ۔ اسکا انتظام کیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دوسری چیز کے اندر شامل ہو جانے اور متضمن ہو جانے کے ہیں ۔

سورہ قصص میں ہے یَکْفُلُوْنَہٗ (۲۸/۱۲)۔ جو اسے پالیں ۔ اسکی پرورش اور نگہ پرداخت کریں ۔ سورہ نحل میں ہے ۔ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ عَلَیْکُمْ کَفِیْلًا (۱۶/۹۱) ۔ تم اللہ کو اپنا ضامن قرار دے چکے ہو ۔ سورہ صٓ میں ہے اَکْفِلْنِیْھَا (۳۸/۲۳) ۔ اس (دُنبی) کو میری کفالت میں دیدے ۔ میرے سپرد کر دے ۔ میری ملکیت بنا دے ۔ سورہ آل عمران میں ہے ۔ وَکَفَّلَھَا زَکَرِیَّا (۳/۳۷) ۔ مریم کو زکریا کی کفالت میں دیدیا ۔

اَلْکِفْلُ ۔ حصہ ۔ نصیب ۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کسی کے ساتھ دوسرے کو بھی اتنا ہی حصہ دیا جائے*۔(۴/۸۵) ۔ کِفْلَیْنِ ۔ دو حصے ۔ دوگونہ حصے (۵۷/۲۸) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہاں کِفْلَیْنِ سے مراد دو عدد نہیں بلکہ تواتر و تسلسل نعمت مراد ہے اور اس میں حسب ضرورت کا مفہوم بھی ہے***۔

سورہ انبیاء میں ذَاالْکِفْلِ (۲۱/۸۵) کا نام زمرۂ انبیاء میں آیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ شاید یہ حزقیل نبی ہیں جن کا ذکر توریت میں آتا ہے****۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ذوالکفل سے مراد کپل و ستو والا (یعنی گوتم بدھ) ہیں ۔

چونکہ قرآن کریم نے ان کے احوال و کوائف بیان نہیں کئے اس لئے اگر متعین طور پر نہ بھی کہا جاسکے کہ یہ کون تھے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ نیز دیکھئے عنوان ذَا الْکِفْل ۔

# ک ف ی

اَلْکِفَایَۃُ ۔ وہ چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور مقصود حاصل ہو جائے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اتنی مقدار میں ہونا کہ وہ ضرورت کو پورا کر دے اور اس سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو۔ کَفَاکَ الشَّیْءُ یَکْفِیْکَ ۔ تجھے وہ چیز کافی ہے ۔ اَلْکُفْیَۃُ ۔ غذا جو زندگی کے لئے کافی ہو۔ کَفَاہُ مُؤْنَتَہٗ ۔ فلاں آدمی نے اس کے پرمشقت کام کو اپنے سر لے لیا اور اسے اس سے بچا دیا**۔ کَفَیْتُہٗ شَرَّعَدُوِّہٖ میں نے اسے اسکے دشمن کے شر سے محفوظ رکھا اور بچا لیا ***۔ رَجُلٌ کَافٍ و کَفِیٌّ ۔ جو تمہارے لئے کافی ہو اور اسکے بعد تمہیں کسی کی ضرورت نہ ہو ۔ کَافَاہُ مُکَافَاۃً ۔ وہ اسکو کافی ہو گیا *** ۔ اَلْکَفِیُّ ۔ بارش**۔ کَفٰی عَنْہُ الشَّیْءَ ۔ اس چیز کو اس سے ہٹا دیا یا پھیر دیا**۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ (۹۵/۱۵) ۔ یہ لوگ جو تیرے خلاف شرارتیں کرکے خوش ہوتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کی مخالفت سے تیری مدافعت کرنے کے لئے کافی ہیں ۔ ہمارا قانون جس پر تو چل رہا ہے ان کے مقابلہ میں تیری حفاظت بھی کریگا اور تیرا مقصود بھی حاصل ہو جائیگا ۔ ( کَفٰی میں دونوں باتیں شامل ہیں ) ۔ انہی معنی میں ہے فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ (۲/۱۳۷) ۔ سورہ زمر میں ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (۳۹/۳۶) ۔ خدا کے احکام کی اطاعت کرنے والے ( عَبْدٌ ) کو خدا کا قانون مکافات تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دیتا ہے ۔ اسکی تشریح اس سے اگلے ٹکڑے نے یہ کہکر کر دی کہ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ (۳۹/۳۶) ۔ یہ لوگ تجھے غیر خدائی قوتوں سے ڈراتے ہیں ۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ۔

یہ ہے قوانین خداوندی کے اتباع کی بنیادی خصوصیت ۔ سورہ رعد میں ہے ۔ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (۱۳/۴۳) ۔ شہادت ( یا نگرانی ) کے لئے خدا کافی ہے ۔

---

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

انسان کے لئے کسقدر اطمینان اور سکون کا موجب ہے یہ بات کہ اسے ایسا ضابطۂ زندگی مل جائے جو اسے تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دے۔ اور اسطرح اسے دنیا کی ہر آستان سے مستغنی کر دے۔

## ک ل أ

كَلَأَ۔ يَكْلَأُ۔ كَلْأً۔ وَكِلَاءً وكِلَاءَةً۔ حفاظت کرنا۔ چوکیداری کرنا۔ نگرانی کرنا*۔ اَلْمُكَلَّأُ۔ نہر کا کنارا۔ ساحل۔ بندرگاہ۔ ہر وہ مقام جہاں ہوا سے پناہ لی جائے**۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنوں میں دیکھ بھال کرنا اور چوکیداری کرنا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔ مَنْ يَكْلَؤُكُمْ (۲۱/۴۲)۔ تمہاری حفاظت کون کرتا ہے؟ کون تمہارا نگران ہوتا ہے؟

## ک ل ب

اَلْكَلْبُ۔ ہر چیر پھاڑ کرنے والے جانور (درندے) کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ کتے کے لئے ہی استعمال ہونے لگا (۷/۱۷۶)۔ ویسے شیر کو بھی کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ سختی سے لٹک جانا ہیں۔ چنانچہ اَلْكَلْبُ آنکڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سامان لٹکایا جاتا ہے۔ اَلْكُلْبَةُ مِنَ الْعَيْشِ۔ روزی کی تنگی*۔ اَلْمُكَلِّبُ۔ کتوں کو شکار کے لئے سدھانے والا*۔ پھر یہ عام شکاری جانوروں (اَلْجَوَارِحُ) کو سدھانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ سورۃ المائدہ میں ہے وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللهُ۔۔۔۔ (۵/۴)۔ اور (تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے) جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ۔ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) کی رو سے جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔

(ضمناً) اس آیت میں ایک چیز اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تم شکاری جانوروں کو جو شکار کرنا سکھاتے ہو تو یہ اس علم کی رو سے ہے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ نے یہ علم، شکاریوں کو خود نہیں سکھایا۔ اس نے اس کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے۔ اب جو انسان چاہے اس علم کو سیکھ لے۔ اللہ نے اس کی نسبت اپنی

*تاج۔ **محیط۔

طرف اس لئے کی ہے کہ اس علم کی تحصیل کی استعداد انسان کو اس نے دی ہے ۔ لہذا ، انسان جو کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کی رُو سے کرتا ہے، اُسے اللہ اپنی طرف بھی منسوب کرلیتا ہے ۔ اس نکتہ کے سمجھ لینے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جاتے ہیں ۔ (مثلا دیکھئے ۲/۲۲) ۔

## ک ل ح

کَلَحَ یَکْلَحُ ۔ کُلُوْحًا و کُلَاحًا ۔ ترش روئی کے ساتھ ہونٹوں کا اوپر کو اُٹھ جانا اور دانتوں کا نظر آنے لگنا ، بُرا منہ بنانا ۔ بڑی شدت سے منہ بگاڑنا ۔ اَلْکَلُوْلَحُ ۔ بد نما آدمی ۔ اَلْکُلَاحُ ۔ قحط سالی کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی ترشروئی اور چہرے کے بد نما ہونے کے لکھے ہیں ۔

سورۃ مومنون میں ہے هُمْ فِیْهَا کَالِحُوْنَ (۲۳/۱۰۴) ۔ وہ اس میں برا منہ بنا رہے ہونگے ۔

## ک ل ف

اَلْکَلَفُ ۔ سیاہی مائل زردی ۔ اَلْکُلْفَةُ ۔ سیاہی مائل زرد ۔ مشقت کے باوجود جس کام کو برداشت کیا جائے ۔ ہر مصیبت یا حق جسے بدقت و صعوبت برداشت کیا جائے ۔ اَلْکُلُوْفَ ۔ امر شاق ۔ اَلتَّکْلِیْفُ ۔ ایسے کام کا پابند کرنا جو کسی پر گراں گزرے ۔ تَکَلَّفَ الْاَمْرَ ۔ اس نے ایسے کام کو باوجود مشقت و تنگی برداشت کرلیا جس کا کرنا اس پر گراں گزرتا تھا**۔ تَکَلَّفُ الشَّیْئِ ۔ کسی کام کو اظہار شیفتگی کے ساتھ کرنا اگرچہ اس کے کرنے میں اسے مشقت پیش آئے ۔ اسی لئے عرف عام میں کُلْفَةٌ مشقت کو کہتے ہیں اور تَکَلُّفٌ اس کام کے کرنے کو جو مشقت ، تصنع یا اوپرے جی سے دکھاوے کے لئے کیا جائے ۔ چنانچہ سورۃ صؔ میں جو ہے ۔ کہ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (۳۸/۸۶) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ میں دکھاوے کے لئے یہ کچھ نہیں کر رہا ۔

قرآن کریم میں کئی ایک مقامات میں آیا ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) ۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتا ۔ اس میں یہ سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ایک فرد کی وسعت کی حد وہ ہوگی جس تک وہ اپنی انتہائی کوشش اور محنت کے بعد

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ **راغب ۔

پہنچے - یہ نہیں کہ انسان کسی حکم کی تعمیل میں پوری پوری کوشش نہ کرے اور یہ کہکر اپنے آپ کو اطمینان دے لے کہ مجھے اللہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا - لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ، انسان پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے تو وہ اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو۔ یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں ہوتیں ، بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہیں، جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے -

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ کس مقام پر کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں -

# ک ل ل

کُلٌّ - کسی چیز کے تمام اجزاء - سب کا سب - مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے - کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ایک معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے گھیر لینا بتائے ہیں -

کَلٌّ کے معنی وکیل - بت - نو پیدا مصیبت - یتیم بچہ - صاحب عیال آدمی کے بھی آتے ہیں - نیز ایسا نکما شخص جو دوسرے پر بوجھ ہی بوجھ ہو اور اس میں کوئی بھی خوبی نہ ہو*۔ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلَاهُ (۱۶/۷۶) - وہ اپنے آقا پر سراسر بوجھ ہے -

كَلَّ - كَلَالٌ - كَلَالَةٌ کے معنی ہیں عاجز آ جانا ، تھک جانا*۔

اَلْكَلَالَةُ - قرآن کریم میں احکامِ وراثت کے ضمن میں اَلْكَلَالَةُ کا ذکر دو جگہ آیا ہے - ایک (۴/۱۲) میں اور دوسرا (۴/۱۷۶) میں - مفسرین نے اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ کلالہ کسے کہتے ہیں - (چونکہ احکامِ وراثت ایک فنی موضوع ہے اور ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیلی گفتگو نہیں کر رہے اس لئے ہم ان بحثوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے - مختصراً یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان میں سے) ایک گروہ کا خیال ہے (اور اکثریت اسی خیال کی حامل ہے) کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد - ابن قتیبہ نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے

---

*تاج -

کہ یہ مصدر ہے تَکَلَّلَہُ النَّسَبُ سے ، جس کے معنی ہیں ''نسب اس کے اطراف تک پہنچ گیا'' ۔ باپ اور اولاد آدمی کی دونوں طرفین ہوتی ہیں ۔ جب آدمی مر جائے اور نہ باپ چھوڑے اور نہ اولاد تو وہ اسطرح مر گیا کہ اس کی دونوں طرفیں چلی گئیں ۔ اسے کلالہ کہتے ہیں* ۔

المغرب (لغت کی مشہور کتاب) جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۵۹ میں ہے کہ والد اور ولد کے سوا جو وارث بھی ہو وہ کلالہ ہے ۔ اور اس کا اطلاق وارث اور موروث دونوں پر ہوتا ہے ، اس قرابت (نسبی) کے اعتبار سے جو والد اور ولد کی حیثیت سے نہ ہو ۔ لسان العرب میں (اخفش اور فراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ) کلالہ ، قرابت (نسبی) کی رُو سے ہر وہ قرابت مند ہے جو والد اور ولد کے سوا ہو ۔ یہ تو رہی لغت کی بحث ۔ قرآن کریم نے چار لفظوں میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ کَلَالَۃٌ کسے کہتے ہیں ۔ سورۃ نساء میں ہے اِنِ امْرُؤٌا ھَلَکَ لَیْسَ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَہٗ اُخْتٌ فَلَھَا . . . . . ( $\frac{۴}{۱۷۷}$ ) ۔ ''اگر کوئی شخص مرجائے ۔ اس کی اولاد کوئی نہ ہو ۔ اور اس کی بہن ہو تو (اس کا حصہ یوں ہوگا) ۔ اسی سورت کے شروع میں ہے . . . . وَّ لَہٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ . . . . . ( $\frac{۴}{۱۲}$ ) ۔ ''اور اس کا بھائی یا بہن ہوں تو'' ۔ یعنی کلالہ ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کی اولاد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کا بھائی یا بہن ہو ۔ والدین کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی شرط نہیں ۔ اگر اس کے ماں باپ ہونگے تو ( $\frac{۴}{۱۲}$ ) کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور طرح ہوگی ۔ اور اگر وہ نہ ہونگے تو ( $\frac{۴}{۱۷۸}$ ) کے مطابق تقسیم اور ہوگی ۔

اَلْاِکْلِیْلُ ۔ تاج** ۔ اور اَلْکَلِیْلُ ۔ حالت ۔ کیفیت** ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ کُلٌّ کے معنی سب کے سب ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں ہے کہ ان سے کہا کہ چار پرندے لو اور انہیں سدھاؤ ۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ ( $\frac{۲}{۲۶۰}$ ) ۔ اس میں کُلِّ جَبَلٍ سے مراد بعض پہاڑ ہیں ۔ لیکن یہاں کُلِّ کے معنے سب بھی ہوسکتے ہیں ، اس لئے کہ کُلِّ اضافی اسم ہے اور جب کسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کے حلقہ میں جس قدر ہوں وہی کل ہو جاتے ہیں ۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں پہاڑ ہی دو چار ہوں ۔ اس اعتبار سے کُلّ کے معنی کُل ہی ہونگے ۔ دوسری طرف سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے متعلق ہے ۔ وَ اٰتَیْنٰہُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا ( $\frac{۱۸}{۸۴}$ ) ۔ ہم نے اسے ہر

*القرطین ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۱۱۶ ۔ **تاج

قسم کا سامان دے رکھا تھا ۔ اس میں "کُلِّ شَیْءٍ" سے مراد دنیا کی تمام چیزیں نہیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ استحکام مملکت وغیرہ کے تمام ضروری سامان دے رکھے تھے اور ان ضروری سامانوں میں سے بھی ہر ایک سامان کا کچھ حصہ ۔ لفظ مِن کا مطلب ''کچھ حصہ'' ہے ۔

"کُلٌّ" کے پہلے اِنْ نافیہ اور بعد میں اِلاَّ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی بھی ایسا نہیں تھا'' ۔ اِنْ کُلٌّ اِلاَّ کَذَّبَ الرُّسُلَ (۳۸/۱۴) ۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے رسولوں کو نہ جھٹلایا ۔ سب نے جھٹلایا ۔

"کُلَّمَا" ۔ جب کبھی ۔ کُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِیْهِ (۲/۲۰) ۔ جب کبھی وہ انہیں روشنی دیتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں ۔

کَلَّا اور کِلاَ ۔ دو جداگانہ الفاظ ہیں ۔ انہیں الگ عنوانات میں دیکھئے ۔

# کَلَّا (حرف)

کَلَّا ۔ (۱) یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں '' نہیں بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ '' ۔ کَلَّا بَلْ لاَّ تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ (۸۹/۱۷) ۔ ہر گز ایسا نہیں ۔ بلکہ بات یہ ہے کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے ۔ (اس میں جھڑکنے ، تنبیہ کرنے ۔ یا باز رکھنے ۔ یا مذمت کرنے کا پہلو ہوتا ہے ) ۔

(۲) '' حقیقت یہ ہے '' ۔ '' واقعہ یہ ہے '' ۔ کَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی (۹۶/۶) ۔ حقیقت یہ ہے ( یہ امر واقعہ ہے ) کہ انسان سرکشی اختیار کرتا ہے ۔

(۳) میرزا ابوالفضل نے نضربن شمیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی نَعَمْ ( ہاں ) کے بھی ہوتے ہیں ۔ سورہ تکاثر میں تین بار کَلَّا آیا ہے ( کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ ۔ (۱۰۲/۳-۵) ۔ ان آیات سے کَلَّا کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی خلاف حقیقت تصور کی تردید اور حقیقت کے متعلق حتم و یقین ۔

# کلا

کِلاَ ( مذکر) ۔ کِلْتَا (مونث) ۔ ''دونوں'' کے معنوں میں آتا ہے ۔ کِلاَهُمَا ۔ (۱۷/۲۳) دونوں (ماں اور باپ) ۔ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ (۱۸/۳۳) ۔ یہ دونوں باغ ۔

# ک ل م

کَلِمَةٌ کے معنی ہیں ایک لفظ ۔ ایک بات ۔ ایک جملہ یا ایک قصیدہ ۔ یا ایک خطبہ ۔ کَلِمَةٌ یا کَلْمَةٌ یا کِلْمَةٌ ۔ تینوں طرح آتا ہے ۔
کَلَامٌ کے معنی ہیں بات *۔ کَلِمٰتٌ (کَلِمَةٌ کی جمع) کے معنی امور کے بھی آتے ہیں ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے ۔ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ (۲/۱۲۴) ۔ جب ابراہیمؑ کو اس کے نشو و نما دینے والے نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے ۔ یعنی اسکے سامنے مختلف امور آئے ۔ وہ مختلف حوادث سے دو چار ہوا ۔ مختلف قسم کی باتوں سے اس کا واسطہ پڑا ۔ مختلف امور اس کے ذمہ لگائے ۔ مختلف معاملات اسکے سپرد کئے ۔ کَلِمٰتٌ میں یہ تمام معنی پوشیدہ ہیں ۔

اَلْکَلْمُ کے معنی ہیں زخمی کرنا *۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی (۱) بات کرنا اور (۲) زخمی کرنا لکھے ہیں ۔ سورہ نمل میں ہے ۔ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُهُمْ (۲۷/۸۲) ۔ یہاں تُکَلِّمُ کے معنی زخمی کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور بات کرنے کے بھی ۔ (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ب ۔ ب) نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ ک ۔ ل ۔ م کی خاصیت شدت اور قوت ہے ۔ اس کی مثال اَلْکَلْمُ ہے ۔ اَلْکَلَامُ سخت زمین کو بھی کہتے ہیں**۔

آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو نظریہ زندگی ۔ تصور حیات ۔ یا آئیڈیالوجی (Ideology) کہا جاتا ہے اسے کَلِمَةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ جیسے سورہ ابراہیم میں ہے ۔ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ (۱۴/۲۴) ۔ خوش گوار اور ثمر بار نظریہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سرسبز و شاداب درخت جسکی جڑیں مستحکم ہوں اور جسکی شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جھوم رہی ہوں ۔

کَلَّمَ ۔ کسی سے بات کرنا (۲/۲۵۳) ۔ تَکَلَّمَ ۔ کسی سے بات کرنا (۲۳/۱۹) ۔ تَکْلِیْمٌ کسی سے بات کرنا (۴/۱۶۴) ۔ نیز یہ شبہ کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے مجھے اس میں کلام ہے ۔ یا یہ روایت متکلم فیہ ہے ۔

سورہ آل عمران میں ہے ۔ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ (۳/۴۴) (اے مریم) خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے ۔

* تاج و محیط ۔ ** العلم الخفاق ۔

(اس سے آگے ہے کہ جس کے متعلق خوش خبری دی تھی اس کا نام عیسیٰ[۴] تھا) ۔ عیسائیت میں کَلِمَۃٌ (Word) یا (Logos) ایک خاص اصطلاح ہے جس کے گرد (حضرت) عیسیٰ[۴] کی ابنیت اور الوہیت کا تمام فلسفہ گردش کرتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی دور ازکار فلسفیانہ بحثوں میں نہیں الجھتا ۔

سورہ یونس میں (نیز دیگر مقامات میں) ہے وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ (۱۰/۳۳) ۔ اسطرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آگئی ۔ ان مقامات میں خدا کے کَلِمَۃ کے سیدھے سادے معنی " خدا کی بات " ھی ھیں ۔ لیکن ظاھر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے ۔ چنانچہ یہ لفظ " قانونِ خداوندی " کے معنوں میں عام طور پر استعمال ھوا ہے ۔ قوانین خداوندی کا ایک حصہ خارجی کائنات میں نافذ العمل ہے ۔ انہیں (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے ۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ھیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ھیں ۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۶/۱۱۶) ۔ قوانین خداوندی صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے ۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۶) ۔ اس سے ختم نبوت لازم آتی ہے ۔ یعنی جب ضابطہ خداوندی کی تکمیل ھو گئی اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ھو سکتی تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رھتی۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ھوجاتا ہے کہ مومن فرد یا جماعت جن حدود و قیود (خدا کے قوانین و اصول) کے اندر رھتے ھوئے زندگی بسر کرنے پر مکلف ہے ، ان حدود کو کوئی نہیں بدل سکتا ۔ یہی حدود اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی بھی متعین کرتی ھیں ۔ انہیں مملکت بھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رھتی ھوئی وہ آزاد ھوتی ہے کہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ، اپنے معاملات ، باھمی مشاورت سے طے کرے۔

## کَم

کَمْ ۔ (۱) کتنی (مقدار) (۲) کتنی (تعداد) (۳) کتنی (دیر)۔ کَمْ لَبِثْتُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۳/۱۱۲) ۔ تم کتنی مدت تک زمین میں رہے ھو۔ کَمْ مِنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً (۲/۲۴۹) ۔ کتنی ھی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں ۔ (" کئی " یا " بہتیری " سے بھی مفہوم واضح ھو جاتا ہے)

## کُمْ (ضمیر)

کُمْ - ضمیر منصوب متصل ہے - جمع مذکر حاضر کیلئے آتی ہے - ضَرَبَکُمْ اس نے تم سب کو مارا - وَعَدَکُمُ اللّٰہُ - اللہ نے تم سے وعدہ کیا (۴۸/۲۱) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے - غُلَامُکُمْ - تم سب کا غلام - سورہ آل عمران میں ہے مِنْ رَبِّکُمْ (۳/۵۰) تمہارے رب کی طرف سے -

## کُمَا (ضمیر)

کُمَا ضمیر منصوب متصل ہے - تثنیہ حاضر کیلئے آتی ہے - اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتی ہے - ضَرَبَکُمَا - اس نے تم دونوں (مردوں یا عورتوں) کو مارا - یَا تِیَنْکُمَا (۴/۱۶) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل ہے - غُلَامُکُمَا - تم دونوں کا غلام - (مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) - سورہ طٰہٰ میں ہے اِنَّنِیْ مَعَکُمَا ... (۲۰/۴۶) "میں تم دونوں کے ساتھ ہوں" - اس سے ذرا آگے ہے فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی (۲۰/۴۹) - "اے موسیٰ - تم دونوں (بھائیوں) کا رب کون ہے"؟

## ک م ل

اَلْکَمَالُ - پورا ہونا - اَلتَّمَامُ کے معنی بھی پورا ہونا ہوتے ہیں - (ان دونوں میں جو باریک فرق ہے اس کے لئے عنوان - ت - م - م دیکھئے) -

کَمَلَ - کامل ہونا - پورا ہونا - اَکْمَلَہٗ - وَکَمَّلَہٗ - اسے پورا کر دیا اور خوش نما بنا دیا - اَعْطَاہُ الْمَالَ کَمَلًا - اسے پورا پورا مال دے دیا* - راغب نے کہا ہے کہ جب کہا جاتا ہے کَمَلَ ذَالِکَ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو گئی** -

روزوں کی گنتی پورا کرنے کے لئے کہا ہے - لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ - (۲/۱۸۵) - سورۃ المائدہ میں ہے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (۵/۳) - اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں - ایک تو یہ کہ تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل

---

*تاج - **راغب - ** العلم الخفاق فی علم الاشتقاق -

کر دیا۔ اس سے اسلام کے آخری اور مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ "اب تمہیں مخالفین پر پورا پورا غالب کردیا۔ تمہارے غلبہ کو مکمل کردیا"۔ یہ اُس وقت کی جماعت مومنین کے متعلق ہے۔ اسی لئے، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالف اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں (۵/۳)۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ک۔م۔ل کا خاصہ شدت اور قوت ہے۔ کسی شے کے کمال میں اس کی قوت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے**۔

# ک م م

اَلْکِمُّ۔ آستین۔ اَلْکِمَّ۔ وہ غلاف یا خول جس سے پھول یا کلی ڈھکی ہوتی ہے۔ اسکی جمع اَکْمَامٌ ہے۔ (۵۵/۱۱ و ۴۱/۴۷)۔ کُمَّتِ النَّخْلَۃُ۔ کھجور میں بند کلیاں لگ گئیں۔ ایسا درخت مَکْمُوْمٌ کہلائیگا۔ اَلْکِمَامُ۔ اونٹ کے منہ پر جو غلاف (یا چھینکا) چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کو کاٹے نہیں۔ اَلْکُمَّۃُ۔ گول ٹوپی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپنے والی چیز کے ہونے ہیں۔

# ک م ہ

اَلْکَمَہُ۔ پیدائشی اندھا پن۔ ایسے اندھے کو اَلْاَکْمَہُ کہینگے۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ پیدائشی اور غیر پیدائشی دونوں کے لئے آتا ہے۔ کَمِہَ النَّھَارُ۔ آفتاب پر غبار چھا گیا اور دن اندھیرا ہوگیا۔ کَمِہَ فُلَانٌ۔ فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی۔ (یعنی بصیرت گم ہوگئی)۔ اَلْکَامِہُ۔ وہ شخص جو اٹھ کر، جدھر اس کے جی میں آئے چل دے*۔

سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا "وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ" (۳/۴۸)۔ میں اندھوں کو نگاہ عطا کروں گا۔ جس کی بصیرت گم ہو چکی ہے میں اُسے واپس لا دونگا۔ جو بغیر راستہ معلوم کئے یونہی چلے جا رہے ہیں میں انہیں راستہ دکھا دوں گا۔ میں ان کے لئے منزل متعین کرونگا۔ رسول کا یہی کام ہے جسے وہ وحی کے ذریعے سر انجام دیتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر راہ گم کردہ لوگوں کو اندھے اور صحیح راستے پر چلنے والوں کو آنکھوں والے کہا ہے۔

---

*تاج و راغب و محیط۔ **العلم الخفاق

# ک ن د

کَنَدَ الشَّیْءَ یَکْنُدُہٗ - اس نے اس چیز کو کاٹ دیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ کَنَدَ النِّعْمَۃَ - اس نے کفران نعمت کیا - اَلْکَنُوْدُ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو تنہا خور ہو - لوگوں کی مدد نہ کرے اور غلاموں کو مار پیٹ کرتا رہے - یا وہ جو مصیبتوں کو گنتا رہے اور بخششوں کو بھلا دے* - یعنی ناقدرا - نیز وہ زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو** - اَلْکِنْدَۃُ پہاڑ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۱۰۰/۶) - یعنی انسان کو اگر عَلٰی حَالِہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شخص کے مانند ہوجاتا ہے جو تنہا خور ہو اور اپنے نشو و نما دینے والے کے عطا کردہ سامان رزق میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاہے - وہ ایسی سنگلاخ زمین بن جاتا ہے جس سے ربوبیت عامہ کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں - یہ ہے "رب کی ناقدر شناسی" -

# ک ن ز

اَلْکَنْزُ - زمین کے نیچے مدفون مال - (جمع کُنُوْزٌ)- یہ اس کے اصلی معنی ہیں - کَنَزَ - یَکْنِزُ - دولت جمع کرنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں اکٹھا ہونے کے ہیں - وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ .... ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ ..... مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵) میں مال و دولت جمع کرنے ہی کے معنی ہیں - قرآن کریم کی رو سے افراد کے لئے ، مفاد خویش کی خاطر ، دولت جمع کرنا جہنم تیار کرنا ہے - قرآنی نظام معیشت میں افراد کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) کی گنجائش ہی نہیں ہوتی - اس میں ہر فرد پوری پوری محنت کرتا ہے - اس کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے نظام معاشرہ کے حوالے کر دیتا ہے - یہ نظام عند الضرورت اس کی اور اس کی اولاد کی تمام بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے - لہذا اس نظام میں دولت جمع کرنے یا جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - واضح رہے کہ جائداد بھی منجمد شکل میں جمع شدہ دولت ہی ہوتی ہے -

سورۃ کہف میں ہے - کَنْزٌ لَّهُمَا (۱۸/۸۲) - ان کی مدفون دولت - دبا ہوا خزانہ - سورۃ قصص میں کُنُوْزٌ اور مَفَاتِحُ ایک ہی معنوں میں

*تاج و محیط - **محیط و راغب -

استعمال ہوئے ہیں (۲۸/۹۴) - یعنی خزانے۔ اَلْکَنِیْزُ - وہ کھجوریں جو ٹوکروں یا برتنوں میں بھر کر سردی کے لئے محفوظ کرلی جائیں* -

# ک ن س

کَنَسَ الظَّبْیُ یَکْنِسُ - ہرن اپنے چھپنے کی جگہ (جھاڑیوں میں) چھپ گیا - اَلْکِنَاسُ - گھنے درخت جہاں جنگلی جانور پناہ لیتے ہیں -

اَلْکُنَاسَةُ - گھورا ، جہاں کوڑا کرکٹ ڈال دیا جاتا ہے - نیز خود اس کوڑے کو بھی کہتے ہیں**- (غالباً اس لحاظ سے کہ ایسے مقامات کو ڈھانپ کر، یا نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کے بالائی حصہ سے کسی چیز کو ہٹا دینا اور (۲) چھپا دینا -

قرآن کریم میں اَلْجَوَارِ الْکُنَّسِ (۸۱/۱۶) آیا ہے - ایسے ستارے جو چلتے چلتے غروب ہو جائیں - چھپ جائیں - (نیز دیکھئے عنوان خ - ن - س)-

اَلْکَنِیْسَةُ - یہودیوں یا نصرانیوں کی عبادت گاہ****- (نیز خوبصورت عورت کو بھی کہتے ہیں)**- صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ اَکْلِیْسِیَا کا معرب ہے جو یونانی الاصل ہے اور جس کے معنی جماعت کے ہوتے ہیں***-

# ک ن ن

اَلْکِنُّ - اَلْکِنَّةُ - اَلْکِنَانُ - ہر چیز کا غلاف اور پردہ - اَلْکِنُّ - وہ جگہ جہاں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے**- اَلْکِنُّ کی جمع اَکْنَانٌ اور اَلْکِنَانُ کی جمع اَکِنَّةٌ آتی ہے - (۱۸/۵۷ ; ۱۶/۸۱ ; ۳۱/۵) - حفاظت کی جگہ (۱۶/۸۱) -

کَنَّهٗ - اَکَنَّهٗ - اُسے چھپا دیا** - (۲/۲۳۵) میں یہ لفظ بمقابلہ یُعْلِنُوْنَ آیا ہے - (اِنَّ رَبَّکَ لَیَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا یُعْلِنُوْنَ) ''یقیناً تمہارا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں'' - یعنی اسکے معنی مخفی رکھنے کے ہیں-

مَکْنُوْنٌ - حفاظت سے رکھا ہوا - محفوظ (۳۷/۴۹) - قرآن کریم کو کِتَابٌ مَکْنُوْنٌ کہا گیا ہے (۵۶/۷۸) - یعنی محفوظ کتاب - اس کے لئے فِیْ لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ بھی کہا گیا ہے (۸۵/۲۲) -

---

*تاج و محیط - **تاج - ***محیط - ****لطائف اللغة -

## کُنَّ (ضمیر)

کُنَّ ۔ ضمیر منصوب متصل ہے ۔ جمع مؤنث حاضر کیلئے آتی ہے ۔ ضَرَبَکُنَّ ۔ اس نے تم سب عورتوں کو مارا ۔ قرآن کریم میں ہے طَلَّقَکُنَّ (۶۶/۵) ۔ وہ تمہیں طلاق دیدے۔

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ سورۂ یوسف میں ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ (۱۲/۲۸) ۔ "یقیناً تم عورتوں کی خفیہ سازش (مکر) بہت بڑی ہوتی ہے"۔

## ک ھ ف

اَلْکَہْفُ ۔ پہاڑ میں بڑا غار ۔ چھوٹے کو غَارٌ کہتے ہیں ۔ یا پہاڑ میں کھود کر جو گھر جیسا بنا لیا جائے ۔ جائے پناہ ۔ تَکَہَّفَ ۔ اِکْتَہَفَ ۔ وہ غار میں داخل ہو گیا یا کہف میں رہا * ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْکَہْفِ (۱۸/۹) ان نوجوانوں کے لئے آیا ہے جنہوں نے آبادی سے باہر غار میں جاکر پناہ لی تھی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر ۔ ق ۔ م وَاَصْحَابُ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ)

## ک ھ ل

اَلْکَہْلُ ۔ ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں ۔ تیس سال کی عمر یا تینتیس سے پچاس سال تک کی عمر ۔ ازہری نے کہا ہے کہ اس عمر والے کو کَہْلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان انتہائے شباب اور اپنی بھرپور صلاحیتوں پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر انحطاط شروع ہوجاتا ہے ۔ نَعْجَۃٌ مُکْتَہِلَۃٌ ۔ بھیڑ جو پوری عمر کی ہو چکی ہو** ۔ نَبْتٌ کَہْلٌ ۔ وہ پودا یا درخت جو اپنے بڑھنے پھولنے کی آخری عمر تک پہنچ چکا ہو*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کَہْلٌ کے بنیادی معنی کسی چیز میں قوت پیدا ہونے اور اس کی ساخت کے محکم و مجتمع ہونے کے ہیں ۔ اَلْمُکَاھَلَۃُ ۔ شادی کر لینا*** ۔ سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَہْلًا (۳/۴۵) ۔ کم عمری میں بھی اور پوری عمر کو پہنچ کر لوگوں سے باتیں کریگا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ابتدائی عمر ہی سے معاشرہ کی خرابیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

کر دی تھیں - ویسے بھی ( تاریخ بتاتی ہے کہ ) انہیں نبوت مقابلۃً کم عمر میں مل گئی تھی ( یعنی قریب تیس سال کی عمر میں ) لیکن قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا - کَہْلاً کہکر قرآن کریم نے اسطرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں (۳۱/۲) برس کی عمر میں صلیب دی گئی اور وہ (یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق) صلیب پر وفات پا گئے یا (عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق ) آسمان پر چلے گئے ، تو یہ صحیح نہیں - وہ ادھیڑ عمر تک لوگوں کے درمیان رہے اور ان سے باتیں کرتے رہے -

## ک ھ ن

اَلْکَاھِنُ - وہ شخص جو کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں دیتا اور معرفت اسرار کا مدعی ہوتا تھا * - لیکن راغب کا کہنا ہے کہ کَاھِن اس شخص کو کہتے تھے جو ماضی کی خفیہ باتوں کے متعلق بتاتا تھا - اور عَرّاف اُسے جو آئندہ کے متعلق خبریں دیتا تھا** - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام میں کَاھِن اس شخص کو کہتے تھے جو پجاریوں کی طرف سے قربانیاں دیتا اور جانوروں کو قربان گاہ میں پیش کرتا تھا - اور عربوں کے ہاں کَاھِن اسے کہتے تھے جو '' کنکریاں پھینک کر '' غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا*** -

چونکہ عرب ، مقام نبوت کا صحیح صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رسول اکرمؐ کو کَاھِن - شَاعِر - اور مَجْنُوْن کہا کرتے تھے - قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور کہا کہ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاھِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۵۲/۲۹) - تو خدا کے فضل و احسان سے کاھن اور مجنوں نہیں - ( نبی کے معنی بھی پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو بلند مقام پر کھڑا ہو - تفصیل متعلقہ عنوان میں ملیگی ) - لیکن اب ہمارے ہاں پیش گوئیاں کرنے والوں کو مقربین بارگاہ خداوندی سمجھا جاتا ہے - کسقدر غیر قرآنی ہیں ہمارے نظریات و معتقدات ؟

## ک و ب

اَلْکُوْبُ - پیالہ جس کا دستہ نہ ہو**** - اسکی جمع اَکْوَابٌ ہے - قرآن کریم میں اَکْوَابٌ (۴۳/۷۱) اسی قسم کے پیالوں کے لئے آیا ہے -

*تاج - **راغب - ***محیط - ****تاج و راغب -

# ک و د

کَادَ (کَ وَ دَ) کا استعمال بطور فعل مقارب کے ہوتا ہے اور اس سے صرف ماضی اور مضارع کے فعل آتے ہیں ؛ دوسرے نہیں آتے ۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''وہ کسی کام کے کرنے کے قریب ہوگیا''۔ (اسی لئے اسے فعل مقارب کہتے ہیں) ۔ کَادَ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ وہ اس کام کو کرگزرتا ۔ وہ اسے کرنے والا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے معنی رکنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ یعنی وہ ایسا کرنے والا ہی تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ وہ اس سے رک گیا* ۔ کَادَ زَیْدٌ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ زید ایسا کام کر بیٹھتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (۱۷/۷۴) ۔ ''اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو ہوسکتا تھا کہ تو ان کی طرف تھوڑا بہت جھک جاتا ۔ لیکن تو نے ایسا نہیں کیا''۔

نیز اس کے معنے ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ وَ اِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا (۱۷/۷۶) ۔ ''انہوں نے اس کا ارادہ کرلیا تھا کہ تمہارے پاؤں اکھاڑ کر تمہیں ملک سے نکال باہر کرتے''۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو اس سلسلہ میں فرمایا اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی (۲۰/۱۵) ۔ اس میں اَکَادُ اُخْفِیْھَا کا ٹکڑا غور طلب ہے ۔ کَادَ کے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں نے اسے مخفی رکھنا چاہا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوسکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظہورِ نتائج کے وقت (اَلسَّاعَۃُ) کو اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ عام طور پر، اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہتا ہے ۔ لیکن جو لوگ علم و بصیرت سے کام لیں وہ اس آنے والی گھڑی کا پہلے سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ نیز خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے ایسے حالات بھی پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ گھڑی بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے ۔ اَکَادُ اُخْفِیْھَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اسے اس اندازہ سے رکھا ہے کہ وہ مخفی بھی ہے اور مشہود بھی ہے ۔

---

*تاج و محیط

## ک و ر

كَوْرُ العِمَامَةِ - صافے کو گھمانا اور لپیٹنا - اس کے لئے تَكْوِيْرُ العِمَامَةِ بھی آتا ہے*۔ کسی چیز کو اوپر چڑھانے اور چھا دینے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے - اِكْتَارَ الرَّجُلُ - آدمی نے عمامہ باندھ لیا۔ اَلْمِكْوَارُ - عمامہ کو کہتے ہیں - اور اَلْكَوْرُ - عمامہ کی ایک لپیٹن کو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھومنے اور اکٹھا ہونے کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (۳۹/۵) - وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا رہتا ہے - زمین کی گردش کے اعتبار سے دن اور رات کے پھیر کو تَكْوِيْرٌ کہنا کتنی بڑی بلاغت اور کیسی عظیم حقیقت ہے - گویا دن اور رات زمانہ کی پگڑی ہے جسے وہ لپیٹتا چلا جا رہا ہے -

كَوَّرَهُ تَكْوِيْرًا کے معنی پچھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں - كَوَّرَ الرَّجُلَ تَكْوِيْرًا - اس نے اس آدمی کو نیچے گرا دیا - كَوَّرْتُهُ فَتَكَوَّرَ - میں نے اسے گرایا پس وہ گر گیا*۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۸۱/۱) - اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جب ''شمس'' کو لپیٹ لیا جائے گا اور یہ بھی کہ جب اسے گرا دیا جائے گا - دونوں معانی کے اعتبار سے مفہوم ایک ہی ہے - یعنی (مسلمانوں کے ہاتھوں) ایران کی سلطنت کا خاتمہ - اُس سلطنت کے جھنڈے کا (جس کا نشان شمس ، سورج تھا) لپیٹ دیا جانا - یا اس کا گر جانا - (دیکھئے عنوان ش - م - س) - اور اگر اَلشَّمْسُ کے حقیقی معنی (سورج) لئے جائیں تو اس میں کسی آنے والے کائناتی تغیر کی طرف اشارہ ہے -

## ک و ک ب

اَلْكَوْكَبُ - ستارہ*- راغب نے لکھا ہے کہ یہ ظاہر اور نمودار ہونے والے ستارہ کے لئے بولا جاتا ہے** (۶/۷۶) - جمع كَوَاكِبُ - اَلْكَوْكَبَةُ زہرہ ستارہ - اَلْكَوْكَبُ - مجازی طور پر بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے - مثلاً آنکھ میں پڑجانے والی پھلی - لمبے لمبے درخت - قوم کا سردار یا شہ سوار- گرمی کی شدت - تلوار- پانی - پہاڑ - مسلح مرد - کنوئیں کا چشمہ - وغیرہ* - اَلْكَوْكَبَةُ - جماعت کو بھی کہتے ہیں*** -

---

*تاج - **راغب - ***محیط -

# ک و ن

كَانَ - یہ فعل ناقص ہے - ذیل کے معنوں میں آتا ہے :—

(۱) ''ہے'' کے معنوں میں - كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۳/۵۱) - اللہ علیم و حکیم ہے -

(۲) ''تھا'' کے معنوں میں - اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (۱۶/۱۲۰) - یقیناً ابراہیم (ایک فرد نہیں بلکہ) پوری کی پوری فرماں بردار امت تھا -

(۳) ''ہوگا'' کے معنوں میں - كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷) - جس کا فتنہ اڑ کر لگنے والا ہوگا - (یہاں اس کے معنی ''ہے'' بھی ہوسکتے ہیں) -

(۴) ''ہو گیا'' کے معنوں میں - اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (۲/۳۴) - اس نے انکار کیا - سرکشی اختیار کی - اور اس طرح نہ ماننے والوں میں سے ہوگیا -

(۵) ''سزاوار'' - مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ . . . . . . (۳/۷۸) - کسی انسان کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت دے اور وہ . . . .

(۶) تاکید کے لئے بھی آتا ہے - اور کبھی زائد بھی ہوتا ہے - وَ مَا عِلْمِىْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۶/۱۱۲) - مجھے کیا علم ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں - یہاں كَانُوْا زائد ہے - صرف بِمَا يَعْمَلُوْنَ کے بھی یہی معنی ہیں - لیکن اگر اس کے معنی ہوں ''جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے تھے'' تو پھر كَانُوْا زائد نہیں ہوگا -

كُنَّ - جمع مؤنث غائب - اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ (۲/۲۲۸) اگر وہ خدا پر ایمان رکھتی ہیں -

اَكُ - واحد متکلم - وَ لَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰) - میں قانون شکن نہیں ہوں - اس میں نون گر گیا ہے دراصل اَكُنْ تھا -

تَكُ - مذکر حاضر اور مؤنث غائب دونوں کے لئے آتا ہے - فَلَا تَكُ فِىْ مِرْيَةٍ (۱۱/۱۰۹) - تو شک میں نہ رہ (دراصل تَكُنْ تھا)

يَكُ - واحد مذکر غائب - لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا (۸/۵۳) - وہ نعمت کو بدلنے والا نہیں ہوتا - (دراصل يَكُنْ تھا)

نَکُنْ - جمع متکلم - لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۴۳/۷۴) - هم مصلین نہیں تھے -

یہ تو هؤا کَانَ (فعل ناقص) - لیکن یہ فعل تام بھی ہوتا هے - اس کی بحث آگے آتی هے -

کَانَ - کسی چیز کا پیدا هو جانا - واقع هو جانا - کَوْنٌ اُس چیز کو کہتے هیں جو یکبارگی اور دفعتاً واقع هو جائے - لیکن جب کوئی چیز بتدریج پیدا هو تو اسے حَرَکَت کہتے هیں - بعض لوگوں نے کہا هے کہ کَوْنٌ کے معنی هیں کسی چیز کا مادی صورت اختیار کر لینا - راغب نے کہا هے کہ کَوْنٌ کا لفظ اسوقت استعمال کرتے هیں جب کوئی جوهر اپنے سے بلند تر جوهر میں تبدیل هو جائے - لیکن اگر اپنے سے پست جوهر میں تبدیل هو جائے تو اسے فَسَادٌ کہتے هیں - كَوَّنَ اللّٰهُ الْاَشْیَاءَ کے معنی هیں خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا - اَلْکَائِنَةُ کے معنی هیں حادثه - یعنی دفعتاً نمودار هو جانا * - ابن فارس نے کہا هے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی واقعہ کی خبر دینے کے هیں - خواہ وہ ماضی میں هؤا هو یا حال میں -

قرآن کریم میں هے بَدِیْعُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ (۱۱۷/۲) - یعنی خدا وہ هے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا هے - (اِبْدَاعٌ - کسی چیز کو ایجاد کرنا - پہلی مرتبہ وجود میں لانا) - یہ کسطرح هوا ؟ اسے اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کر دیا - وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۱۱۷/۲) - یعنی جب وہ ایک اَمْرٌ کا فیصلہ کرتا هے تو اسے (اس اَمْرٌ سے) کہتا هے (یَقُوْلُ لَهٗ) کُنْ - (هو جا) - تو وہ هو جاتا هے (فَیَکُوْنُ) - یعنی "امر" کی حالت وہ هے جس میں اشیاء نے هنوز صورت اختیار نہیں کی هوتی - جب وہ اَمْرٌ (خدا کے پروگرام کے مطابق) متشکل هو جاتا هے (صورت اختیار کر لیتا هے) تو وہ شَیْءٌ بن جاتا هے - هم کسی شے کا تصور بغیر اسکی صورت (Form) کے کر هی نہیں سکتے - خدا کے "عالم امر" کی کیا کیفیت هے ، هم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے - اسلئے کہ وهاں صورت ((Form) نہیں هوتی - خدا اس (Formless) اَمْرٌ کو صورت (Form) عطا کرتا هے - (اسی لئے اسے اَلْمُصَوِّرُ کہا گیا هے (۲۴/۵۹) - اور وہ امر شے بنکر همارے حیطهٔ ادراک میں آجاتا هے - یہاں سے کَوْنٌ کے معنی هیں اشیاء کا پہلی مرتبہ صورت اختیار کرنا - یہ سب خدا کے اس قانون کے مطابق هوتا هے جو اس نے اشیاء کے پیدا کرنے کے لئے مقرر کر رکھا هے -

---

*تاج و محیط -

اَلْمَکَانُ - جگہ - مقام - بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ اسی مادہ سے مشتق ہے - اور بعض م - ک - ن سے بتاتے ہیں - اس سے تَمَکَّنَ وغیرہ افعال بنا لئے گئے ہیں* - (ہم نے م - ک - ن کا عنوان الگ لکھا ہے - اس کے تحت ان الفاظ کو دیکھئے)

اَلْاِسْتِکَانَۃُ کے معنی ہیں خشوع و خضوع کرنا* - یا عاجزی کا اظہار کرنا (۳/۱۴۵) - (بعض کے نزدیک یہ لفظ سَکَنَ سے ہے - اس لئے ہم نے اسے اس عنوان کے تحت بھی لکھا ہے -) اَلْمُکَاوَنَۃُ - جنگ و جدال کو کہتے ہیں* -

# ک و ی

کَوَاہُ یَکْوِیْہِ کَیًّا - اسے گرم لوہے وغیرہ سے داغ دیا - اَلْمِکْوَاۃُ - داغ دینے کا آلہ** - ابن فارس نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ کَوَاہُ بِعَیْنِہٖ کے معنی ہیں اس نے اسکی طرف گھور کر دیکھا -

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں (اور اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے) ان کے اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا - فَتُکْوٰی بِھَا .... (۹/۳۵) - اور اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائیگا - (جسطرح اُس زمانے میں بڑے بڑے مجرمین کو داغا جاتا تھا) تا کہ ان کی دور ہی سے پہچان ہو جائے اور لوگ انکی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں - قرآن کریم کی رو سے سرمایہ داری سنگین جرم ہے اور ایسا کرنے والے معاشرہ کے بدترین مجرم -

# کَیْ - (حرف)

کَیْ - سبب ظاہر کرنے کے لئے (تا کہ - کے معنوں میں) - کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) - تا کہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے -

لِکَیْلَا - لِ + کَیْ + لَا - تا کہ ایسا نہ ہو - (۵۷/۲۳)

# ک ی د

کَیْدٌ - حیلہ اور تدبیر کو کہتے ہیں* - محیط نے تعریفات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنے خفیہ طریقہ سے کسی دوسرے کو نقصان

*تاج - ** تاج و محیط -

پہنچانے کا ارادہ کرنا ھیں **۔ نیز یہ لفظ کوشش اور جد و جہد کے معنوں میں بھی آتا ھے۔ بعض علمائے لغت نے کَیْدٌ اور مَکْرٌ کو ھم معنی قرار دیا ھے۔ بعض کا خیال ھے کہ کَیْدٌ ضرر رسانی، اور مَکْرٌ خفیہ تدبیر اور ضرر رسانی کو کہتے ھیں۔ بعض کا خیال ھے کہ کَیْدٌ کے معنے خفیہ طور پر گرفت کرنا ھیں لیکن اس میں یہ شرط نہیں کہ ایسی تدبیر کرنے والا بظاھر اس کے خلاف کرے جو وہ بہ باطن چاھتا ھے۔ مگر یہ شرط مَکْرٌ میں ضروری ھے *۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں)۔ راغب نے کہا ھے کہ کَیْدٌ ایک قسم کی چارہ سازی اور حیلہ جوئی کو کہتے ھیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ھوتا ھے اور برے معنوں میں بھی۔ اور بالعموم برے معنوں میں آتا ھے***۔

کَادَ کے معنی ارادہ کرنے کے بھی آتے ھیں *۔ جنگ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ھوتا ھے *۔

قرآن کریم میں دشمنوں کی خفیہ یا عام تدبیر کو کَیْدٌ کہا گیا ھے۔ لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (۳/۱۱۹)۔ ان کی سازشیں یا تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکینگی۔ ساحرین فرعون کی شعبدہ بازی کو بھی کَیْدٌ کہا گیا ھے۔ إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ (۲۰/۶۹) جو کچھ انہوں نے بنایا ھے وہ سحر (باطل) کی شعبدہ بازی ھے، اور بس۔ سورہ یوسف میں عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا ھے کہ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ۔ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ (۱۲/۲۸)۔ یہ محض تمہاری سازش ھے۔ اور تم عورتوں کی سازشیں بڑی ھی گہری ھوتی ھیں۔

دوسری طرف خدا نے خود اپنی تدبیر کو بھی کَیْدٌ کہا ھے۔ إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَأَكِيدُ كَيْدًا (۸۶/۱۵-۱۶)۔ یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ھوئے ھیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رھا ھوں۔ سورہ یوسف میں ھے كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ (۱۲/۷۶)۔ اس طرح ھم نے ایک عمدہ تدبیر پیدا کر دی جس میں یوسف کا فائدہ تھا۔ یا وہ اس کے حسب منشا تھی۔

سورہ انبیاء میں ھے کہ حضرت ابراھیمؑ نے اپنی قوم سے کہا وَتَاللَّهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُمْ (۲۱/۵۷) بخدا! میں تمہارے بتوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کرکے رھونگا۔

سورہ طور میں مَكِيدُونَ آیا ھے۔ (۵۲/۴۲)۔ یعنی وہ جو سازش (یا تدبیر) کا شکار ھو جائیں۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

# کَیْفَ (حرف)

کَیْفَ ۔ کیسے ۔ کیونکر۔ کسطرح کے معنوں میں ۔ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ (۲/۲۸) ۔ تم اللہ کا کسطرح انکار کر سکتے ہو ۔ دوسری جگہ ہے۔ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ (۱/۱۰۵)۔ تیرے رب نے کیونکر کیا؟ (ان سے) کیسا معاملہ کیا؟

# ک ی ل

کَالَ الطَّعَامَ۔ یَکِیْلُهُ۔ کَیْلاً ۔ غلے کو ناپا* ۔ اِذَا کَالُوْهُمْ (۳/۸۳) ۔ جب انہیں ماپ کر دیتے ہیں ۔ اِکْتَالَ (عَلٰی) ۔ کسی سے ماپ کر لینا (۲/۸۳) ۔ تاج نے کَالَ اور اِکْتَالَ دونوں ہم معنی بتا کر فرق یہ کیا ہے کہ کَالَ کے معنی ہیں ، خود ناپ کر دوسرے کو دینا اور اِکْتَالَ کے معنی ہیں اپنے لئے خود ناپ کرلینا* ۔ راغب نے کِلْتُ لَهُ الطَّعَامَ کے معنی بتائے ہیں میں نے اس کے لئے غلہ ناپا ، اور کِلْتُهُ الطَّعَامَ کے معنی، میں نے اسے غلہ (ناپ کر) دیا ، اور اِکْتَلْتُ عَلَیْهِ ۔ میں نے اس سے ناپ کر لیا** ۔ ابن فارس نے اس کی تائید کی ہے۔ کَیْلٌ ۔ مِکْیَالٌ ۔ پیمانہ جس سے غلہ وغیرہ کو ماپا جائے ۔ (۶/۱۵۳) خود (اس طرح ماپے ہوئے) غلہ کو بھی کہتے ہیں (۱۲/۵۹) ۔ کَیْلَ بَعِیْرٍ (۱۲/۶۵)۔ ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ ۔

قرآن کریم میں بڑی تاکید سے حکم ہے کہ لَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ (۱۱/۸۴) ۔ اس میں اگرچہ ترازو اور پیمانے کا ذکر ہے (کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو) لیکن اصولاً اس میں معاشی عدل کا بنیادی قانون آگیا ہے ۔ معاشی عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ دیا جائے، اور نہ ہی اپنے حق سے زیادہ لیا جائے۔ اس اصول کے ماتحت، سرمایہ‌داری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ (مثلاً) اگر ایک زمیندار یا کارخانہ دار کام کرنے والے کو وہ سب کچھ دے دے جو اس نے پیدا کیا ہے تو اس سے اسے خود کچھ نہیں ملتا ۔ یہی قرآن کریم کا منشأ ہے ۔ یعنی معاوضہ محنت کا ملیگا ۔ روپے کا نہیں ۔ کام کرنے والے کی محنت کے ماحصل سے کچھ رکھ لینے والے مُخْسِرِیْنَ ہیں (۲۶/۱۸۱) ۔

---

جلد سوم ختم شدہ

---

*تاج ۔ **راغب ۔

# اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ "اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی" ۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے ۔ بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ ۔

انسان نے کیا سوچا ؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں ، دنیا کے مختلف مفکرین ، مدبرین ، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے ، اسے نہایت دلنشیں پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسکی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے ۔

سلیم کے نام خطوط ۔ ہمارے نوجوان ، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں ، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں ، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب ۔ انداز بیان دلچسپ ، سلیس اور نہایت شگفتہ ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔

ابلیس و آدم ۔ اس میں ، انسانی تخلیق اور نظریۂ ارتقاء ۔ قصۂ آدم ۔ ملائکہ ۔ ابلیس ۔ شیطان ۔ جنات ۔ وحی ۔ نبوت ۔ رسالت ۔ عقل اور وحی کے دوائر عمل جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔

جوئے نور ۔ قرآنی تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اور اقوام گذشتہ کے وقائع و حوادث کا جاننا ضروری ہے ۔ یہ کتاب اسی سلسلۂ زریں کی پہلی کڑی ہے جس میں حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ سے پہلے تک کے انبیاء کرامؑ کے حالات آگئے ہیں ۔

( مسلسل )

**برقِ طور** ۔ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں بنی اسرائیل کی پوری داستان اور ان کے انبیائے کرامؑ کے احوال و کوائف شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں ۔ یہ در حقیقت قوموں کے عروج و زوال کے متعلق قرآنی اصول و قوانین کا بصیرت افروز مرقع ہے ۔

**شعلۂ مستور** ۔ اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہے جس میں آسمانی انقلاب کے عظیم داعی ، حضرت عیسیٰؑ کی حیات طیبہ کے وہ گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو اس سے پہلے عام طور پر نگاہوں سے اوجھل تھے ۔ حضرت مریمؑ کا "جرم" ۔ جناب مسیحؑ کی پیدائش ۔ معجزات ۔ کشمکش ۔ واقعہ صلیب اور رفع الی السماء ۔ نزولِ مسیحؑ سے متعلق تمام مباحث آگئے ہیں ۔

**معراجِ انسانیت** ۔ یہ عظیم کتاب نبی اکرمؐ کی اس سیرتِ مقدسہ پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے ۔ اس میں قرآنی فکر و نظام کے تمام گوشے نہایت حسین و جمیل انداز میں سامنے آگئے ہیں ۔ اعلیٰ درجہ کے ولایتی کاغذ پر بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر جگمگاتی ہوئی کتاب ہے ۔

ان کے علاوہ

## پرویز صاحب کی دیگر تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام

کیلئے ایک کارڈ لکھ کر تفاصیل معلوم کریں ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ل

## لَ - (حرف)

لَ - لِ - حسب ذیل معانی پیدا کرنے کے لئے آتا ھے :-

(۱) اِستحقاق - اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱/۱) - حمد کا حق صرف اللہ ھی کو حاصل ھے -

(۲) کسی کے لئے کسی چیز کا مخصوص ھونا - وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ (۱۶/۵۸) - خصوصیت سے اپنے لئے وہ چیز چاھتے ھیں کہ جو ان کے نزدیک پسندیدہ ھے -

(۳) اظہار ملکیت کے لئے - لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲/۴) - کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ھے سب اس کی ملکیت ھے -

(۴) فائدہ حاصل کرنے کے لئے - وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴/۱۰) - ھم نے اس کے لئے لوھے کو نرم کر دیا - یعنی لوھے کو نرم کر دیا تا کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے (لامِ ملکیت اور لامِ انتفاع کے فرق کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ھے) -

(۵) سبب ظاھر کرنا (''تا کہ'' کے معنوں میں)- وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (۱۶/۴۴) - اور ھم نے تیری طرف یہ قرآن کریم نازل کیا ھے تا کہ تو اسے لوگوں کے فائدے کے لئے ظاھر کر دے -

(۶) نفی کی تاکید کے لئے - مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (۳/۱۷۸) - اللہ تمہیں غیب پر ھرگز مطلع نہیں کرتا -

(۷) اِلٰی (کیطرف) کے لئے - بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا (۹۹/۵) - کیونکہ تیرے رب نے اسکی طرف وحی کی ہے -

تک کے معنوں میں - کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۱۳/۲) - ہر ایک وقت مقررہ تک چل رہا ہے - دوسری جگہ اِلٰی اَجَلٍ (۳۱/۲۹) آیا ہے جس کے معنی '' وقت مقررہ تک '' ہیں -

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں - وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷/۱۰۳) - اور اس نے اسے پیشانی کے ایک کنارے پر (کے بل) لٹایا -

مجازی طور پر عَلٰی اسوقت آتا ہے جب کوئی بات کسی کے خلاف جائے - اور - ل - اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدے کے لئے ہو- جیسے لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) - '' جو کچھ کوئی اچھا کام کرے وہ اس کے فائدے کے لئے ہے اور جو کچھ کوئی برا کام کرے وہ اسکے خلاف جائیگا - اس کا نقصان اسے ہوگا '' - لیکن بعض اوقات لَ بھی عَلٰی کے معنوں میں آجاتا ہے - وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷) - اگر تم برائی کرو گے تو اسکا نقصان تمہیں ہی ہوگا - یا وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۴۰/۵۲) - ان کے لئے محرومی ہے - ان کے لئے بہت برا گھر ہے -

(۹) فِیْ (میں) کے معنوں میں - وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۲۱/۴۷) - اور ہم قیامت کے دن (قیامت میں) انصاف کی میزانیں کھڑی کرینگے -

(۱۰) عِنْدَ (کے پاس - کے قریب) اور بَعْدُ کے مفہوم کے لئے - جیسا کہ بعض کے نزدیک - اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (۱۷/۷۸) میں لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ سے مراد ہے دلوک شمس کے قریب - یا دلوک شمس کے بعد - لیکن - ل - بعض اوقات مِنْ (سے) کے معنوں میں بھی آتا ہے - اس لئے اسکے معنی دلوک شمس سے لیکر غسق لیل تک بھی ہو سکتے ہیں -

(۱۱) مفعول کو واضح کرنے کے لئے - جیسے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ (۲/۱۵۴) نہ کہو اس شخص کو جو قتل کر دیا جائے -

(۱۲) اِنَّ یا قسم کے بعد تاکید کے لئے - لَعَمْرُکَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَکْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (۱۵/۷۲) - تیری عمر* کی قسم - وہ اپنی بد مستی

*دیکھئے عنوان ع - م - ر -

میں اندھے ہو رہے تھے - نیز فَوَرَبِّکَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ (۱۹/۶۸) تیرے رب کی قسم ہم بالضرور انہیں اکٹھا کر لائینگے۔

(۱۳) کبھی زائد بھی ہوتا ہے - قرآن کریم میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں - جیسے - هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۳/۳۶) - یہاں مَا تُوْعَدُوْنَ کا بھی وہی مفہوم ہے -

(۱۴) کبھی یہ ابتدائے کلام کے لئے بھی آتا ہے (کہ ، کے معنوں میں) - إِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَأَخُوْهُ .... (۱۲/۸) - جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اسکا بھائی....

(۱۵) کبھی یقیناً کے معنوں میں (تاکید کے لئے) آتا ہے - لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (۹/۱۰۸) - یقیناً وہ مسجد کہ جسکی بنیاد ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہو -

# لَا (حرف)

لَا - نہی کے لئے آتا ہے - لَا تَضْرِبْ - مت مار - اس کے علاوہ ذیل کے معانی کے لئے بھی آتا ہے -

(۱) نفی جنس کے لئے - یعنی جس چیز کی یہ نفی کرتا ہے اس کی پوری کی پوری جنس کی نفی کرتا ہے - لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) - اس میں کوئی شک و شبہ یا اضطراب کی بات نہیں -

(۲) لَيْسَ (نہیں) کے معنوں میں - لَا أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ (۱۰/۶۱) - نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی - وہ سب ایک واضح کتاب کے اندر ہیں -

(۳) لَا جَرَمَ - محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے - اس کے معنی ہوتے ہیں - "حق یہ ہے کہ" - جیسے (۱۶/۲۳) میں -

(۴) کبھی یہ جملے کے شروع میں اسطرح آتا ہے جیسے کسی کی بات کا جواب دیا جا رہا ہو - مثلاً لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰/۱) - نہیں ! میں اس شہر کو شہادت میں پیش کرتا ہوں -

(۵) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً مَا مَنَعَكَ أَلَّا (أَنْ + لَا) تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ (۷/۱۲) - جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو پھر وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کر دیا - اگر یہاں "لا" نہ ہو جب بھی وہی معنی ہونگے - جیسے (۳۸/۷۵) میں ہے - مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ -

# اللّاتُ

اَللّاتُ ۔ عہد جاہلیت میں طائف میں قبیلہ ثقیف کا بت تھا ۔ یہ مؤنث ہے (۵۳/۱۹) ۔ اسلئے اسے دیوی کہنا چاہئے ۔

# لات (حرف)

لَاتَ ۔ نہیں کے معنوں میں ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸/۳) ۔ خلاصی کا وقت نہیں رہا تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ لات میں لا نفی (نہیں) کے لئے ہے اور تاء (تَ) زائد ہے ۔ مگر یہ زائد تاء حِیْنَ کے ساتھ ہی آتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ (لَاتَ) فعل ماضی ہے جس کے معنی نَقَصَ کے ہیں ۔ (جیسا کہ ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان میں بیان ہوگا) ۔ بعد میں یہ صرف نفی کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَیْسَ ہے ۔ سین کو تاء اور یاء کو الف سے بدل کر لَاتَ بنا لیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک مستقل لفظ ہے اور نفی کے لئے آتا ہے* ۔

# ل أ ل أ

لَأْلَأَتِ الْمَرْاَۃُ بِعَیْنَیْہَا ۔ عورت نے اپنی آنکھوں کو جھکایا ۔ لَأْلَأَتِ النَّارُ ۔ آگ بھڑکی اور روشن ہوگئی** ۔ اَللُّؤْلُؤُ ۔ (جمع لَآلِیُٔ) ۔ موتی ۔ کیونکہ وہ چمکدار ہوتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمکدار ہونے کے ہیں ۔

سورۃ حج میں جنتی معاشرہ کے اسبابِ زینت میں لُؤْلُؤٌ (۲۲/۲۳) بھی آیا ہے ۔ سونے کے کڑے ۔ موتی ۔ ریشم کا لباس ۔ یعنی سرداریوں اور سرفرازیوں کے تمام نشان و سامان ۔ یہ ہیں جنتی معاشرہ کے سامانِ زینت و اسبابِ آرائش و زیبائش ۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں قوت و سطوت اور آسائش و آرائش کے تمام سامان بافراط موجود ہوں اور ان کی تقسیم اور استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو ۔

# لئلاّ (حرف)

لِئَلَّا ۔ (لِ + أَنْ + لَا) ایسا نہ ہو کہ ۔ یا ۔ تاکہ نہ ۔ لِئَلَّا یَعْلَمَ اَھْلُ الْکِتٰبِ (۵۷/۲۹) ۔ تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مثال میں لا زائد ہے ۔

---

* تاج ۔ ** تاج و راغب و محیط ۔

# ل ب ب

اَلَبَّ عَلَی الْاَمْرِ - کسی بات پر پختگی سے جما رہا اور اسے نہ چھوڑا - رَجُلٌ لَبٌّ - وہ شخص جو اپنے کام کاج میں لگا رہے اور اسے چھوڑے نہیں - اَللَّبُّ - کسی امر پر قائم رہنے والا ، اسی لئے اسکے معنی قیام کرنے کے بھی ہوتے ہیں - اَلَبَّ بِالْمَکَانِ - اس نے فلاں مقام پر قیام کیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) جمع رہنے اور ساتھ لگا رہنے اور (۲) خالص اور عمدہ ہونے کے ہیں -

لَبَّیْکَ - میں آپ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں - میں آپ کی اطاعت پر قائم ہوں - بعض نے کہا ہے کہ یہ دَارِیْ تَلُبُّ دَارَہٗ سے ماخوذ ہے - یعنی میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے - لہذا لَبَّیْکَ کے معنی ہیں میرا رخ آپ کی طرف ہے * -

لُبٌّ - ہر چیز کے خالص حصے کو کہتے ہیں - نیز مغز ، گری - لَبَّ اللَّوْزَ - بادام کو توڑ کر اس کا مغز نکال لیا * - اللَّبَبُ - سینہ کا وہ حصہ جس پر ہار پہنتے ہیں * -

اَللُّبُّ عقل کو کہتے ہیں - اسکی جمع اَلْبَابٌ ہے - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی کے لِبُوْ یا عبرانی کے لِبْ سے ماخوذ ہے جن کے معنی دل کے آتے ہیں - عربی میں دل کو اَللُّبُّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (بادام کے مغز کی طرح) چربی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے ** - راغب نے کہا ہے کہ لُبٌّ تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو آمیزش سے پاک ہو *** - (یعنی جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو - جو جذبات کے تابع نہ چلے) -

قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ ($\frac{3}{189}$) کو خاص امتیاز کا حامل قرار دیا ہے اور ان کی بڑی تعریف کی ہے - یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں جو عقل کو جذبات کی لونڈی بنانے کے بجائے اُس سے وحی کی روشنی میں کام لیتے ہیں - اسطرح یہ عقل ، عقل خود بیں کے بجائے عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے - عقلِ خودبیں انسان کو صرف اس کے انفرادی مفاد کے حصول کی راہیں بتاتی ہے اور عقلِ جہاں بیں اُسے نوع انسانی کی ربوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے - اسی لئے قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ کے بعد کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ . . . . ($\frac{3}{189-190}$) یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت جو اٹھتے،

*تاج - **محیط - ***راغب -

بیٹھتے ، لیٹے ، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔ وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا ، یہ ہے مومن کا شعارِ زندگی ۔ ان میں سے اگر ایک چیز کی بھی کمی ہو تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا ۔

# ل ب ث

لَبِثَ یَلْبَثُ لَبْثًا وَ لُبْثًا و لَبَثًا ۔ رہنا ۔ ٹھہرنا ۔ رکنا ۔ نیز دیر کرنے اور انتظار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اَلتَّلَبُّثُ ۔ توقف ۔ اقامت ۔ توقف کرنے کے معنوں میں (۳۳/۱۴) میں آیا ہے * ۔ لَبِثَ بِالْمَکَانِ ۔ کسی مقام پر جم کر ٹھہرا ۔ وہاں مستقل رہا** ۔ لَابِثٌ ۔ ٹھہرنے والا ۔ قیام کرنے والا ۔ اس کی جمع لَابِثُوْنَ اور لَابِثِیْنَ ہے (۷۸/۲۳) ۔

مخالفین عرب، نبی اکرمؐ سے آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل مانگتے ۔ یعنی وہ کہتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں ۔ اس کے جواب میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) ۔ میں نے (دعوائے نبوت سے) قبل، تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے ۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے انسان کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ تم اگر عقل و خرد سے کام لو تو میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت بن کر تمہارے سامنے آ جائے ۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا ۔

غور کیجئے کہ کسقدر زبردست ہے یہ شہادت جسے نبی اکرمؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے ۔ ایسی شہادت کہ اس کے خلاف کوئی ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا ۔ سچے کی نشانی یہ ہے کہ وہ ( دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ) مخالفین کے بھرے مجمع میں پوری جرأت سے کہہ سکے کہ میری زندگی میری صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۔

# ل ب د

لَبَدَ بِالْمَکَانِ ۔ کسی جگہ قیام کرنا اور اس جگہ سے چمٹ جانا ۔ لِبْدٌ ۔ نمدہ کو کہتے ہیں جس میں اُون کو گتھ گتھ کر جمایا جاتا ہے ۔ اسی سے مَالٌ لُبَدٌ کے معنی ہیں کثیر دولت ۔ بہت زیادہ جمع شدہ مال * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا اوپر تلے جمع

* تاج ۔ ** راغب ۔

ہونا ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۹۰/۶)۔ میں نے بہت سا جمع کردہ مال ضائع کر دیا۔ اَلنَّاسُ لُبَدٌ کے معنی ہیں لوگ یکجا جمع ہیں۔ اوپر تلے اکٹھے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹)۔ وہ اس پر ہجوم کرکے ٹوٹ پڑے۔ لَبِدَ الْقَوْمُ بِالرَّجُلِ۔ لوگوں نے اس آدمی کو گھیر لیا اور اس کے پاس سے نہ ہٹے**۔

## ل ب س

لَبَسَ۔ يَلْبِسُ۔ لَبْسًا کے معنی ہیں خلط ملط مت کر دینا۔ مشتبہ کر دینا *۔ اس کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی سے خلط ملط کر دینے اور مشتبہ بنا دینے کا مفہوم آگیا **۔ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲) حق اور باطل کو باہم خلط ملط مت کرو۔ مشتبہ کرنے کے معنوں میں یہ لفظ (۶/۹) میں آیا ہے۔ وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ۔ ''انہوں نے جس اشتباہ میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے، ہمارا (قانون مکافات) انہیں اس اشتباہ میں مبتلا رکھیگا''۔ لَبِسَ۔ يَلْبَسُ۔ لُبْسًا کے معنی ہیں پہننا۔ اَللَّبُوْسُ۔ اَللِّبَاسُ۔ جو کچھ پہنا جائے *۔ اَللِّبَاسُ۔ شوہر اور بیوی کو کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کا ساتھ بدن اور لباس کا ساتھ ہے (کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی۔ ان میں گہری راز داری ہوتی ہے)۔ اَللَّبُوْسُ۔ زرہ اور ہتیار کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں زرہ بنانے کے لئے صَنْعَةَ لَبُوْسٍ آیا ہے (۲۱/۸۰)۔ لَبِسَ فُلَانٌ اِمْرَاَةً۔ فلاں شخص ایک عرصہ تک عورت سے متمتع ہوتا رہا **۔ (ان کا باہمی اختلاط رہا)۔

اَمْرٌ مُّلْبِسٌ اور مُلْتَبِسٌ۔ مشتبہ امر *۔ اَلتَّلْبِيْسُ۔ حقیقت کی پردہ پوشی کرنا اور اسے خلاف واقعہ بنا کر دکھانا **۔

بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۵۰/۱۵)۔ یہ لوگ حیات نو (نئی پیدائش) کے بارے میں شبہے میں ہیں۔ انہیں اس باب میں کچھ (Confusion) سی ہے۔

قرآن کریم ہر بات کو نکھار کر سامنے لاتا اور ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے تاکہ حقیقت کے سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ کہیں ابہام نہ ہو۔ التباس نہ ہو۔ ہر بات واضح، کھلی کھلی اور

* تاج۔ ** محیط۔

صاف صاف ہو۔ اسکے نزدیک کیتمان حقیقت (حقیقت کو چھپانا) ہی جرم نہیں بلکہ حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرنا بھی جرم ہے (۲/۴۲)۔ لہذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت (Compromise) کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ حق، حق ہے اور باطل، باطل۔ دونوں آپس میں مل نہیں سکتے، چہ جائیکہ حق کو چھپایا اور باطل کو حق بنا کر دکھایا جائے۔ حق کو باطل کے ساتھ ملانے (تلبیس حق و باطل) کے معنی یہ ہیں کہ وحی (قرآن کریم) کے ساتھ غیر از وحی امور کو بھی دین بنا دیا جائے۔ ہم نے یہی کچھ کر رکھا ہے، اور اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔

# ل ب ن

اَللَّبَنُ۔ دودھ*۔ (اَللَّبِنُ۔ اینٹ جس سے عمارت بنائی جاتی ہے)۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشّٰرِبِيْنَ (۱۶/۶۶)۔ خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔

# ل ج أ

لَجَاَ وَ الْتَجَاَ اِلَيْهِ۔ اس نے اس کی طرف پناہ لی۔ اَلْجَاَهُ اِلٰی كَذَا۔ اسے کسی چیز کی طرف مجبور کیا۔ اَلْجَاَ فُلَانًا۔ اس نے فلاں کو بچا لیا۔ اپنی حفاظت میں لے لیا**۔ تَلَجَّاَ مِنْهُمْ۔ وہ ان سے الگ اور ان کے زمرہ سے علیحدہ ہو کر دوسرے لوگوں کی طرف مائل ہو گیا*۔ اَللَّجَاُ وَ الْمَلْجَاُ۔ جائے پناہ۔ بچنے اور محفوظ رہنے کی جگہ* (۹/۵۷)۔

# ل ج ج

اَللُّجُّ وَ اللُّجَّةُ۔ گہرا پانی۔ لُجُّ الْبَحْرِ۔ دریا کے درمیان وہ گہرے پانی کا مقام جہاں سے اس کا کنارہ نظر نہ آئے۔ بَحْرٌ لُجَاجٌ۔ وسیع گہرے پانی والا دریا۔ اَللَّجَاجُ۔ جھگڑے میں بڑھتے چلے جانا، خواہ اپنی غلطی بھی واضح کیوں نہ ہو جائے۔ جھگڑے یا مخالفت کرنے میں برابر اصرار کئے جانا**۔ اس سے فعل لَجَّ فِی الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا اپنے اجزاء پر بار بار پلٹنا اور پلٹانا ہیں۔ اَللَّجَاجُ۔ اصرار کو کہتے ہیں۔ لُجُّ الْبَحْرِ۔ سمندر کے بڑے حصے کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں سمندر کے اجزاء اوپر تلے پلٹتے رہتے ہیں۔

*تاج۔ **تاج و محیط۔

راغب نے لَجَّةٌ کے معنے بار بار پلٹنے اور آتے رہنے کے کئے ہیں اور اس سے لُجَّةُ الْبَحْرِ کے معنے سمندر کی موجوں کے بار بار آنے اور پلٹنے کے ہیں ۔ نیز اس نے لِجَاجٌ کے معنے منع کئے ہوئے کام سے باز نہ آنے اور اسے کرتے چلے جانے کے کئے ہیں** ۔

سورۃ ملک میں ہے ۔ بَلْ لَجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ (۲۱/۶۷) ۔ وہ اپنی نفرت اور سرکشی میں موج در موج آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ سورۃ نمل میں ہے ۔ حَسِبَتْهُ لُجَّةً (۴۴/۲۷) ۔ اس نے اسے گہرا پانی سمجھا ۔ سورۃ نور میں ہے بَحْرٍ لُّجِّیٍّ (۴۰/۲۴) ۔ گہرا اور وسیع سمندر ۔

## ل ح د

اَللَّحْدُ ۔ وہ کھڈا یا شگاف جو قبر کے ایک پہلو میں عرضاً کھود کر بنایا جاتا ہے اور اس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے ۔ (برخلاف ضَرِیْحٌ کے جو درمیان میں کھودا جاتا ہے) ۔ لہذا ، بقول ابن فارس ، اس مادہ کے بنیادی معنی درمیان سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا ہیں ۔ لَحَدَ اِلَیْهِ ۔ وہ اس کی طرف مائل ہوگیا ۔ جھک گیا* ۔ یہی معنی اِلْتَحَدَ اِلَیْهِ کے ہیں** ۔ اَلْحَدَ ۔ وہ دینِ حق سے مڑا اور ہٹا ۔ اَلْاِلْحَادُ کے اصل معنے مڑنا ، ہٹنا اور جھک جانا ہیں ۔ درمیانہ روی کو چھوڑ کر ظلم کی طرف مائل ہونا* ۔ سورۃ اعراف میں ہے اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآئِهٖ (۱۸۰/۷) ۔ جو لوگ صفات خداوندی کے بارے میں اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک جاتے ہیں (جیسے عیسائی ، کہ انہوں نے خدا کو صرف رحم کا پیکر تصور کرلیا اور اس کے قانونِ مکافات سے الگ ہٹ گئے) اسی کا نام غلوفی الدین ہے (۱۷۱/۴) ۔ دوسری جگہ ہے ۔ اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا (۴۰/۴۱) ۔ جو لوگ ضابطۂ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں ۔ اعتدال کی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جاتے ہیں ۔ انحراف کرتے ہیں ۔ سورۃ حج میں ہے وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ (۲۵/۲۲) ۔ جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ کجروی اور بے باکی کا ارادہ کرے ۔ جو سیدھے راستے سے ہٹ کر اسے (کعبہ کو) غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگ جائے ۔ سورۃ نحل میں ہے ۔ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ ...... (۱۰۳/۱۶) ۔ وہ شخص جس کے متعلق یہ اعتراضاً کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کو قرآن کریم سکھا جاتا ہے ، اس کی زبان (تو عجمی ہے) ۔ یہاں اِلْحَادٌ کے معنی ہیں کسی غلط بات کو کسی کی طرف بطور اعتراض منسوب کرنا ۔ یعنی راستی سے ہٹ کر ، کسی کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

مُلْتَحَدًا (۱۸/۲۷) پناہ گاہ - وہ جگہ جسکی طرف انسان (اپنے راستے سے ہٹ کر) پناہ کے لئے جائے - سرنگ یا زمین دوز راستہ کو بھی کہتے ہیں* -

سورۃ اعراف کی جس آیت کو اوپر درج کیا گیا ہے اُسے ایک بار پھر سامنے لائیے کیونکہ وہ ایک عظیم حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے - پوری آیت یوں ہے - وَ لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا - وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ - سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۷/۱۸۰)- تمام صفات پورے اعتدال اور تناسب کے ساتھ ، اللہ کے لئے ہیں - اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو- اور جو لوگ اس کی صفات میں (اعتدال سے ہٹ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں ، انہیں چھوڑ دو - انہیں ان کی اس غلط روش کا نتیجہ بہت جلد مل جائیگا-

خدا کی ذات تمام صفات کی حامل ہے ، اور وہ صفات انتہائی اعتدال اور تناسب کے ساتھ اس میں جمع ہیں - تم ان صفات کو خود اپنی ذات میں اجاگر کرتے جاؤ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ- جو لوگ صفاتِ خداوندی کے تو قائل ہیں لیکن ان میں اعتدال اور تناسب کو ملحوظ نہیں رکھتے، وہ ملحد ہیں - تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں - ان کی اس غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آجائے گا - تم نے ان کی پیروی نہ کرنا -

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سامنے لایا گیا ہے - ملحد وہ نہیں جو خدا کی ذات یا اس کی صفات کا منکر ہے - ملحد وہ ہے جو انہیں مانتا ہے لیکن کسی ایک صفت میں افراط سے کام لیکر تناسب کو بگاڑ دیتا ہے - یہ غلط روش ہے - اسلام کے معنی یہ ہیں کہ صفات ہوں یا قوانین (۲/۲۰۸) دونوں میں پورے پورے تناسب کو قائم رکھا جائے -

## ل ح ف

اَللِّحَافُ - سردی میں جس کپڑے کو اوڑھا جائے اور اس میں لپٹا جائے - لحاف ، کمبل وغیرہ جو تمام کپڑوں کے اوپر اوڑھے جاتے ہیں *- ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لپٹ جانے ، ساتھ چمٹے اور لگے رہنے کے بتائے ہیں - لَحَفَہٗ - اس نے اُسے لحاف سے ڈھانپ دیا - اِلْتَحَفَ بِہٖ - وہ اس میں لپٹ گیا* -

سورہ بقرہ میں ہے - لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲/۲۷۳) - وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے - مانگتے ہوئے چمٹ نہیں جاتے - استعارۃً اسکے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو بہت مبالغہ (شدت اور زیادتی) سے کرنا** -

*تاج - **راغب -

# ل ح ق

لَحِقَه'۔ يَلْحَقُه' وَاَلْحَقَه' اِلْحَاقاً ۔ کسی چیز کو پا لینا ۔ اس سے جا ملنا ۔ اَلْحَقَه' بِه ۔ اسے اس کے پیچھے لگایا ، اس سے ملا دیا ۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے ۔ اَلْمُلْحَقُ ۔ وہ آدمی جو اپنے خاندان کو چھوڑ کر کسی دوسرے خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہو ۔ لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ مل جانے کے ہیں ۔ تَلاَحَقَتِ الرِّکَابُ ۔ سواریاں ایک دوسرے سے ملتی چلی گئیں * ۔ سورہ یوسف میں حضرت یوسف[ؑ] کی دعا ہے ۔ وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۲/۱۰۱) ۔ مجھے صالحین کے ساتھ ملادے ۔ مجھے ان کے زمرے میں شامل کر دے ۔ سورہ جمعہ میں نبی اکرم[ؐ] کے متعلق ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے لئے بھی رسول ہیں ۔ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳) ۔ اور ان اقوام کے لئے بھی جو ابھی ان سے نہیں ملیں ۔ یعنی ان کے بعد آنے والی اقوام ۔ اس لئے کہ حضور[ؐ] خاتم النبیین ہیں اور تمام نوع انسانی کے لئے رسول ہیں ۔ اس لئے آپ کی رسالت تمام آنے والی اقوام کے لئے بھی اسی طرح ہے جسطرح اسوقت کی مخاطب قوم کے لئے تھی ۔ اس لئے حضور[ؐ] کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا عقیدہ باطل اور قرآنِ کریم کے یکسر خلاف ہے ۔

# ل ح م

لَحْمَةٌ ۔ قرابت ۔ رشتہ داری ۔ نیز کپڑے کا بانا ، جو تانے کے ساتھ ملکر کپڑا بناتا ہے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں گھسنا اور گتھ جانا بتائے ہیں ۔ گوشت کو اَللَّحْمُ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء باہمدگر پیوست ہوتے ہیں ۔ اَلْمَلْحَمَةُ ۔ گھمسان کا رن ۔ قتل وغارتگری کا بڑا واقعہ **۔

قرآن کریم میں لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ (سؤر کے گوشت) کی حرمت آئی ہے ۔ (۲/۱۷۳) ۔ اَللَّحِمُ ۔ وہ گھر جہاں لوگوں کی بہت غیبتیں کی جائیں **۔ قرآن کریم نے بھی غیبت کو " مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے " تشبیہ دی ہے ۔ (۴۹/۱۲) ۔ لَحْمٌ کی جمع لُحُوْمٌ ۔ آئی ہے ۔ (۲۲/۳۷) ۔

# ل ح ن

اَللَّحْنُ ۔ اس مادہ کے اصلی معنی ہوتے ہیں صحیح جہت اور راہ اعتدال سے کسی ایک طرف کو مڑجانا یا مائل ہو جانا * ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔

کہ بات کو اس کے صحیح اسلوب اور مستعمل طریقہ سے ہٹا دینا - اسکی ایک شکل یہ ہے کہ خفیہ طور پر بعض الفاظ کے خاص معنی مقرر کر لئے جائیں - جب وہ لفظ بولا جائے تو عام لوگ اس کا مطلب اور لیں اور جسے وہ خاص معنی معلوم ہیں وہ اس کا مطلب دوسرا لے- اسکی دوسری شکل یہ ہے کہ خود لفظ کی ہیئت میں تبدیلی کر دی جائے - اور تیسری شکل یہ کہ الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے - یا انہیں بطور تعریض استعمال کیا جائے - اسی سے ایسے آدمی کو جو بہت ذہین ہو اور تعریض سے صحیح مقصود سمجھ جائے لَحِنٌ کہدیتے ہیں**- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے موڑ دینا - اور (۲) ذہانت اور ذکاوت -

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے کہ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷/۳۰) یعنی وہ جسطرح الفاظ کو موڑ توڑ کر کہتے ہیں اور صریح مفہوم کو چھوڑ کر کلام کا تعریضی مفہوم لیتے ہیں ، اس سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں - چنانچہ یہودیوں کے متعلق سورہ نساء میں ہے يَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) - اسی قسم کی ذو وجوہ باتیں منافقین کیا کرتے تھے -

اَللَّحْنُ - زبان اور بولی کو بھی کہتے ہیں - اور پڑھنے میں غلطی کرنے کو بھی چنانچہ لَاحِنٌ - غلط بولنے والے کو کہتے ہیں - قَدْ لَحَنَ لَهُ لَحْنًا کے معنی ہیں اس نے اس سے اشاروں کنایوں میں اسطرح بات کی کہ وہ تو بات سمجھ جائے لیکن کوئی دوسرا آدمی نہ سمجھ سکے***-

# ل ح ی

لَحْيٌ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں - (۱) بدن کا ایک ٹکڑہ یعنی جبڑا - اور (۲) کسی چیز کو چھیل دینا - چنانچہ اَللِّحَاءُ درخت کی چھال کو کہتے ہیں - اَللِّحْيَةُ - ڈاڑھی - اَللَّحْيُ - جبڑا - ڈاڑھی اُگنے کی جگہ - لَحَيْتُ فُلَانًا اَلْحَاهُ - میں نے اسکو ملامت کی - لَاحٍ - ملامت کو - مَلْحِيٌّ - ملامت کردہ شخص - لَاحَاهُ مُلَاحَاةً - اس نے اس سے جھگڑا کیا - ایک دوسرے کو برا بھلا کہا - لعنت ملامت کی*-

قرآن کریم میں ہے - لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي (۲۰/۹۴) اس کے لفظی معنی ہیں میری ڈاڑھی مت پکڑ - اور مفہوم یہ ہے کہ میری ملامت مت کر - ہماری زبان میں بھی ڈاڑھی نوچنا یا نچوانا اور پگڑی اچھالنا انہی معنوں میں بولتے ہیں -

*تاج و محیط - **راغب - ***تاج -

اگرچه سورہ اعراف میں جو ہے وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗٓ اِلَیْهِ (۷/۱۵۰)۔ '' اس نے اپنے بھائی کے سر کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا''۔ تو اس سے زبانی ملامت کے ساتھ ہاتھوں کی حرکت کا بھی اشارہ ملتا ہے ۔

# ل د د

اَلَدُّ کے اصلی معنے ایسے شخص کے ہیں جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو اور اس کی وجہ سے اسے اس کے ارادہ سے موڑا نہ جاسکے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو بڑا جھگڑا لو اور خود سر ہو اور کسی کی بات مانے ہی نہیں ۔ اسکی جمع لُدٌّ آتی ہے * ۔ اَللَّدِیْدَانِ ۔ گردن کے دونوں پہلو جو کانوں کے نیچے ہوتے ہیں ** ۔ نیز وادی کے دونوں کنارے ۔ اس نہج سے لُدٌّ کے معنی '' حق سے ہٹے ہوئے'' (جمع) آتے ہیں ۔ نیز بات کو نہ سننے والے بہروں کو بھی کہتے ہیں ۔ جھگڑا لو بھی گویا بہرہ ہوتا ہے ، دوسرے کی نہیں سنتا اور اپنی کہے جاتا ہے ۔ اِلْتَدَّعَنْهُ ۔ وہ اس سے ہٹ گیا ۔ آلْدَدْتُهٗ ۔ میں نے اسے بہت جھگڑا لو پایا ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (۱) جھگڑا کرنا ۔ اور (۲) کسی چیز کا کنارہ ہیں ۔

سورۃ بقرہ میں ہے هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴) ۔ وہ بہت ہی سخت جھگڑا لو ہے ۔ سورۃ مریم میں قَوْمًا لُدًّا (۱۹/۹۷) آیا ہے ۔

# لَدُنْ (لَدٰی)

لَدُنْ ۔ پاس ۔ نزدیک ۔ مِنْ لَدُنْ ۔ طرف سے ۔ ہاں سے ۔ مِنْ لَدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱) ۔ خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ۔

ہمارے ہاں ( تصوف میں ) '' علمِ لدنی'' کی ایک اصطلاح رائج ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ علم جو کوئی شخص براہ راست خدا سے حاصل کرے۔ مفہوم اس سے کشف یا الہام ہوتا ہے ۔ جیسا کہ اِلْہَام ( ل ۔ ہ ۔ م کے عنوان ) میں لکھا گیا ہے ، ختمِ نبوت کے بعد الہام یا کشف کا تصور غیر قرآنی ہے ۔ اب انسان جو علم خدا سے براہ راست حاصل کرتا ہے وہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا ۔ خدا سے براہ راست علم کا نام وحی ہے جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا ۔

* راغب ۔ ** تاج ۔

لَدَیٰ ۔ لَدُنْ کے معنوں میں آتا ہے ۔ لَدَی الْحَنَاجِرِ (۱۸/۴۰) ۔ گلوں تک ۔ حلق کے نزدیک ۔ حلق کے پاس ۔ لَدَا الْبَابِ (۲۵/۱۲) ۔ دروازہ کے قریب ۔

# ل ذ ذ

اَللَّذَّۃُ ۔ خواهش ۔ وہ مزہ جو طبیعت و مزاج کے مطابق ہو ۔ اَلَمٌ کی ضد ہے ۔ لَذَّہٗ ۔ لَذَّبِہٖ ۔ اس نے اسے لذیذ پایا* لذیذ سمجھا ۔ قرآن کریم میں ہے وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۷۱/۴۳) ۔ اس سے آنکھیں لذت یاب ہوتی ہیں ۔ اَللَّذَّۃُ بمعنی لذیذ بھی آتا ہے ، قرآن کریم میں ہے لَذَّۃٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ (۴۶/۳۷) پینے والوں کے لئے لذیذ ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ کسی مناسب و موافقِ طبع چیز کے ، اس حیثیت سے کہ وہ موافق طبع ہو ، ادراک کر لینے کو لَذَّۃٌ کہتے ہیں ۔ مثلاً قوت ذائقہ کے لئے شیرینی کا مزہ الخ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ** ۔

# ل ز ب

لَزْبٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کے قائم اور ثابت رہنے ، جمے رہنے اور ساتھ لگے رہنے کے ہوتے ہیں ۔ لَازِبٌ ۔ لازم کو کہتے ہیں ۔ (ابن فارس) ۔ اَللُّزُوْبُ ۔ چمٹنا ۔ طِیْنٍ لَّازِبٍ (۱۱/۳۷) ۔ چمٹنے والی مٹی ۔ اَللَّازِبُ ۔ وہ چیز جو کسی کے ساتھ جم جائے ۔ اس سے چمٹ جائے ، اور اس پر ثبت ہوجائے ۔ لَزِبَ الطِّیْنُ ۔ مٹی جم گئی اور سخت ہوگئی ۔ اَللَّزْبَۃُ ۔ سخت قحط سالی کو کہتے ہیں جو شدید طور پر چمٹ جاتی ہے *** ۔ (کیونکہ مصیبت کے دن جلدی نہیں گذرا کرتے) ۔

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں سورۃ الصافات میں ہے کہ اسے طِیْنٍ لَّازِبٍ سے پیدا کیا گیا ہے (۱۱/۳۷) ۔ جب مٹی پانی کے ساتھ ملتی ہے تو اس میں زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوتی ہے ۔ جیسے جوہڑوں کے کنارے چپچپی مٹی سے چھوٹے چھوٹے جرثوسے (Life - Cells) پیدا ہوجاتے ہیں ۔ ان سے زندگی (Life) ارتقائی طور پر اوپر کو ابھرتی ہوئی پیکر انسانی میں آگئی ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "ابلیس و آدم" میں عنوان ۔ انسان) ۔

# ل ز م

لَزِمَ ۔ یَلْزَمُ ۔ لُزُوْمًا ۔ کسی چیز کا جمنا ، ہمیشہ رہنا ، ساتھ لگے رہنا اور جدا نہ ہونا ۔ اَلْمِلْزَمُ ۔ شکنجہ ۔ اَلْمُلَازِمُ ۔ کسی کے ساتھ لگا

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

رھنے والا ۔ نیز گلے ملنے والے کو بھی کہتے ھیں* ۔ لَزِمَ الشَّیْءُ ۔ چیز ثابت اور دائم رھی ۔ لَزِمَ الْمَالُ فُلاَناً ۔ فلاں آدمی پر مال واجب ھوگیا**۔ لُزُوْمُ الشَّیْءِ ۔ کسی شے کا طویل عرصہ تک رھنا***۔ اَللِّزَامُ جو چیز آکر چپک جائے اور پھر الگ نہ ھو۔ (۲۵/۷۷) ۔

قرآن کریم میں ھے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جو دعوت تم پر صاف اورواضح نہ ھوئی ھو اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَ اَنْتُمْ لَھَا کَارِھُوْنَ (۱۱/۲۸) کیا میں اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ سکتا ھوں ؟ سورۃ فتح میں ھے وَ اَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی (۴۸/۲۶)۔ اس نے انہیں تقویٰ کی بات پر لگا دیا یعنی انہوں نے تقویٰ اختیار کرلیا ۔ وہ اس پر مضبوطی سے جم گئے۔ سورۃ طٰہٰ میں عذابِ خداوندی کے متعلق ھے ۔ لَکَانَ لِزَاماً (۲۰/۱۲۹) ۔ وہ ان کے ساتھ آکر چپک جانے والا تھا ۔

# ل س ن

اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کی ایسی لمبائی کے ھیں جو نہایت لطیف ھو اور منقطع نہ ھو (ابن فارس) ۔ لِسَانٌ (جمع اَلْسِنَۃٌ) ۔ زبان (Tongue) ۔ (۲۰/۹) ۔ لغت (Language) (۱۴/۴) ۔ قوتِ گویائی* (۲۸/۳۴) ۔ سورۃ مریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا ۔ وَجَعَلْنَا لَھُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا (۱۹/۵۰) ۔ صاحبِ تاج کے نزدیک یہاں لِسَانٌ کے معنی تعریف و توصیف ھے ۔ یعنی انہیں ایسا مقام عطا کر دیا کہ دنیا ان کا نام مدح و ستائش سے لیتی ھے ۔ یا یہ کہ انہوں نے ھمیشہ خدا کی صداقتوں کو بلند کیا اور دنیا کے سامنے صدق کو پیش کیا ۔

قرآن کریم نے اختلافِ الوان و السنہ کو خدا کی نشانیاں قرار دیا ھے (۳۰/۲۲) ۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ تو ایک مدت سے جاری تھا لیکن ھمارے زمانہ میں (Language) نے زبان سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی سی حیثیت اختیار کرلی ھے ، جسے (Ernst Cassirer) کے الفاظ میں (The Philosophy of Symbolic Forms) کہا جاتا ھے****۔ اس فلسفہ کی رو سے ''زبان'' کے متعلق عجیب و غریب حقائق منکشف ھو رھے ھیں ۔ علاوہ بریں، ڈاکٹر بک (Bucke) نے اپنی کتاب (The Cosmic Consciousness) میں زبانوں کے تجزیہ سے قوموں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جو اصول بیان کئے ھیں ان سے بھی یہ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب۔ ****یہ خود (Cassirer) کی ایک کتاب کا بھی نام ھے ۔

حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اختلافِ السنہ کس طرح آیَۃٌ مِنْ آیَاتِ اللّٰہِ ہے ۔ ابھی ان علوم کی ابتدا ہے ۔ جب ان کی تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو پھر قرآن کریم کے یہ حقائق اور بھی اُبھر کر سامنے آجائینگے ۔

# ل ط ف

لَطَفَ ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا ۔ اور لَطُفَ ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی چیز کا چھوٹا اور باریک ہونا * ۔ اَللَّطِیْفُ ۔ خدا کے اسمائے حسنٰی میں سے ہے ۔ اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ خفیف اور دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ بھی کہ وہ انسانوں کو راہ نمائی دینے میں نہایت لطیف انداز اختیار کرتا ہے اور نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے** ۔ صاحب محیط نے اس کے معنی صاف اور شفاف کے بھی لکھے ہیں *** ۔ خدا کے لطیف ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا قانون تدریج و امہال محسوس نہیں ہوتا ۔ درخت بڑھتا ہے ۔ اس سے پتے نکلتے ہیں ۔ پھل لگتے ہیں ۔ سورج " چلتا ہے " ۔ ساری کائنات میں تغیرات کا سلسلہ جاری ہے ۔ ارتقاء ہو رہا ہے ۔ اعمال اپنے نتائج مرتب کر رہے ہیں ۔ لیکن ان تمام حرکات ، اعمال اور تغیرات کی رفتار ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا ۔ یہ سب کچھ نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا رہتا ہے ۔

اَللَّطِیْفُ مِنَ الْکَلَامِ ۔ بڑی لطیف اور دقیق بات * ۔ اَللَّطَائِفُ ۔ وہ باتیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکیں** ۔

سورہ انعام میں ہے ۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶/۱۰۴) ۔ انسانی نگاہیں خدا کا احاطہ نہیں کر سکتیں ۔ اور وہ تمام نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ ( اس لئے کہ ) وہ لطیف و خبیر ہے ۔ یہاں سے اَللَّطِیْفُ کے معنی واضح ہو گئے ۔ یعنی باریک بیں ۔

سورہ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف نے کہا کہ ہم میں سے ایک آدمی بستی کیطرف جائے اور وہاں کے حالات کا پتہ کرے اور کچھ کھانے کے لئے لائے ۔ وَلْیَتَلَطَّفْ وَلَا یُشْعِرَنَّ بِکُمْ اَحَدًا (۱۸/۱۹) ۔ وہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لے تاکہ کسی کو تمہارا پتہ نہ لگ جائے ۔ اس سے بھی لُطْفٌ کا مفہوم سامنے آجاتا ہے ۔ یعنی کسی کام کو غیر محسوس طور پر سرانجام دینا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ***محیط ۔

# ل ظ ی

اَللَّظٰی۔ آگ یا آگ کا شعلہ۔ راغب نے اسکے معنے آگ کا خالص شعلہ بتائے ھیں۔ یعنی جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ہو۔ لَظِیَتِ النَّارُ وَ تَلَظَّتْ۔ آگ بھڑک اٹھی *۔

قرآن کریم میں ہے۔ کَلَّا اِنَّهَا لَظٰی (۷۰/۱۵)۔ شعلہ انگیز آگ۔ دوسری جگہ نَاراً تَلَظّٰی (۹۲/۱۴) آیا ہے۔ یعنی ایسی آگ جو بھڑک رہی ہے۔

# ل ع ب

اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جو منہ سے بہنے والی رال کو کہتے ھیں۔ لَعِبَ فُلَانٌ۔ اس نے بغیر صحیح مقصد کے کام کیا**۔ صاحب محیط نے اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس سے قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ نیز اس کے معنی ھیں غیر موزوں کاموں سے دلبستگی پیدا کرنا اور اس سے مسرت حاصل کرنا۔ یا سود مند چیزوں کو چھوڑ کر غیر سود مند چیزوں کی طرف لگ جانا***۔ لَاعِبٌ۔ کھیل کھیلنے والا****۔ لَعِبٌ، جِدٌّ کی ضد ہے جِدٌّ کے معنی ہوتے ھیں کسی کام کو (Seriously) کرنا۔ لہذا، لَعِبٌ کے معنی ہوئے کسی معاملہ میں (Serious) نہ ہونا۔ لَعِبَ بِنَا الْمَوْجُ۔ اُسوقت کہتے ھیں جب موجیں کشتی کو منزل مقصود کیطرف نہ لے جائیں۔ اس بنا پر، لَعِبٌ کے معنی یہ ہوں گے کہ حرکت تو ہو لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ قدم تو اٹھیں لیکن منزل قریب نہ آئے۔ بلا مقصد کام، بلا نتیجہ عمل۔ اِنَّمَا اَنْتَ لَاعِبٌ۔ تم یونہی مذاق کر رہے ہو۔ تم اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لے رہے****۔

لَعِبٌ کے ساتھ لَهْوٌ کا عنوان (ل۔ ھ۔ و) بھی دیکھئے۔ کلیات میں ہے کہ لَهْوٌ حق سے روگردانی کو کہتے ھیں اور لَعِبٌ باطل کی طرف متوجہ ہو جانے کو***۔

سورہ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو هُزُوًا وَلَعِبًا لیتے ھیں (۵/۵۷) انہیں اپنا دوست نہ بناؤ۔ یعنی جو اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لیتے۔ سورہ انعام میں ہے وَذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ (۶/۹۲) ”تو انہیں چھوڑ دے کہ یہ اپنی بیہودہ باتوں سے (زندگی سے) کھیلتے رھیں“۔ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے۔ اسے مذاق قرار دے رکھا ہے۔

---

*تاج و محیط۔ **راغب۔ ***محیط۔ ****تاج و لین۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھے۔ مستقبل کے اندر بہت سی باتیں آجاتی ہیں۔ اس زندگی میں عیش امروز کی بجائے فکر فردا۔ آنے والی نسلوں کے مفاد کا خیال۔ پوری نوع انسانی کی بہبود کی فکر۔ اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی کا خیال۔ طبیعی زندگی کے مفاد عاجلہ کے مقابلہ میں بلند اقدار کا تحفظ۔ اس کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان مستقبل کی کچھ پرواہ نہ کرے اور اپنی ساری توجہ طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد اور عیش امروز پر رکھے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش زندگی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (۶/۳۲) اپنی تمام تگ و تاز کو طبیعی زندگی کی آسائشوں کی نذر کر دینا، بے مقصد زندگی ہے۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ (۶/۳۲)۔ جو لوگ تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مستقبل کی زندگی کا مفاد ہی اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ لَهْوٌ اس بات کو کہتے ہیں جو انسان کی توجہ کو اس چیز کی طرف سے ہٹا کر جو اس کے لئے ضروری ہے اُس چیز کی طرف منعطف کرا دے جو غیر ضروری اور بے مقصد ہے۔ ان آیات سے (جن میں الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا کو لہو و لعب کہا گیا ہے) یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم دنیاوی زندگی کو قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کی خوشگواریوں کے حصول اور کائناتی قوتوں کی تسخیر کو مومن کی زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے (دیکھئے عنوان د۔ ن۔ و)۔ ان آیات کا مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنی نگاہ کو مستقبل کے مفاد سے ہٹا کر مفاد عاجلہ اور فوری عیش پر مبذول کر لینا۔ زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھنا اور حیوانی سطح پر جینا۔ جب طبیعی زندگی کے کسی مفاد اور بلند انسانی قدر میں تصادم ہو تو بلند قدر کو طبیعی مفاد پر قربان کر دینا۔ یہ روش غلط ہے۔ جو قومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہو جاتی ہیں۔ یہی حالت افراد کی ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ مستقبل کے مفاد کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیاوی مفاد ضرور حاصل کرو۔ طبیعی زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کی خوشگواریوں میں اور کسی بلند انسانی قدر میں (جو وحی کے ذریعے ملتی ہے) (Tie) پڑ جائے۔ تصادم ہو جائے۔ تو اسوقت بلند قدر کے تحفظ کی خاطر طبیعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دینا چاہئے۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم انسانی زندگی کو محض مذاق سمجھ رہے ہو۔

سورہ انبیاء میں ہے ۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ (۲۱/۱۶) ۔ اور ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی ، لاعبین ، نہیں بنا دیا ۔ اسے ہم نے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ۔ یہ مذاق نہیں ۔ یہ بلا مقصد نہیں ۔ اسکا ایک عظیم الشان مقصد ہے ۔ یہ ایک اہم پروگرام کے ماتحت عمل میں آیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) ۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ تعمیری قوتیں ، تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں ۔ اس سے تخریبی قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور تعمیری سلسلہ آگے بڑھ جاتا ہے ۔ یوں یہ سلسلۂ کائنات ، اس تعمیری طریق سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز محض کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد و بلا منزل پیدا کر دی گئی ہو اس کی صورت یہ نہیں ہؤا کرتی ۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اس غلط تصور کی بھی تردید کی ہے جو ہندؤوں کے ہاں رائج ہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایشور نے ایک لیلا رچا رکھی ہے ۔ یعنی محض کھیل ہے ۔ اسی لئے ان کے ہاں ایشور کو ''نٹ راجن'' کہتے ہیں ۔ یعنی کھلاڑیوں کا بادشاہ ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تصور لغو ہے ۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸) ۔ یہ باتیں بے حد قابل افسوس اور تباہی کا باعث ہیں ۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (۳۰/۸) کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے ۔

لہذا کائنات اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو ہمیشہ (Seriously) لینا چاہئے ۔ مذاق نہیں سمجھنا چاہئے ۔ اور اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے ۔ قرآن کریم نے انسانی زندکی اور کائنات کو حقیقت (Reality) قرار دیکر انسان کے سامنے ایک عظیم پروگرام رکھ دیا ہے ۔ اس سے افلاطون (Plato) کا وہ طلسم بھی یکسر ٹوٹ گیا جس کی رو سے اس کائنات کو محض فریب سمجھا جاتا تھا ۔ اور اس کے ٹوٹنے سے ویدانت (ہندی تصوف) ۔ خانقاہیت اور تصوف کی عمارت بھی نیچے آگری ۔ دوسری طرف مغرب کے نظریہ مادیت (Materialism) کا بھی بطلان کر دیا جس کی رو سے زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور بس ۔

## لَعَلَّ (حرف)

لَعَلَّ ۔ یہ حرف حسب ذیل معانی پیدا کرتا ہے ۔

(۱) ''تاکہ'' وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲/۱۸۹) ۔ تم

قانون خداوندی کی نگہداشت کرو تا کہ تمہاری کھیتیاں برو مند ہوں۔ یہ توقع اور ترجّی (امید) کے لئے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے ''امید ہے کہ''..... ''توقع ہے کہ''۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں (مثلاً ۔ ۲/۱۱۳ ؛ ۱۷/۳۹ ؛ ۲/۲۳۱ ) ۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت ۔ مصلحت ۔ وہ مقصد جس کے لئے وہ قانون دیا گیا ہے ۔ لَعَلَّ بھی حکمت بتانے کے لئے آتا ہے ۔ وَ اتَّقُوْا اللّٰہَ ۔ کتاب ہے (یعنی قانون ۔ یا حکم) اور لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اس کی حکمت (مقصد یا غایت یا وہ نتیجہ جو اس حکم یا قانون کی اطاعت سے لازمی طور پر مرتب ہونا چاہئے)۔

(۲) ''شاید'' یا ''ہوسکتا ہے کہ'' کے معنوں میں ۔ وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ( ۴۲/۱۷ ) اور تجھے کیا خبر ہے ، شاید وہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو۔ (ہوسکتا ہے کہ وہ قریب ہی ہو)۔

(۳) استفہام انکاریہ کے لئے۔ یعنی ایسا سوال جس کا جواب (یا اس سے مراد) نہیں ہوتا ہے ۔ فَلَعَلَّکَ تَارِکٌ بَعْضَ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ ( ۱۱/۱۲ )۔ تو کیا تو (ان لوگوں کی خاطر) اپنی وحی کا کچھ حصہ ترک کردیگا ؟ ۔ (ہرگز نہیں ۔ تو ایسا کبھی نہیں کریگا)۔

(۴) بعض اوقات یہ ''گویا کہ'' اور ''جیسے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت مثال میں پیش کی جاتی ہے ۔ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ ( ۲۶/۱۲۹ )۔ اور تم صنعت کاری کے بڑے بڑے کام کرتے ہو گویا تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے ۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم یہ صنعت کاری اس لئے کرتے ہو تا کہ تمہیں دوام و استمرار نصیب ہو جائے ۔ یہ چیزیں تمہاری بقا کا ذریعہ بن سکیں ۔

# ل ع ن

لَعَنَ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا*۔ خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوگی کہ انسان زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محرومی قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوگی ۔ اس لئے لَعْنَتٌ کے معنی ہونگے قانون مکافات کی رو سے زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو جانا ۔

*راغب ۔ **تاج ۔

دور رکھنے کے اعتبار سے اَللَّعِيْنُ (Scare - Crow) کو کہتے ہیں - یعنی وہ لکڑیاں سی جنہیں انسانی لباس پہنا کر کھیتوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ پرندے فصل سے دور دور رہیں اور اسے خراب نہ کریں* -

قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق پہلے کہا ہے فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ (۱۵/۳۴) - اور اس کے بعد ہے اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَةَ (۱۵/۳۵) - رَجْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو دور پھینک دینا - اس سے بھی لَعْنَتٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآنی تعلیم سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوسکتے - ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں - قرآن کریم نے کہا کہ بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفْرِهِمْ (۲/۸۸) - نہیں! بات یہ نہیں جو وہ کہتے ہیں - بات یہ ہے کہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دئے گئے ہیں - اور یہ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوا ہے - لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا کافروں پر ''لعنتیں'' برساتا ہے تو انہوں نے لَعْنَتٌ کے قرآنی مفہوم کو نہیں سمجھا - خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا - اس سے خدا کے قانون مکافات عمل کا بیان مقصود ہے - اور وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص غلط راہوں پر چلتا ہے وہ زندگی کی انسانیت ساز خوشگواریوں سے دور ہٹ جاتا ہے - ان سے محروم رہ جاتا ہے - اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو لعنت کہتے ہیں اور ایسے شخص (یا قوم) کو ملعون -

مَلْعُوْنٌ دور کیا ہوا - اس کی جمع مَلْعُوْنُوْنَ وَ مَلْعُوْنِیْنَ ہے (۳۳/۶۱) - دور کئے ہوئے -

# ل غ ب

لَغَبَ - لَغْبًا - لُغُوْبًا - بہت زیادہ درماندہ ہونا اور تھک جانا - شدید تکان ہو جانا** - اَلنَّصَبُ - جسمانی تکان کو کہتے ہیں اور اَللُّغُوْبُ ذہنی یا نفسیاتی تکان کو* - سَهْمٌ لَغِیْبٌ - وہ تیر جس کے پر بہت کمزور اور خراب ہوں - رَجُلٌ لَغِیْبٌ - کمزور اور بیوقوف آدمی** -

قرآن کریم میں اہل جنت کا قول ہے کہ لَایَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) - اس میں نہ جسمانی مشقت ہوگی نہ ذہنی

*تاج - **راغب -

اور نفسیاتی تکان ۔ غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے اگلے مراحل جن کی طرف قرآن کریم لے جاتا ھے ، زندگی کی موجودہ سطح سے کسقدر بلند اور لطیف ھیں ۔ طبیعی (Physical) اضمحلال بھی نہیں اور ذھنی (Mental) یا نفسیاتی (Psychological) تکان (Exhaustion) بھی نہیں۔ جب "زندگی کے اگلے مراحل" سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ھوگی ، تو اس میں یہ کیفیت کسطرح پیدا ھوگی اسکا ھم ، اپنے شعور کی موجودہ سطح پر رھتے ھوئے ، اندازہ نہیں کر سکتے لیکن یہ ظاھر ھے کہ اس میں حیات (Life) کی توانائیاں بھر پور ھونگی ۔

# ل غ و

اَللُّغَۃُ ۔ آوازیں جن سے ھر قوم اپنے مطالب کی تعبیر کرتی ھے ۔ بولی ۔ لَغَوْتُ لَغْوًا ۔ میں نے بات کی۔ بعض کا خیال ھے کہ اَللَّغْوُ کے معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ھیں ۔ کلام کو اس لئے لَغْوٌ کہتے ھیں کہ اسے پھینکا جاتا ھے* ۔ صاحب محیط کا خیال ھے کہ کوئی بعید نہیں کہ اَللُّغَۃُ یونانی لفظ لُوْغُوْس (Logos) سے ماخوذ ھو جس کے معنی کَلِمَۃٌ کے ھیں** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں ۔ (۱) ناقابل اعتناء چیز اور (۲) کسی چیز سے شیفتگی ۔ یعنی ھر وقت اسی کی باتیں کرتے رھنا ۔ چنانچہ پہلے مفہوم کی جہت سے اَللَّغْوُ اونٹ کے ان بچوں کو کہتے ھیں جو خوں بہا میں ناقابل اعتناء ھوں ۔ اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اَللُّغَۃُ بولی کو کہتے ھیں اس لئے کہ ھر ایک اپنی بولی پسند کرتا اور اسے بولتا رھتا ھے ۔

اَللَّغَا اور اَللَّغْوُ ۔ پرندے کی آواز کو کہتے ھیں ۔ اَلطَّیْرُ تَلْغِیْ بِاَصْوَاتِھَا ۔ پرندے اپنی آوازوں سے شور مچاتے ھیں ۔ اس اعتبار سے بےمعنی باتیں جو کسی گنتی میں شمار بھی نہ ھوں ، لَغْوٌ کہلاتی ھیں ۔ یا وہ باتیں جو زبان سے یونہی بلا ارادہ نکل جائیں* ۔ راغب نے کہا ھے کہ لَغْوٌ وہ باتیں ھیں جو سوچ سمجھکر نہ کی جائیں ۔ اس لئے وہ (بغیر ارادہ کے) کسی قطار و شمار میں نہ ھوں ۔ خلیل نے کہا ھے کہ لَغْوٌ اس بات کو کہتے ھیں جو یونہی منہ سے نکل جائے* ۔

کَلِمَۃٌ لَاغِیَۃٌ بیہودہ بات کو کہتے ھیں ۔ لَغَا فِیْ قَوْلِہٖ کے معنی ھیں وہ اپنی بات میں غلطی کر گیا ۔ اَلْغَاہُ ۔ اسے نامراد کر دیا ۔ ناکام بنا دیا ۔ بیکار کر دیا ۔ اَللَّغِیْ ۔ گری پڑی چیز* ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔

سورۃ بقرہ میں ہے لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵) ۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا ۔ ان پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تمہارے دل کا فعل ہوں ۔ یہاں سے لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔ یعنی وہ باتیں جو یونہی بلا ارادہ منہ سے نکل جائیں ۔ دوسری جگہ لَغْوٌ کے بعد ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (۵/۸۹) ۔ جو تم پختہ معاہدہ کرو ۔ جو تم دل سے عہد کرو ۔ جو بات سوچ سمجھ کر دل کے ارادہ سے کرو ۔ اس سے بھی لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔

جنت کی "شراب" کے متعلق کہا ہے ۔ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۵۲/۲۳) ۔ اس سے انسان نہ تو بے معنی بکواس کریگا اور نہ ہی اس سے اضمحلال پیدا ہوگا (نیز ۵۶/۲۵) ۔ دوسری جگہ جنت کے متعلق ہے ۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (۱۹/۶۲) ۔ یعنی اس میں ہر بات ایسی ہوگی جس سے سلامتی پیدا ہو ۔ وہاں کوئی بات لَغْوٌ نہیں ہوگی ۔ یہاں لَغْوٌ بمقابلہ سَلٰمٌ آیا ہے ۔ سورۃ غاشیہ میں لَغْوٌ کی جگہ لَاغِيَةٌ آیا ہے (۸۸/۱۱) ۔ مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲) ۔ اگر انہیں کبھی لَغْوٌ کے پاس سے گذرنا پڑ جاتا ہے تو وہ نہایت متانت سے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے وہاں سے گذر جاتے ہیں ۔ یہاں لَغْوٌ سے مراد ہر بیہودہ اور بے معنی بات کے ہیں ۔

ان مقامات سے لَغْوٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ بیہودہ باتیں ۔ ایسی باتیں جو شریف انسانوں کے شایان شان نہ ہوں ۔ بے معنی باتیں ۔ ایسی باتیں جن میں آواز ہی آواز ہو ، مطلب کچھ نہ ہو ۔ ایسی گفتگو جو بے سوچے سمجھے کی جائے ۔ ایسے کام جن کا کوئی وزن اور شمار نہ ہو ۔ جماعتِ مومنین کے جنتی معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کا کوئی دخل نہیں ہوگا ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کفار کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ اس قرآن کریم کو مت مانو ۔ وَالْغَوْا فِيْهِ ۔ جہاں قرآن کریم کی آواز بلند ہو تم شور مچا دو ۔ بے معنی باتیں کرنے لگ جاؤ ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) ۔ شاید اس طرح تم قرآن والوں پر غالب آ جاؤ ۔ حیرت ہے کہ جو مسلک کفار کا تھا مسلمانوں کو بھی آج کل اس کی تلقین کی جاتی ہے ۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ جہاں سے تمہیں یہ آواز سنائی دے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ ، تم اس کی بات

مت سنو ، بلکہ شور مچا دو کہ کوئی اور بھی یہ آواز نہ سننے پائے ۔ یہ طریقہ ہے جس سے تم ان لوگوں پر غالب آجاؤ گے ۔ اس لئے کہ اگر لوگوں نے قرآن کریم کی آواز سن لی تو وہ پھر تمہارے خود ساختہ مذہب سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکیں گے ۔

لہذا ہر وہ بات ، وہ عمل ، وہ تصور ، وہ نظریہ ، وہ عقیدہ جو انسان کو قرآن کریم سے دور رکھے لَغْوٌ ہے ۔ یہی وہ لغویات ہیں جن میں ہم صدیوں سے الجھے چلے آ رہے ہیں ۔ جب تک ہم اپنے دل و دماغ کو ان لغویات سے پاک اور صاف نہیں کرلیں گے ، دینِ خالص تک کبھی نہیں پہنچ سکینگے ۔

# ل ف ت

لَفَتَهٗ يَلْفِتُهٗ ۔ کسی کو اس کی سمت سے موڑ دینا ۔ جس رخ پر وہ ہو اس سے پھیر دینا ۔ لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ لَفَتَهٗ عَنِ الشَّیْءِ ۔ اسے کسی چیز سے ہٹا دیا، پھیر دیا * ۔ قرآن کریم میں ہے اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) ۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے راستے سے موڑ کر کسی اور طرف لے جائے ۔ اَلْتِفَاتٌ اسی سے ہے جسکے معنے ہیں رخ موڑنا * ۔ لِفْتُهٗ مَعَهٗ ۔ اس کا میلان اسکی طرف ہے ** ۔ اَللَّفُوْتُ وہ عورت جسکے ساتھ پہلے شوہر کا بچہ ہو اور اسکی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے وہ دوسرے شوہر کی طرف توجہ نہ کرسکے ۔ نیز اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دودھ دوہنے والے کی طرف بار بار مڑ کر دیکھے ، اسے کاٹے اور چلائے اور بمشکل دودھ دوہائے، کیونکہ اس کا بچہ مرچکا ہے* ۔ سورۂ ہود میں اصحابِ حضرت لوطؑ سے کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ ۔ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ (۱۱/۸۱) ۔ اور پھر تم میں سے کوئی ادھر منہ موڑ کر بھی نہ دیکھے ۔ ان چیزوں کو ایسا چھوڑ دو کہ پھر ان کی طرف تمہارا خیال بھی نہ آئے ۔ تمہاری یہ حالت ہو کہ ۔ از گوشۂ بامے کہ پریدیم ، پریدیم ۔

# ل ف ح

لَفْحٌ ۔ سخت گرم ہوا کی لپٹ ۔ لسان میں ہے کہ لَفْحٌ ہر گرم چیز کو کہتے ہیں اور نَفْحٌ ہر ٹھنڈی چیز کو ۔ محیط میں اصمعی کے حوالہ سے ہے کہ جس ہوا کو لَفْحٌ کہا جائے وہ گرم ہوگی اور جسے لَفْحٌ کہا

*تاج ۔ **محیط ۔

جائے وہ ٹھنڈی ہوگی ۔ لَفَحَتْهُ النَّارُ بِحَرِّهَا ۔ آگ نے اپنی گرمی سے اسے جھلسا دیا *۔ سورۂ مومنون میں ہے ۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۔ (۲۳/۱۰۴) ۔ آگ ان کے چہروں کو جھلس دیگی ۔

# ل ف ظ

لَفَظَهُ ۔ يَلْفِظُهُ مِنْ فِيْهِ ۔ اس نے اسے اپنے منہ سے نکال کر پھینکدیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ڈالدینے اور پھینکدینے کے ہوتے ہیں ۔

اَللَّافِظَةُ ۔ سمندر ( کیونکہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے وہ اسے کناروں پر پھینک دیتا ہے) ۔ چوگا دینے والے پرندے، کہ وہ جو کچھ منہ میں لاتے ہیں اپنے بچوں کو دیدیتے ہیں ۔ چکّی (کیونکہ جو کچھ دانہ وغیرہ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ آٹا بنا کر اسے باہر پھینک دیتی ہے) ۔ نیز وہ بکری جو چارہ کھا رہی ہو اور دودھ دوھنے والا آجائے تو جو گھاس اس کے منہ میں ہو وہ اسے بھی چھوڑ دے اور دودھ دینے کے لئے تیار ہوجائے ۔ اَللُّفَاظَةُ ۔ جو کچھ منہ سے پھینکا جائے ** ۔ لَفْظٌ ۔ منہ سے نکلی ہوئی آواز چونکہ اس میں آواز کا ہونا ضروری ہے اس لئے لَفْظُ اللّٰہ نہیں کہتے بلکہ كَلِمَةُ اللّٰهِ کہتے ہیں*** ۔

قرآن کریم میں ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ (۵۰/۱۸) ۔ وہ کوئی بات بھی نہیں بولتا ہے ۔

# ل ف ف

اللَّفُّ ۔ لپیٹنا ۔ (نَشْرٌ کی ضد ہے) ۔ لَفَّ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ ۔ اس نے اس چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا ۔ اَللَّفِيْفُ ۔ جماعت ۔ گروہ ۔ مجتمع لوگ ۔ اَللَّفِيْفُ ۔ ملے جلے اکھٹے لوگ ۔ مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ ۔ اَللِّفَافَةُ ۔ پٹی وغیرہ جو لپیٹی جائے ۔ اَلْاَلْفَافُ ۔ گتھے ہوئے درخت ۔ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۔ گھنے، گنجان، بکثرت درختوں والے باغیچے ۔ (۷۸/۱۶) ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۷/۱۰۴) ۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے اکٹھا کر کے لائینگے ۔ اِلْتَفَّ ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لپٹ جانا ۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵/۲۹) شدت پر شدت جمع ہوتی گئی ۔ مشکلات اکٹھی ہوتی چلی گئیں ۔ ساق پنڈلی کو بھی کہتے ہیں ۔****

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

# ل ف ی

اَلْفَاہُ کَاذِبًا ۔ اس نے اسے جھوٹا پایا ۔ وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا لَدَی الْبَابِ (۱۲/۲۵) ۔ ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ کے قریب پایا * ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) ۔ جس مسلک پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے ۔

تَلَافَی التَّقْصِیْرَ ۔ اس نے تقصیر کی تلافی کر دی ۔ اَلتَّلَافِی ۔ بدلہ لے لینا * ۔ تلافی کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جو چیز ہاتھ سے نکل گئی تھی اسے دوبارہ پا لیا گیا ہے ۔ تلافیِ مافات ۔ جو کچھ ہاتھ سے چلا گیا تھا اسے دوبارہ پا لینا ۔ اَللَّقَاءُ ۔ مٹی اور ہر گری پڑی گھٹیا چیز کو کہتے ہیں* ۔ یعنی جو چیز یونہی پا لی جائے ۔

# ل ق ب

اَللَّقَبُ ۔ وہ نام جو کسی کا اصلی نہ ہو بلکہ بعد میں پڑ جائے ۔ جمع اَلْقَابٌ * ۔ اس نام میں معنی کی رعایت ہوتی ہے ، بخلاف اَعْلَامٌ کے جس میں معنی کی رعایت نہیں ہوتی** ۔ لَقَبٌ تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ لقب تشریف ۔ لقب تعریف ۔ اور لقب تسخیف ۔ تیسری قسم سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں ذلّت کا پہلو ہوتا ہے *** ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) ۔ ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھا کرو ۔ ( دیکھئے عنوان ن ۔ ب ۔ ز )

# ل ق ح

لِقَاحٌ ۔ گھوڑے یا اونٹ کے مادۂ منویہ کو کہتے ہیں ۔ اَللَّقَحُ ۔ حمل ۔ لَاقِحٌ ۔ حاملہ ۔ (جمع لَوَاقِحُ) ۔ لَقِحَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی حاملہ ہوئی ۔ اَلْقَحَتِ الرِّیَاحُ الشَّجَرَ وَالسَّحَابَ ۔ ہواؤں نے درختوں اور بادلوں کو بار آور بنا دیا **** ۔ ( درختوں کو اسطرح کہ ہوائیں نر درختوں کا زیرہ ، مادہ درختوں پر لا کر ڈال دیتی ہیں جس سے ان میں پھول آ جاتے ہیں اور پھل پیدا ہوتے ہیں ۔ اور بادلوں کو اس طرح کہ ہوائیں سمندر سے پانی اٹھا کر بادلوں کو بار آور کر دیتی ہیں ۔ یہ ابن فارس کی تشریح ہے) ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (۱۵/۲۲) ۔ ہم بار آو

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

ھواؤں کو بھیجتے ھیں ۔ اس کے مقابلہ میں آندھی اور جھکڑ کی ھوا کو اَلرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (۵۱/۴۱) کہا گیا ھے ۔ بانجھ ھوا ۔

# ل ق ط

لَقَطَ ۔ یَلْقُطُ ۔ لَقْطًا ۔ کسی (گری پڑی) چیز کو زمین سے بلا محنت و مشقت اٹھا لینا ۔ اَللُّقَطَۃُ ۔ وہ پڑی ھوئی چیز جو کسی کو ملے اور وہ اُسے اٹھالے ۔ نیز پھینکا ھوا نوزائیدہ بچہ ۔ اسے اَللَّقِیْطُ بھی کہتے ھیں * ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے معنی ھوتے ھیں اس چیز کو زمین سے اٹھا لینا جسے اچانک دیکھا ھو اور اسے لینے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ ھو ۔ اگرچہ بعض اوقات یہ مقصد اور ارادے کے ساتھ بھی ھو سکتا ھے ۔

قرآن کریم میں ھے کہ حضرت یوسف[ع] کے بھائیوں نے کہا کہ اسے اندھے کنوئیں میں ڈالدو ۔ یَلْتَقِطْہُ بَعْضُ السَّیَّارَۃِ (۱۲/۱۰) ۔ کوئی قافلہ اسے پڑی ھوئی چیز دیکھ کر اٹھا کر لئے جائیگا ۔ اسی طرح حضرت موسیٰ[ع] کے متعلق ھے کہ جب ان کی والدہ نے انہیں دریا میں بہا دیا ۔ فَالْتَقَطَہٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ (۲۸/۸) ۔ فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا ۔

# ل ق ف

لَقِفَ ۔ یَلْقَفُ ۔ کسی چیز کو جلدی سے لے لینا ۔ جو چیز تمہاری طرف پھینکی جائے اسے تیزی سے (ھاتھ سے یا منہ سے) اُچک لینا ۔ راغب نے اسکے معنی کسی چیز کو مہارت اور ھوشیاری سے لے لینا لکھے ھیں ۔ اَلتَّلْقِیْفُ ۔ اَلتِّلْقَافُ ۔ کھانے کو نگل لینا ۔ اَلتَّلْقِیْفُ ۔ گھوڑے یا اونٹ کا تیزی سے دوڑنے میں اگلی ٹانگوں کو تیزی سے چلانا اور پیٹ کی طرف پوری طرح نہ جانے دینا** ۔ تَلَقَّفَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کو تیزی اور پھرتی سے لینا** ۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ[ع] کے "عصا" کے متعلق ھے ۔ فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷/۱۱۷) وہ فریق مقابل کے باطل (دلائل) کو بولنی نگل گیا ۔ وہ دلیلیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں ۔ اسنے انہیں ھاتھ بڑھا کر اُچک لیا ۔ ساحرین نے جو کچھ جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا (ڈھونگ رچا رکھا تھا) اس نے اسے تیزی سے اُچک لیا ۔ ساحرین کے جھوٹ موٹ کے "سانپوں" کو موسیٰ[ع] کا "اژدھا" جھٹ سے نگل گیا ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔ *** محیط ۔

# ل ق م

اَللَّقْمُ ۔ جلدی اور تیزی سے کھانا ۔ لَقِیمَۃ ۔ اسے اپنے منہ سے کھینچا اور جھٹ سے کھا لیا ۔ اِلْتَقَمَہ ۔ اس نے اسے نگل لیا ، مہلت کے ساتھ *۔ یعنی پہلے منہ میں رکھا اور پھر نگلا ۔ اس اعتبار سے لَقِمَ اور اِلْتَقَمَ ۔ منہ میں لینے کو کہتے ہیں ***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہاتھ کے ذریعے منہ تک کھانا لے جانے کے ہیں ۔ قرآن کریم میں قصہ حضرت یونس ؑ میں ہے ۔ فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ (۳۷/۱۴۲) ۔ بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنا لیا ۔ منہ میں لے لیا ۔ لَقَمَ الطَّرِیْقَ ۔ اس نے راستہ کا منہ بند کر دیا * ۔ اَلْقَمَہُ الْحَجَرَ ۔ جھگڑے وقت حریف مقابل کو لاجواب اور خاموش کر دیا ** ۔

# لقمان

قرآن کریم نے علم و حکمت کی باتوں کے سلسلہ میں ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے جس کا نام لقمان ہے ۔ ( وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ ۔ ۔ ۔ ۳۱/۱۲) قرآن کریم نے انھیں نبی نہیں کہا ۔ نہ ہی ان کا تفصیلی تعارف کرایا ہے ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت آمیز باتیں کہی ہیں فقط ان کا ذکر کیا ہے (۳۱/۱۲-۱۹) ۔

بعض نے کہا ہے کہ آپ حضرت ایوب ؑ کے بھانجے تھے ۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داؤد ؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے ۔ بعض کا خیال ہے کہ آپ حبشی غلام تھے ۔ مستشرقین میں سے سیل کا خیال ہے کہ یہ یونانی ایساپ (Aesop) ہی ہیں ۔ ڈاکٹر (Spanger) نے کہا ہے کہ یہ ابیونہ کے الکسائی (Elxai) ہی کا دوسرا نام ہے ۔ پروفیسر ہتی (Hitti) بھی اسی خیال کا مؤید ہے ۔ تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۳۰/۱) اور طوایل بادشاہ (۳۱/۱) کی حکمت کی باتیں عرب کے لقمان کی نصائح سے ملتی جلتی ہیں ۔ اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہئے ۔

لیکن یہ سب قیاسات ہیں ۔ بعد کی تحقیق کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچا سکیگی ۔ ایک بات البتہ بالکل واضح ہے ۔ اگر لقمان ، صاحبِ وحی تھے (جس کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا ) تو حکمۃ کے معنی وحی ہونگے ۔ اور اگر وہ صاحب وحی نہ تھے ( جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے ) تو حکمۃ

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***لسان العرب ۔

کے معنی یہ ہونگے کہ وہ، وحی کے احکام کے حکیمانہ نتائج کو سمجھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ جب الحکمۃ منزل من اللہ ہو تو وہ وحی ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اور جب یہ لفظ عام انسانوں کیطرف منسوب ہو تو اس سے عام دانش اطواری مراد ہوتی ہے۔

# ل ق ی

لِقَاءٌ۔ امام رازی نے کہا ہے کہ کسی جسم کا دوسرے جسم تک اس طرح پہنچنا کہ وہ آپس میں مس کر جائیں، لِقَاءٌ کہلاتا ہے*۔ لیکن امام راغب کے نزدیک مس کرنا ضروری نہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ہونا لِقَاءٌ ہے۔ بعض کے نزدیک کسی بات کا حس اور بصر یا بصیرت سے ادراک کرلینا** (Perception)۔ یا کسی بات کا پا لینا بھی لِقَاءٌ ہے۔ تِلْقَاءٌ کے معنی ہیں۔ سامنے*۔ یَوْمُ التَّلَاقِ (۳/۱۵) کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنے کا دن۔ یعنی جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔

اِلْقَاءٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا ہیں کہ وہ دوسرے کے سامنے آجائے**۔ جوہری کے نزدیک مطلق کسی چیز کو پھینک دینے کو بھی کہتے ہیں*۔ نیز لِقَاءٌ کا لفظ جنگ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جب فوجوں کی ایک دوسرے سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) دو چیزوں کا ملنا۔ آمنے سامنے ہونا۔ (۲) کسی چیز کو ڈال دینا۔ اور (۳) ٹیڑھا پن، جس سے اَللَّقْوَۃُ ہے۔ (لیکن موخرالذکر واوی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲/۱۴)۔ جب وہ مومنین کے سامنے آتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کَلِمٰتٍ (۲/۳۷) اس میں تَلَقّٰی کے معنی قوانین خداوندی کے حصول (پالینے) کے ہیں۔ زمین کے متعلق جہاں ہے وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ (۱۵/۱۹)۔ وہاں اِلْقَاءٌ کے معنی ڈال دینا یا بنا دینا ہیں۔ ڈال دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲/۳۹) میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہرکارے کو اپنا خط دیا اور کہا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ (۲۷/۲۸) "یہ خط ان کے سامنے ڈال دے"۔ یعنی (Deliver) کر دے۔ اس کے بعد ملکۂ سبا کا قول ہے اِنِّیْٓ اُلْقِیَ اِلَیَّ کِتٰبٌ کَرِیْمٌ (۲۷/۲۹) "میری طرف ایک باعزت خط بھیجا گیا ہے۔" سورۂ نحل میں۔ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ (۱۶/۸۶) کے معنی ہیں، ان کی طرف بات ڈالنا یعنی کہنا۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

سورۂ کہف میں ہے کہ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ($\frac{۱۸}{۱۱۰}$)۔ اس کے معنی ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا کا (قانون یا) نظام ربوبیت، محسوس شکل میں اسکے سامنے آجائے تو اسے چاہئے کہ وہ (قانون خداوندی کے متعین کردہ) صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس قانون کے مطابق صرف میں لائے اور اس میں کسی اور جذبہ یا مفاد پرستی کی کشش کو شریک نہ ہونے دے۔ لہذا، لِقَاءِ رَبّ کے معنی ہیں خدا کے نظام ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ یا قانون خداوندی کی رو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا۔ نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہے۔ لِقَاءِ رَبّ سے انکار (کفر) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے عملی پہلوؤں میں قانون خداوندی کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں نکالے۔ اس کا سامنا کرنے سے کترائے اور قانون مکافات کے سامنے جواب دہی سے انکار کرے۔ واضح رہے کہ قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لئے ان معانی میں لِقَاءِ رَبّ یہاں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ جہاں تک اُس لِقَاءِ رَبّ کا تعلق ہے جس میں خدا کے قانون ربوبیت کو مشہود طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نظام کائنات پر غور کرو۔ اس میں ریسرچ کرو۔ اس کے نظم و نسق کو سمجھو۔ اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائیگا۔ (دیکھئے $\frac{۱۳}{۲}$)۔ لیکن ایسا وہی کر سکیگا جو پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود زندگی نہ سمجھ لے ($\frac{۱۰}{۱۰۸}$)۔ ایسے لوگ خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں ($\frac{۲۹}{۲۳}$)۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہئے کہ لِقَاءِ رَبّ سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے۔ یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا (خواہ اس زندگی میں ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ بعض لوگ "لِقَاءِ رب" سے متعلق آیات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آخرت میں انسان کو خدا کا دیدار ہوگا۔ یعنی وہ اور خدا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے۔ ہم اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نہ تو خدا کی ذات مادی ہے اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ حیات اخروی میں انسانی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس لئے یہ تصور کرنا کہ اس زندگی میں انسان اور خدا اسطرح آمنے سامنے

ہونگے جسطرح یہاں دو انسان ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں ، غلط ہوگا۔ اگر وہاں '' لِقَاءِ رب '' ہوگا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اسکی کیفیت کیا ہوگی۔

ہمارے ہاں عام طور پر '' بزرگوں '' کے متعلق کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کو خدا نے ان کی طرف '' اِلقا کیا ''۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس بات کا علم انہیں خدا کیطرف سے بذریعہ الہام ہوا۔ یعنی انہوں نے اپنے علم و عقل سے اسے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ علم انہیں براہ راست خدا کیطرف سے عطا ہوا۔ اسی کو الہام یا کشف کہا جاتا ہے جس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی۔ خدا کیطرف سے براہ راست علم صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب وہ علم قرآن کریم کے اندر ہے۔ اب یہ کہنا کہ کسی کو خدا کیطرف سے الہام یا القا ہوتا ہے مہر نبوت کو توڑنا ہے۔ [تفصیل اس اجمال کی (و - ح - ی) اور (ل - ھ - م) کے عنوانوں میں ملیگی]۔

واضح رہے کہ یہ جو ہم کہدیا کرتے ہیں کہ میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ فلاں کام کرو ، تو اس کا تعلق وحی ، الہام ، القا وغیرہ سے کچھ نہیں۔ یہ انسان کے نفس لاشعور (Un - Conscious Mind) کا عمل ہوتا ہے جس کے متعلق ہمارے زمانے میں تحقیقات کے نئے باب کھل رہے ہیں۔ وحی کی نوعیت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ وہ ایک یقینی علم ہوتا ہے جو خدا کیطرف سے نبی کو براہ راست ملتا تھا۔

يُلَقّٰى کے معنی توفیق دئے جانے کے بھی آتے ہیں۔ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا (۴۱/۳۵) اس (اہم کام) کی توفیق انہیں ہی ملتی ہے جو قوانین خداوندی کی استقامت سے اطاعت کرتے ہیں۔ اسے وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں۔

سورہ یونس میں ہے۔ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ (۱۰/۱۵)۔ اس کے معنی ہیں ، اپنی طرف سے۔

# لِكنَّ (حرف)

لٰكِنْ - لٰكِنَّ - '' مگر یا لیکن '' کے معنوں کے لئے آتا ہے۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى - وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۷۵/۳۱-۳۲)۔ تو وہ نہ تصدیق کرتا ہے نہ سیدھے راستے پر چلتا ہے۔ لیکن جھٹلاتا ہے اور گریز کی

راهیں نکالتا ہے ۔ ('' لیکن '' کے مقابلہ میں یہاں '' بلکہ '' ترجمہ کیا جائے تو زیادہ موزوں رہیگا لہذا) یہ '' لیکن '' اور '' بلکہ '' دونوں معنوں میں آتا ہے ۔ سورہ بقرہ کی آیت ــ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ($\frac{2}{154}$) میں اس کے معنی '' لیکن '' یا '' مگر '' کے ہیں ۔ یعنی وہ زندہ ہیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس بات کو سمجھ نہیں سکتے ۔

# لَمْ (حرف)

لَمْ ۔ یہ مضارع پر آتا ہے تو اس کے معنی ماضی منفی کے کر دیتا ہے ۔ مثلاً ۔ لَمْ يَلِدْ ($\frac{112}{3}$) ۔ اس نے نہیں جنا ۔ يَلِدْ ۔ مضارع ہے جس کے عام طور پر معنی ''جنتا ہے'' ہونگے ۔ لیکن لَمْ سے اس کے معنی ''جنا'' (ماضی) کے بھی ہو گئے اور نفی (نہیں) کے بھی ۔ یعنی ، نہیں جنا ۔

# لَمَّا

لَمَّا ۔ (۱) ''جب'' کے معنوں میں ۔ لَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ ($\frac{28}{23}$) ۔ جب وہ مدین کے پانی (گھاٹ) پر پہنچا ۔

(۲) ہنوز ''نہیں'' (اب تک نہیں) کے معنوں میں ۔ لَمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ($\frac{38}{8}$) ۔ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ۔

(۳) اِلَّا (مگر) کے معنوں میں ۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ($\frac{86}{4}$) ۔ کوئی متنفس ایسا نہیں مگر اس پر نگران موجود ہے ۔ یعنی کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس پر نگران موجود نہ ہو ۔ ہر متنفس پر نگران موجود ہے ۔

(۴) ''سب کے سب'' کے معنوں میں ۔ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ ($\frac{11}{111}$) ۔ یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا ۔

(۵) بعض اوقات زائد بھی ہوتا ہے ۔ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ($\frac{43}{35}$) ۔ اور یہ سب طبعی زندگی کا سازوسامان ہے ۔ یہاں اگر لَمَّا نہ بھی ہو تو بھی یہی معنی ہونگے ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں اِنْ نافیہ ہو اور لَمَّا بمعنی اِلَّا ۔ (جیسا کہ نمبر (۳) میں لکھا جاچکا ہے) ۔

# ل م ح

لَمَحَ اِلَيْهِ کسی کی طرف تیزی سے دیکھنا ۔ نیز عجلت کے ساتھ دیکھنا ۔ اَللَّمْحَةُ ۔ عجلت کے ساتھ دیکھنا ۔ اَلْمَحَتِ الْمَرْاَةُ میں

وَجْهِهَا ۔ عورت نے اپنے محاسن کی جھلک دکھائی پھر انہیں چھپا لیا ۔ ایسا بالعموم حسینہ اپنے عاشق کے ساتھ کرتی ہے* ۔

اَللَّمْحُ ۔ بجلی کے چمکنے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اظہار و اخفاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کے چمکنے کے ہیں ۔ لَمَحَ الْبَصَرُ ۔ نگاہ کا کسی چیز کی طرف اٹھنا*** ۔ قرآن کریم میں اَمْرُ السَّاعَةِ ۔ (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے ۔ كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (۱۶/۷۷) ۔ وہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی قریب تر ۔

# ل م ز

اَللَّمْزُ ۔ اس کے اصلی معنے آنکھ ، سر یا ہونٹوں سے اشارہ کرتے ہوئے خفیہ بات کرنا ہیں ۔ منہ پر عیب چینی کرنا ۔ بعض نے اس کے معنی غیبت کرنے کے بھی لکھے ہیں ۔ لُمَزَةٌ* اُس چغلخور کو کہتے ہیں جو جماعت میں تفریق ڈالے اور دو دوستوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکائے**** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عیب کے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹/۵۸) ۔ جو صدقات (کی تقسیم) کے معاملہ میں تیرے خلاف اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سورہ حجرات میں ہے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱) ۔ آپس میں ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو ۔ مذاق نہ اڑاؤ ۔ سورہ ھمزہ میں هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے ۔ کچوکے لگانے والے ۔ عیب تراشنے والے (تا کہ جماعت میں انتشار پیدا ہو) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوسروں کے عیوب کی تلاش کرنا ہے** ۔

# ل م س

لَمَسَ ۔ يَلْمِسُ ۔ ہاتھ سے چھونا ۔ کسی چیز کو ادھر ادھر تلاش کرنا***** ۔ سورہ جن میں ہے اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ (۷۲/۸) ۔ ہم نے آسمان کو ٹٹولا ۔ (غیب کی خبروں کے لئے قیاس آرائیاں کیں) ۔ اَلتَّلَمُّسُ ۔ کسی شے کو طلب کرنا ۔ تلاش کرنا***** ۔ ابن فارس نے ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تو کسی چیز کو ہاتھ سے چھونے کے ہیں لیکن پھر ہر متلاشی اور جستجو کرنے والے کو مُلْتَمِسٌ کہدیتے ہیں ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔ **** تاج و محیط ۔ *****تاج و راغب ۔

سورہ حدید میں ہے ۔ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷/۱۳) ۔ تم روشنی کو تلاش کرو ۔ اَلْمُلَامَسَةُ ۔ ایک دوسرے کو ہاتھ سے چھونا ۔ نیز یہ کنایةً مجامعت کے لئے بولا جاتا ہے*۔ اسی معنی میں قرآن کریم میں اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۴/۴۳) آیا ہے ۔

# ل م م

لَمَّهٗ یَلُمُّهٗ لَمًّا ۔ اس نے اسکو جمع کر دیا ۔ لَمَّ اللّٰہُ شَعَثَہٗ ۔ منتشر معاملات کو سمیٹ کر قریب قریب کر دیا ۔ دَارٌ لَمُوْمَةٌ ۔ ہمارا گھر لوگوں کو جمع کر لینے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے ۔ رَجُلٌ مِلَمٌّ ۔ قوم اور کنبہ کو جمع کر لینے والا آدمی **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے ، قریب قریب ہونے اور ملا ہوا ہونے کے ہیں ۔

سورہ فجر میں ہے ۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) ۔ تم اس مال کو جو تمہیں میراث میں ملتا ہے ، سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے ہو ؟ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت میں میراث انفرادی چیز نہیں رہتی ۔ قرآن کریم میں وراثت کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں نظام قرآنی ابھی مکمل طور پر قائم نہ ہوا ہو۔ اس نظام کی تشکیل کے بعد فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی اس لئے ترکہ میں مال اور جائداد چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ (تفصیل متعلقہ عنوانات میں دیکھئے)۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ترکہ سے مختلف وارثوں کا حق نہیں دیتے ۔ سارے کا سارا خود ہی کھا جاتے ہو ۔ اس صورت میں یہ آیت اس دور سے متعلق ہوگی جس میں میراث اور اس کی تقسیم کا ہنوز عمل جاری ہوگا ۔ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام بھی بعض حالات میں اس عمل کو جاری رکھے ۔ نیز مال و دولت اور جائداد کے علاوہ عام مستعملہ اشیاء بھی تو ترکہ میں آسکتی ہیں ۔

"قریب ہونے" کے اعتبار سے اَلَمَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ، آدمی گناہ کے قریب ہوگیا ۔ یعنی اس کا مرتکب تو نہیں ہوا ، البتہ اس نے اسکا ارادہ کر لیا تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کبھی کبھار کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن اس پر اصرار نہ کرے ۔ اِلْمَامٌ کے معنی ہیں ، کسی وقت کوئی کام کر لینا لیکن اس پر اصرار نہ کرنا ۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

مَا يَرْزُوْرُنَا اِلاَّ لِمَامًا ۔ وہ ہمارے ہاں بلاپابندی کبھی کبھار آجاتا ہے ۔ کلبی نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی بلا ارادہ غیر محرم کو دیکھ لینے کے ہیں ۔ جوہری نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں بلا ارادہ کسی معصیت کے قریب ہو جانا لیکن اس کا ارتکاب نہ کرنا ۔ "قریب ہو جانے" کے اعتبار سے لَمَمٌ کے معنی بوسہ لینے کے بھی آتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلاَّ اللَّمَمَ (۳۲/۵۳) ۔ وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں ، بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہو جائیں ۔ ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں لیکن معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں ۔ اس لئے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہئے کہ بار بار ایسا نہ ہو ۔ غور کیجئے قرآن ، نفسیاتی اصلاح کے لئے کسقدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے ۔ ایک دم سختی نہیں کر دیتا ۔

(لَمْ ۔ لَمَّا ۔ حروف ہیں ۔ انہیں انکے عنوانات کے تحت دیکھئے) ۔

# لَنْ (حرف)

لَنْ ۔ یہ مضارع پر آتا ہے تو (۱) اسے مستقبل کے معنی دیتا ہے ۔ (۲) نفی (نہیں) کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور (۳) اس نفی میں شدت پیدا کرتا ہے ۔ جیسے لَنْ تَفْعَلُوْا (۲۴/۲) تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے ۔

# ل ھ ب

لَهَبٌ ۔ آگ کا شعلہ ۔ لَهِيْبٌ ۔ اس شعلہ کی حرارت ۔ اَلْهَبَ النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بھڑکایا ۔ فَالْتَهَبَتْ ۔ پس وہ بھڑک اٹھی * ۔ نیز دھوئیں کی طرح اوپر اڑنے والے غبار کو بھی لَهَبٌ کہتے ہیں * ۔ راغب نے لَهَبٌ کے معنی دھواں بھی لکھے ہیں ** ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۳۱/۷۷) ۔ وہ آگ کے شعلے سے نہیں بچا سکتا ۔ سورہ لہب میں اَبِيْ لَهَبٍ (۱/۱۱۱) آیا ہے ۔ جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳/۱۱۱) میں داخل ہوگا ۔ ابی لہب ، نبی اکرم کے چچا (عبدالعزی بن عبدالمطلب) کی کنیت تھی ، غالباً اسکی شعلہ مزاجی کی وجہ سے ۔ وہ اسلام کا سخت مخالف تھا ۔ وہ بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض میں مر گیا ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر

---

*تاج ۔ **راغب

خصوصیت سے کیا ہے، اس لئے کہ وہ ایک خاص ٹائپ کے لوگوں کا ترجمان تھا۔ کعبہ کا متولی، جسے معلوم تھا کہ اسلام کی کامیابی سے اسکی عیش سامانیاں سب چھن جائینگی، کیونکہ اسلام پیشوایت کا سخت دشمن تھا۔ بد دیانت ایسا (جیسا کہ عام طور پر وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کریں) کہ کعبہ کے اندر سے سونے کا ایک ہرن (جو وہاں چڑھاوا چڑھا ہوگا) چرا لیا۔ بزدل ایسا (جیسا کہ کام نہ کرنے والا طبقہ ہو جاتا ہے) کہ بدر کی جنگ میں جس میں قریش کے قریب قریب تمام سردار شامل تھے، یہ شریک نہ ہوا اور اپنی طرف سے ایک ایسے شخص کو مرنے کے لئے بھیج دیا جو اس کا مقروض تھا۔ بخیل بے حد تھا۔ چنانچہ جب مرا ہے تو خود اس کے اپنے عزیز اس کی لاش کے قریب تک نہیں آئے اور حبشیوں سے اٹھوا کر اسے دفن کرایا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ رسول اللہؐ کی قرابت داری اس کے کسی کام نہ آسکی۔ کیونکہ اسلام میں قرب کا معیار ایمان ہے، نہ کہ رشتہ داری۔

اس قسم کے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۔ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ($\frac{111}{1-2}$)۔

# ل ھ ث

اَللَّهَاثُ ۔ اَللَّهَثُ ۔ پیاس ۔ اَللُّهَاثُ ۔ پیاس کی گرمی کی شدت ۔ پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا ۔ ہانپنا ۔ تھک جانا ۔ درماندہ ہو جانا*۔ راغب نے کہا ہے کہ لَهَثَ کے معنی پیاس سے زبان لٹکانے، تھکنے اور پیاس کے ہیں**۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تھکن سے سانس کا پھولنا لَهَثَ کہلاتا ہے۔

لَهَثَ الْكَلْبُ ۔ کتے کا زبان باہر نکال کر ہانپنا*** ($\frac{7}{176}$)

# ل ھ م

لَهِمَهُ يَلْهَمُهُ ۔ لَهْمًا ۔ کسی چیز کو یکبارگی نگل لینا ۔ رَجُلٌ لَهِيمٌ ۔ بہت کھانے والا آدمی****۔ أَلْهَمَهُ الشَّيْءَ ۔ اس نے اسے کوئی چیز نگلوا دی ۔ اسی سے اِلْهَامٌ ہے*****۔

قرآن کریم میں نفس انسانی کے متعلق ہے ۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ($\frac{91}{8}$)۔ اس کے عام طور پر یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ اللہ نے انسان

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۱۸۳ ۔ ****تاج و راغب ۔ *****محیط ۔

کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی ، خیر اور شر ، حق اور باطل کی تمیز کی استعداد رکھدی ہے ۔ یہ معنی بوجوہ غلط ہیں ۔ کائنات میں انسان کے علاوہ ، ہر شے کو بطور جبلت ( Instinct ) اس راستے کی راہ نمائی عطا کر دی گئی ہے جس پر اسے چلنا ہے ۔ پانی کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے ۔ بکری کی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرہیز کرے ۔ اگر اسی طرح انسان کے اندر بھی خیر و شر کی تمیز رکھدی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستے پر چلتا ۔ (جسطرح ہر بکری گھاس ہی کھاتی ہے)۔ اور اس میں اس کے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی نہیں ۔ ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر داخل نہیں کی گئی ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تمیز انسان کی فطرت کے اندر تو ہے لیکن ماحول اور تعلیم کا اثر اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے اس کے ماں باپ یا معاشرہ بنا دے ۔ اگرانسان پر یہ خارجی اثرات نہ ہوتے تو ہر بچہ حق کے راستے پر از خود چلتا ۔ یہ بھی غلط ہے ۔ ایسے بچے پائے گئے ہیں جو پیدائش کے ساتھ ہی (کسی حادثے کی وجہ سے) انسانوں کی بستیوں سے الگ ہو کر جنگل میں چلے گئے اور وہاں ان کی پرورش انسانی اثرات سے یکسر دور رہ کر ہوئی ۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو بالکل جانور تھے ۔ حق و باطل کی تمیز تو ایک طرف ، ان میں کھانے پینے کے معاملہ میں بھی انسانی بچوں کی سی تمیز نہ تھی ۔ لہذا یہ تصور صحیح نہیں کہ خیر و شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھدی گئی ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لفظ فِطْرَت" عنوان ف ۔ ط ۔ ر ۔ میں)

اس آیت ($\frac{91}{8}$) کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھدی گئی ہیں جن سے انسانی ذات (Personality) ٹکڑے ٹکڑے ( Disintegrate ) ہو جاتی ہے ۔ (فُجُوْرَھَا ۔ دیکھئے عنوان ف ۔ ج ۔ ر ) اور وہ قوتیں بھی جن کی رو سے یہ اس انتشار (Disintegration) سے محفوظ رہ سکتی ہے ۔(تَقْوٰھَا۔ دیکھئے عنوان و ۔ ق ۔ ی)۔ فُجُوْرَھَا اور تَقْوٰھَا کی "ھا" خود، اسکی دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں "نفس" کی کیفیات ہیں ۔ اس لئے اس کے معنی یہی ہیں کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ ہر دو ممکنات رکھ دئے گئے ہیں ۔ اس کے بعد ، یہ انسان

کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں (Latent Faculties) کو نشو نما دیکر انہیں کس راستے میں صرف کرتا ہے ۔ وہ انسے اپنی ذات کی نشو نما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب اور تدسیہ کا ۔ (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰)) ۔

باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کیطرف سے الہام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ قرآن کریم کی رو سے ، علم کے سر چشمے دو ہی ہیں ۔ ایک وحی ۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا ۔ یہ حضرات انبیاء کرام ؑ کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے ساتھ اسکا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ۔ دوسرا ، عقل انسانی (Human Intellect)۔ اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے ۔ لہذا ، ختم نبوت کے بعد ، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں ۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم ، جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ اور دوسرے عقل انسانی ۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے رو سے کیا جائے ۔ بنابریں، یہ تصور کہ رسول اللہ ؐ کے بعد ، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اسکی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ نہ ہی کشف ، الہام ، وحی خفی ، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہ ؐ کے زمانہ میں ملتا ہے ۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی ۔ (دیکھئے عنوان و ۔ ح ۔ ی) ۔

انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop) کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقل عامہ کی رو سے مستبعد ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں خوارق عادات یا کرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں ، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں ، اسے صاحب کشف و الہام قرار دیتے ہیں، اور ''روحانی قوتوں'' کا مالک ۔ لیکن ان باتوں کو ''روحانیت'' (یا دین) سے کوئی تعلق نہیں ۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، یہ محض قوت ارادی کی نشو و نما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلا تمیز مذہب و ملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں ، اسے بطور فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے ۔

اسے پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاھئے کہ خدا سے براہ راست علم، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ھے جو حضرات انبیاء کرام[ؑ] سے مخصوص ھے۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ھو چکا ھے اس لئے اب کسی شخص کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ھو سکتا۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاھئے۔ اور نہ ھی یہ عقیدہ رکھنا چاھئے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ھے۔

# ل ھ و

لَهْوٌ اور لَعِبٌ۔ دونوں ھم معنی الفاظ ھیں (دیکھئے عنوان ل۔ع۔ب) لیکن علمائے لغت نے ان میں فرق کیا ھے۔ وہ کہتے ھیں کہ ان دونوں میں یہ چیز مشترک ھے کہ انسان بے سود اور بے معنی باتوں میں مشغول ھوتا ھے اور جذباتی اور عارضی مسرت کے پیچھے پڑتا ھے۔ لیکن لَهْوٌ کا لفظ لَعِبٌ سے عام ھے۔ بعض لوگوں نے کہا ھے کہ لَعِبٌ سے مراد ھے جلدی سے مسرت حاصل کرنا اور اس سے دل کو راحت و آرام پہنچانا اور لَهْوٌ سے مقصود ھے خواھشات اور طرب جو انسان کی توجہ اور فکر کو مصروف کر دیں۔ اس کے برعکس طرسوسی کا کہنا ھے کہ لَهْوٌ اس لذت کو کہتے ھیں جو ناپائدار ھو یا وہ لذت جو انسان کی توجہ اھم کاموں سے ھٹا کر غیر اھم کاموں کی طرف منعطف کر دے۔ یا ایسے کاموں کو کہتے ھیں جن کی کوئی صحیح غرض نہ ھو*۔ راغب نے بھی یہی کہا ھے کہ لَهْوٌ سے مراد ایسے امور ھیں جو انسان کو اھم کاموں سے باز رکھیں**۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں (۱) کسی چیز کے ذریعہ دوسری چیز سے توجہ کا ھٹ جانا (۲) کسی چیز کو ھاتھ سے چھوڑ دینا۔

قرآن کریم نے کہا ھے کہ انسان کی زندگی ایک عظیم مقصد لئے ھوئے ھے اس لئے اسے بڑی سنجیدگی سے (Seriously) لینا چاھئے۔ لہذا ھر وہ کام جس سے یونہی بیش پا افتادہ مفاد یا ناپائدار مسرت تو حاصل ھو جائے لیکن زندگی کا اصل مقصود نگاھوں سے گم ھو جائے، لَهْوٌ اور لَعِبٌ میں داخل ھے۔ اسی لئے قرآن کریم نے الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ یعنی فوری عیش اور مفادات عاجلہ کی زندگی (یا محض حیوانی سطح پر طبعی زندگی) کو لَعِبٌ ولَهْوٌ کہا ھے (۴۷/۳۶)۔ واضح رھے کہ قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بھی بڑی اھمیت دیتا ھے۔ وہ جس بات کو لَهْوٌ وَلَعِبٌ قرار دیتا ھے وہ یہ

*تاج۔ **راغب۔

نظریہ ہے کہ انسان زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر عارضی طرب انگیزیوں کے پیچھے پڑ جائے۔ یعنی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھے۔ اسے بلند انسانی سطح پر نہ لے جائے۔ انہی باتوں کو اس نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ (۳۱/۶) کہا ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں اَلْحَدِيْثُ کے معنی قرآن کریم لئے جائیں تو لَهْوَ الْحَدِيْثِ کے معنی ہونگے ایسی باتیں جو انسان کو قرآن کریم سے غافل کر دیں۔

اس زاویہ نگاہ کو جس کی رو سے انسان زندگی کے اہم حقائق کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لے لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (۲۱/۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی سے اَلْهٰى کے معنی ہیں، مصروف رکھنا۔ مشغول کر دینا۔ مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کرکے دوسری باتوں میں لگا دینا۔ قرآن کریم میں ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)۔ ''تکاثر'' نے زندگی کے اہم مقاصد کو تمہاری نظروں سے اوجھل کرکے تمہیں اور ہی طرف لگا رکھا ہے اور تم اسی روش پر چلے جاتے ہو تاآنکہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔ تَكَاثُرٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھ جانے کی ہوس۔ غور کیجئے، قرآن کریم نے کسطرح دو لفظوں میں انسان کی پوری تگ و تاز اور نوع انسانی کی تاریخ کی داستان کا نقشہ کھینچ کر رکھدیا ہے۔ آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لئے ان کی اور انکی اولاد کی ضروریات زندگی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھینگے کہ وہ دولت سمیٹنے کے لئے دیوانہ وار سارے مارے پھر رہے ہونگے۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ محض دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لئے۔ یہی جذبہ دنیا میں ساری تباہیوں کا موجب ہے۔ افراد کے لئے بھی اور اقوام کے لئے بھی۔ مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھ جانے) کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ قرآن کریم بھی اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ (۲/۱۴۸)۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے تو ان کاموں میں بڑھو جن میں نوع انسانی کی وسعتوں اور بھلائیوں کا راز پوشیدہ ہو۔

تَلَهّٰى عَنْهُ۔ کسی سے بے رخی برتنا۔ توجہ کو اسکی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کر لینا (۸۰/۱۰)۔ اَللَّهْوُ وَاللَّهْوَةُ۔ وہ عورت جس سے لَهْوٌ اور دلبستگی کا کام لیا جائے۔ پھر لَهْوٌ مجازاً عورت کو کہنے لگے *۔

*تاج۔

چنانچہ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ سورہ انبیاء میں جو ہے لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا (۲۱/۱۷) - تو اس میں لَهْوًا سے مراد عورت ہے *- (لیکن یہ تکلف ہے - وہاں بھی لَهْوًا کے معنی بے مقصد و بے حقیقت شے کے ہیں) - ابن قتیبہ نے لَهْوٌ کے معنی بیٹا ، عورت اور نکاح کے لکھے ہیں** - راغب نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس سے عورت یا بیٹا مراد لیا ہے انہوں نے اس لفظ کی عمومیت کو بعض چیزوں میں مخصوص کر دیا ہے -

(لَهْوٌ کے ساتھ ل - ع - ب کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ پوری حقیقت بیک وقت سامنے آجائے)

# لَوْ (حرف)

لَوْ - (۱) اِنْ (اگر) کے معنوں میں - فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶/۱۰۲) - سو اگر ہمیں ایک بار لوٹ کر جانے کی مہلت مل جائے تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں - واضح رہے کہ لَوْ بالعموم ایسے امور کے لئے آتا ہے جن کا وقوع میں آنا ممکن نہ ہو - یعنی محض فرضی طور پر ایسا کہا جائے - جیسا کہ اوپر کی آیت میں آیا ہے - یعنی ان کا لوٹ آنا ممکنات میں سے نہیں - اس کا ترجمہ ”بفرض محال“ کیا جائے تو بہتر ہوگا -

(۲) ”اگر“ کے ساتھ - ”اے کاش“ (تمنا) کے معنوں میں - مندرجہ بالا مثال میں بھی تمنا پائی جاتی ہے - ”اے کاش اگر کہیں ایسا ہو جائے تو“- جیسے لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۱۵/۲) -

(۳) أَنْ (کہ) کے مفہوم میں - وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا (۲/۱۰۹) - اہل کتاب میں سے اکثر وہ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنا دیں - (اگرچہ یہاں کاش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے) -

(۴) لَوْ کے ساتھ لائیے نفی بھی آتا ہے - لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴/۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے -

(۵) ”کیوں نہیں“ کے معنوں میں - لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ (۶/۸) اسکی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا -

*تاج - **القرطبی ج/۲ صفحہ ۱۹ -

(۶) لَوْلَا - نہیں کے معنوں میں - فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ . . . . (۹۸/۱۰) - ایسی کوئی بستی نہ ہوئی . . . . . . . . . . .

(۷) بعض اوقات - لَوْلَا کی بجائے لَوْمَا بھی آتا ہے - لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۷/۱۵) - اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا ؟

# ل و ح

اس مادہ کے اہم بنیادی معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں - اَلَاحَ الْبَرْقُ - بجلی چمکی (ابن فارس) - اَللَّوْحُ - ہر پھیلی ہوئی ، چوڑی لکڑی یا ہڈی - جمع اَلْوَاحٌ* - سورۃ اعراف میں ہے وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً (۱۴۵/۷) - ہم نے تمام امور کے اخلاق اقدار ، موسیٰ[ع] کے لئے تورات میں فرض قرار دے دیئے ، جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی - یا ہم نے انہیں موسیٰ کے لئے تختیوں میں جمع کر دیا تھا - حضرت نوح[ع] کی کشتی کو ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (۱۳/۵۴) کہا گیا ہے - یعنی جو تختوں اور کیلوں سے بنائی گئی تھی -

قرآن کریم کے متعلق ہے - فِىْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۲/۸۵) - اسی کو دوسری جگہ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ (۷۸/۵۶) کہا گیا ہے - اس سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا اور تغیر سے مصؤن ہے - یہ کتاب (قرآن) علم خداوندی ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہمارے پاس (کتابی شکل میں) بھی محفوظ ہے -

اَللَّوْحُ کے معنی چمکنا نیز دیکھنا بھی ہیں - لَاحَهٗ بِبَصَرِهٖ لَوْحَةً - اُس نے اُسے دیکھا پھر وہ چیز چھپ گئی ، یعنی اس کی ایک جھلک دیکھی - نیز اس کے معنی پیاس کے بھی ہیں* - لَوَّحَهٗ بِالنَّارِ تَلْوِيْحًا - اس کو آگ میں تپایا - یہیں سے لَوَّاحٌ کے معنی ہیں جلا اور جھلسا کر رنگ متغیر کر دینے والا* - قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کے متعلق ہے - لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۲۹/۷۴) - چمڑے کو جھلسا کر اس کا رنگ بدل دینے والی - ابن فارس نے کہا ہے کہ لَوَّحَهُ الْحَرُّ کے معنی ہیں گرمی نے اُسے جلا دیا اور سیاہ کر دیا حتکہ وہ دور سے نظر آنے لگ گیا - لَوَّحَ الرَّجُلُ تَلْوِيْحًا - اُس آدمی نے دور سے اشارہ کیا** - اَلَاحَ الْبَرْقُ - بجلی کوندی - لَاحَ النَّجْمُ

*تاج - **محیط -

ستارہ چمکا*۔ لہذا لَوْحٌ میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ہے ۔ ہر آسمانی کتاب میں روشنی اور چمک ہوتی ہے ۔ قرآن کریم کو (۴/۱۷۵) اور تورات کو (۶/۹۲) میں نور کہا گیا ہے ۔

# ل و ذ

اَللَّوْذُ بِالشَّیْءِ ۔ کسی چیز کے پیچھے چھپ جانا اور اس طرح محفوظ ہو جانا ۔ اَللَّوْذُ ۔ پہاڑ کا کنارہ ۔ وادی کا موڑ ۔ اَلْمَلَاذُ ۔ جائے پناہ ۔ قلعہ ۔ اَلْمُلَاوَذَۃُ وَ اللِّوَاذُ ۔ ایک دوسرے کی آڑ لینا ، چھپنا اور ایک دوسرے کی آڑ میں آنا ۔ کترانا اور چال چلنا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا (۲۴/۶۳)۔ جو تم میں سے چپکے چپکے کھسک کر نکل جاتے ہیں ۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی مخالفت کرنے کے ہیں اور اس پر آیت کے اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں* ۔ لیکن پہلے معنوں میں بھی عدول حکمی کا مفہوم واضح ہے ، کیونکہ چپکے چپکے وہی کھسکتے ہیں جو تعمیل حکم نہیں کرنا چاہتے ۔

# لـوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ ، حضرت لوطؑ ، اول الذکر کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین کیطرف تشریف لے آئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی شرف نبوت سے سرفراز فرمایا اور سدوم کی طرف جانے کے لئے حکم دیا ۔ یمن سے بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے قدیمی تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز اور مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے ۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی ۔ قیاس ہے کہ یہ علاقہ بحر میت ( Dead Sea ) کے قریب تھا ۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا ۔ جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اس علاقہ میں آباد تھی ۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم میں آپ سے پہلے اور رسول بھی آچکے تھے اور حضرت لوطؑ ان میں اتنا لمبا عرصہ رہے کہ انہیں ان کا بھائی بند (اَخُوْھُمْ) کہکر پکارا گیا (۲۶/۱۶۰) ۔

یہ قوم (لواطت کی) شرمناک فحاشی میں مبتلا تھی (۲۶/۱۶۵) ۔ اس کے علاوہ ، وہ ''قطع السبیل'' ۔ رہزنی اور قزاقی کے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی تھی ۔ (۲۹/۲۹)

*تاج و راغب ۔

آپ نے انہیں ان اعمال شنیعہ سے رکنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ منی ۔ اور وہ تباہ ہوگئی ۔

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا ۔ جب یہ پہاڑ پھٹتے ہیں تو ان کے دھانے سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برسنے لگ جاتا ہے جس کی بوچھار دور دور تک جاتی ہے ۔ قوم لوط[ؑ] کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں سے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی ۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اُٹھی ۔ پھر ایسے زلزلے آئے جن سے زمین نیچے دھنس گئی اور بحر میت کا پانی اوپر چڑھ آیا ۔ قرآن کریم نے ان تفاصیل کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے ۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ( ۷/۸۴ )۔ ''ہم نے ان پر سخت مینہ برسایا''۔ دوسری جگہ ہے اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ( ۱۱/۸۲ )۔ ''ہم نے اس قوم پر آگ میں پکے ہوئے پتھروں کا مینہ برسایا''۔ سورۃ حجر میں ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ ( ۱۵/۷۳ )۔ ''ایک ہولناک آواز نے انہیں آلیا''۔ سورۃ قمر میں ہے اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا ( ۵۴/۳۴ )۔ ''ہم نے ان پر سنگ باری کا طوفان بھیجا''۔

(طبعی حوادث کس طرح خدا کا عذاب بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں حضرت نوح[ؑ] کا عنوان ملاحظہ کیجئے )۔

ویسے لَاطَ الشَّيْءُ بِقَلْبِيْ کے معنی ہیں '' وہ چیز میرے دل کے ساتھ چمٹ گئی''*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔

## ل و م

لَامَ ۔ ملامت کرنا ۔ کسی کو بہت زیادہ برا بھلا کہنا **۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْا اَنْفُسَكُمْ (۱۴/۲۲) ۔ تم مجھے ملامت نہ کرو ۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو ۔

لَوْمَةٌ ۔ ملامت ۔ لَائِمٌ ۔ ملامت کرنے والا ۔ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵/۵۴) ۔ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے ۔ لَوَّامٌ ۔ وہ جو بہت زیادہ ملامت کرے ۔ مَلُوْمٌ ۔ ملامت کیا ہوا (۵۱/۵۴) ۔ مُلِيْمٌ ۔ قابل ملامت (۳۷/۱۴۲) ۔ يَتَلَاوَمُوْنَ (۶۸/۳۰) ۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

لَوْمَةٌ انتظار کو کہتے ہیں * ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی عتاب اور ملامت اور (۲) دیر کرنے کے لکھے ہیں ۔

قرآن کریم میں اَلنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ آیا ہے (۷۵/۲) ۔ اسکے تفصیلی مفہوم کے لئے (ن ۔ ف ۔ س) کا عنوان دیکھئے ۔ یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے از خود یہ بتا دے کہ فلاں بات حق اور فلاں باطل ہے ۔ اسکی راہ نمائی ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہے ۔ (دیکھئے عنوان ل ۔ ھ ۔ م) ۔ البتہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ہے کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتا ہے اس کے ارتکاب پر وہ اسے ملامت کرتی ہے ۔ اسی کو ضمیر یا (Conscience) کہا جاتا ہے ۔ لہذا ضمیر کی آواز حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتی ۔ وہ اسبات کی تائید کریگی جسے آپ اچھا سمجھتے ہیں اور اس پر ملامت کریگی جسے آپ برا سمجھتے ہیں ۔ وہ جینی کے بچے کو گوشت کھانے کے ارادہ پر ملامت کریگی لیکن مسلمان کے بچے کو گوشت کھانے پر آمادہ کریگی ۔ اس لئے ضمیر کی آواز حق و باطل کا معیار نہیں قرار پا سکے گی ۔ ” فتوی “ ہمیشہ وحی سے لینا چاہئے ، نہ کہ اپنے دل سے ۔ ٹھگوں کا دل انہیں کبھی مسافر کشی پر ملامت نہیں کرتا ۔ ڈاکو کا دل اسے رہزنی پر کبھی نہیں ٹوکتا ۔ عصر حاضر کے مہذب ٹھگوں اور ڈاکوؤں (بالا دست اقوام کے ” محب الوطنوں “) کا دل انہیں کبھی اس پر ملامت نہیں کرتا کہ وہ کمزور اقوام کے خون کو اپنی قوم کے محلات کی آرائش کا موجب نہ بنائیں ۔ لہذا غلط اور صحیح کا فیصلہ خدا کی وحی کر سکتی ہے ، انسان کا دل نہیں ۔

# ل و ن

اَللَّوْنُ ۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کردے ۔ نوع ۔ صنف ۔ قسم * ۔ لیکن چونکہ مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ہوتا ہے اسلئے لَوْنٌ کے معنی رنگ کے ہو گئے ۔

اِلْوَنَّ ۔ رنگدار ہوگیا ۔ اَلْمُتَلَوِّنُ ۔ وہ جو ایک حالت پر قائم نہ رہے ۔ رنگ بدلتا رہے * ۔

قرآن کریم نے اختلاف السنہ (زبانوں) اور اَلْوَانٌ (رنگوں) کو صاحبانِ علم و بصیرت کے لئے ادراک حقیقت کی نشانیاں قرار دیا ہے (۳۰/۲۲) ۔ اس میں رنگ (اَلْوَانٌ) سے مراد نسلیں (Races) ہیں جن سے متعلق تحقیق ،

*تاج ۔

علم الانسان کا بہت بڑا شعبہ ہے ۔ لیکن اگر اَلْوَانٌ کے معنی عام رنگ (Colours) لئے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے ۔ دور حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو اس کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں (Colours) کو پہچانتی تھی ۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہو، اتنی ہی بلند اسکی ذہنی سطح ہوگی ۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشو و نما سے خاص تعلق ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر (Bucke) کی کتاب (Cosmic Consciousness)

سورہ نحل میں ہے وَمَاذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۔ (۱۶/۱۳) اس کے معنی انواع و اقسام کے ہیں ۔

# ل و ی

لَوَىٰ الْحَبْلَ يَلْوِيْهِ لَيًّا ۔ رسّی کو بٹنا اور دوھرا کر دینا ۔ لَوَىٰ بِرَأْسِهٖ ۔ اس نے اپنا سر پھیر لیا ۔ یعنی اعراض کیا[1] * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو موڑ دینے کے ہیں (۵/۱۳) ۔ لَوَىٰ لِسَانَهٗ بِكَذَا ۔ کنایہ ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو باتیں بنانے سے ** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ يَلْوُوْنَ أَلْسِنَتَهُمْ (۳/۷۷) ۔ اور لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) ۔ اس سے بھی مطلب ہے ۔ یعنی زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کرنا ۔ جھوٹ بولنا ۔ افترا پردازی کرنا ۔

# ل ی ت

لَاتَهٗ ۔ يَلِيْتُهٗ عَنْ كَذَا ۔ اسے کسی چیز سے پھیرا ، موڑا ۔ لَاتَهٗ وَ أَلَاتَهٗ ۔ اسے کم کیا ۔ اس کا پورا حق نہ دیا ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَللِّيْتُ گردن کے ایک پہلو کو کہتے ہیں ۔ اور اَللَّيْتُ ۔ کم کردینے کو ۔ اور یہ کہ ان دونوں معانی میں کوئی قیاس نہیں چلتا ۔ سورۃ حجرات میں ہے لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹/۱۴) ۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہیں کریگا ۔ سورۃ طور میں ہے وَمَا أَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۵۲/۲۱) ۔ اس کے معنی بھی کمی کرنے کے ہیں ۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ أَلَتَ سے ہے اور لَاتَ اور أَلَتَ کے ایک ہی معنی ہیں ۔ بعض نے اسے وَلَتَ سے کہا ہے ۔ چنانچہ اسے وہاں بھی لکھ دیا گیا ہے) ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

[1] (مزید) لَوَىٰ رَأْسَهٗ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں لَوَىٰ سے زیادہ شدت ومبالغہ پایا جاتا ہے ۔

# لَیْتَ (حرف)

لَیْتَ ۔ اے کاش (یہ حرف تمنا ہے) ۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا (۱۹/۲۳) ۔ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی ۔ ۔ ۔ ۔

# لَیْسَ

لَیْسَ ۔ نہیں کے معنوں میں آتا ہے ۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۷۷) ۔ یہ کشادگی کی راہ نہیں ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

اس فعل سے صرف ماضی کی شکلیں استعمال ہوتی ہیں ۔ مثلاً لَسْتَ ۔ لَسْتُ ۔ لَیْسُوْا ۔ لَسْتُمْ ۔ لَسْتُنَّ ۔ وغیرہ ۔

# ل ی ل

اَللَّیْلُ وَاللَّیْلَۃُ ۔ رات ، جو غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک یا طلوع آفتاب تک ہوتی ہے * ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عبرانی میں رات کو لَیْل کہتے ہیں اور سریانی میں لِلْیَا ** ۔ لَیْلٌ کی جمع لَیَالٍ اور اللَّیَالِیْ آتی ہے ۔

سورہ مریم میں حضرت زکریا کے متعلق ہے ۔ لَا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (۱۹/۱۰) ۔ اس کے معنی تین راتیں نہیں بلکہ تین شب و روز ہیں (متواتر تین دن تک جن میں راتیں بھی شامل ہیں) ۔ اس لئے کہ (۳/۴۰) میں اسے ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ کہا گیا ہے ۔ لیکن ان دونوں آیات کے مضمون میں ذرا سا باریک فرق بھی ہے ۔ (۳/۴۰) میں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۔ اور (۱۹/۱۰) میں اِلَّا رَمْزًا نہیں ہے ۔ اس لئے دنوں کے لئے حکم الگ تھا اور راتوں کے لئے الگ ۔

سورہ ابراہیم میں نزول قرآن کریم کا مقصد بتایا گیا ہے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴/۱) ۔ تاکہ تو نوع انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے ۔ یعنی نزول قرآن کے وقت نوع انسانی تاریکی میں تھی ، قرآن کریم کی راہ نمائی انہیں روشنی میں لے آئی ۔ اس جہت سے ، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن کریم دنیا کو ملا ، لَیْلٌ کہہ کر پکارا ہے ۔ یعنی وہ زمانہ جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ روشنی کا

* تاج ۔ ** محیط ۔

کہیں نشان تک نہیں تھا - اس دور میں قرآن کریم نازل ہوا جس نے دنیا کو نئی اقدار سے روشناس کرایا - تاریکی میں انسان کے لئے (حقیقی یا محض خیالی) خطرات بھی ہوتے ہیں - روشنی کی وجہ سے یہ خطرات سلامتی میں تبدیل ہو گئے - پھر، اس روشنی کی تکمیل اسطرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا - هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) - ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی - اسطرح یہ تاریک دور، قرآن کریم کی روشنی کی وجہ سے نوع انسان کے لئے سلامتی اور برکات کا دور بن گیا (۳/۴) -

# ل ی ن

لَانَ الشَّیْءُ - چیز نرم ہوئی - اَلَنْتُهٗ - میں نے اسے نرم کر دیا *- اللِّیْنُ - نرم - قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے لِنْتَ لَهُمْ (۳/۱۵۸) - تو ان کے لئے نرم واقع ہوا ہے - یعنی فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ نہیں (۳/۱۵۸) - (دیکھئے عنوان ف - ظ - ظ اور غ - ل - ظ) - لیکن یہ لینت ان کے لئے تھی جو حق وصداقت کے سامنے جھک کر حضورؐ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے - جو لوگ حق کی مخالفت میں نبردآزما تھے ان کے مقابلہ میں حضورؐ اور آپ کے ساتھی "اشداء" تھے (۴۸/۲۹) -

حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے - وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ (۳۴/۱۰) - ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا - یعنی اسے، لوہا گلا کر یا تپا کر، اسلحہ سازی وغیرہ کی صنعت کا علم دیدیا - سورہ طٰہٰ میں ہے - فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا (۲۰/۴۴) - تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا -

اَللِّیْنَةُ - کھجور کا درخت *- تاج نے تصریح کی ہے کہ یہ اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جو دو اعلیٰ قسم کی کھجوروں کے علاوہ ہو (۵۹/۵) - بیشتر اہل لغت نے اسے (ل - و - ن) میں دیا ہے -

---

*تاج و محیط-

# م

## مَا

مَا ۔ (۱) جو کچھ ۔ ( اَلَّذِی ) کے معنوں میں ۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ ( ۱۶/۹۶ ) ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا ۔

(۲) مَنْ ( جو ۔ جس ) کے معنوں میں ۔ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ ...... ( ۴/۲۲ ) ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو ۔

(۳) ''کیا چیز ۔ کونسی چیز ۔ کس چیز'' کے معنوں میں (استفہامیہ) ۔ وَمَا تِلْكَ ...... ( ۲۰/۱۷ ) ۔ اور یہ کیا چیز ہے ۔

(۴) شرط کے معنوں میں ۔ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ( ۹/۷ ) ۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہو ۔

(۵) تعجب (کیسے) کے معنوں میں ۔ فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ( ۲/۱۷۵ ) ۔ سو ان کا تباہ کن روش پر قائم رہنا کیسا تعجب انگیز ہے ۔ دراصل یہ پورا مرکب اظہار تعجب کے لئے بولا جاتا ہے (اکیلا مَا نہیں بلکہ مَا اَفْعَلَ کے وزن پر) ۔

(۶) ''جہاں تک'' کے معنوں میں ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ( ۶۴/۱۶ ) ۔ جہاں تک تمہاری استطاعت میں ہو قانون خداوندی کی نگہداشت کرو ۔

(۷) لَيْسَ ( نہیں ) کے معنوں میں ۔ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ ( ۲/۱۶ ) ۔ سو ان کی تجارت فائدہ مند ثابت نہ ہوئی ۔

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ( ۷/۱۰ ) ۔ تم میں سے بہت کم شکر گذار ہوتے ہیں ۔ اگرچہ یہاں مَا (اَلَّذِی) کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے ۔

(نوٹ) ۔ کبھی مَا کی جگہ صرف مَ ھی آجاتا ہے ۔ جیسے بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ( ۲۷/۳۵ ) ''قاصد (جواب میں) کس چیز کے ساتھ واپس آتے ہیں'' ۔

(۹) مَاذَا - ''کیا'' (استفہامیہ) کے معنوں میں - یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (۲/۲۱۵) - تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا (یا کسقدر) کھلا رکھیں؟ مَا + ذَا - مَا استفہامیہ اور ذَا بمعنی موصول ہے - اور دونوں کا مرکب استفہام کا مفہوم دیتا ہے - یہ وہی ہے جو اوپر (۳) میں گذر چکا ہے - صرف اس کے آگے ذَا بڑھایا گیا ہے -

## م أ ی

مَأَیَ فِیْہِ - مبالغہ کیا اور تعمق سے کام لیا - اَلْمِائَۃُ - ایک سو - زمخشری نے کہا ہے کہ یہ مَأَیْتُ الْجِلْدَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے کھال کو پھیلایا - اور سو (۱۰۰) بھی ایک بڑی اور وسیع تعداد ہوتی ہے -

مِائَۃَ عَامٍ (۲/۲۵۹) - ایک سو سال -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ''سو'' بھی ہیں اور قوم میں فساد ڈالنا بھی ہیں - ہمارا خیال ہے کہ سو (۱۰۰) کو اَلْمِائَۃُ شاید اس لئے کہتے ہوں کہ اس سادگی کے دور میں جس شخص کے پاس سو تک درہم و دینار یا اونٹ وغیرہ ہوتے ہونگے وہ (سرمایہ داروں کی طرح) قوم میں فساد کا موجب بن جاتا ہوگا - ہمارے ہاں بھی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس سو روپے ہوں وہ ایک قتل کے لئے بیباک ہوجاتا ہے -

## مَأْجُوْج

دیکھئے یَاْجُوْجُ - عنوان (ا - ج - ج) -

## ماروت

اَلْمَرْتُ - وہ لق و دق صحراء جس میں کسی قسم کی سرسبزی نہ ہو - اَلْهَرْتُ وَ الْمَرْتُ - توڑنا* -

مَارُوْتُ - یہ عجمی لفظ ہے* (۲/۱۰۲) - (دیکھئے عنوان ہاروت) -

## م ت ع

مَتَاعٌ - ضرورت کا ساز و سامان - ہر وہ ضرورت کی چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے (۱۰/۸) - اس کے بنیادی معنی، وہ سامان ہے جو ضروریات

---

*تاج -

سفر کے لئے کافی ہو**۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے تھوڑا فائدہ حاصل کیا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو، بلکہ جلد ختم ہو جائے**۔ الْمُتْعَةُ۔ ضروریات سفر۔ مثل ڈول، رسی، مشکیزہ، قلیل توشہ*۔ نیز عورت کو طلاق دینے کے بعد جو نان و نفقہ شوہر سے ملتا ہے اسے بھی مُتْعَةٌ کہتے ہیں*۔ اور گذر بسر کے قابل روزی کو بھی۔ اَلْمَرْاَۃُ تُمَتِّعُ صَبِیَّھَا کے معنی ہیں وہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز سے منفعت اور اس سے طویل مدت تک نفع اٹھانے کے ہیں۔ نیز جس فائدہ میں لذت کا پہلو مضمر ہو۔ یا جس میں ارتفاع و ترقی ہو۔ اس میں بہرحال فائدہ اٹھانا قدر مشترک ہے۔

قرآن کریم نے اَرْضٌ (زمین) کو جو مَتَاعٌ کہا ہے ($\frac{2}{36}$) تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے سامان پرورش مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔ یہ سَوَاءٌ لِلسَّائِلِیْنَ ($\frac{41}{10}$) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں (طور پر کھلی)۔

چونکہ مَتَاعٌ میں پرورش کا پہلو غالب ہے اس لئے اَلْمَاتِعُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں سے بہتر اور طویل تر ہو۔ جسکی نشوونما اچھی ہو چکی ہو۔ عمدہ بٹی ہوئی رسی۔ یا تیز سرخ شراب کو بھی کہتے ہیں**۔ مَتَعَ النَّھَارُ کے معنی ہیں دن چڑھ گیا۔ مَتَعَ الْحَبْلُ۔ رسی مضبوط اور سخت ہو گئی۔ اَلتَّمْتِیْعُ کے معنی ہیں لمبا کرنا۔ عمر دراز کرنا۔ آباد کرنا۔ (اس کے علاوہ اس کے اور معنی بھی لغت میں دئے گئے ہیں) اس سے مَتَاعٌ اسم آسکتا ہے جس کے معنی فائدہ دینا ہیں**۔ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَتَّعْنٰھُمْ سِنِیْنَ ($\frac{26}{205}$)۔ کیا تو نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہم برسوں ان کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

اَلْمَتْنُعُ۔ خفیہ تدبیر کو بھی کہتے ہیں*۔ اَسْتَمَعَ عَنْہُ کے معنی ہیں وہ اس سے مستغنی ہو گیا*۔

## م ت ن

اَلْمَتْنُ۔ سخت بلند اور ہموار زمین۔ مَتُنَ۔ یَمْتُنُ۔ وہ سخت اور مضبوط ہوا۔ اَلتَّمْتِیْنُ۔ خیموں کی رسیاں یا ڈوریاں۔ نیز خیمے نصب کرنے

*تاج۔ **محیط۔

کو بھی کہتے ھیں ۔ اَلْمِیْتَانُ ۔ دو ستونوں کے درمیان کا حصہ ۔ اَلْمَتَانَۃُ ۔ شدت اور قوت ۔ سختی اور مضبوطی ۔ سَیْفٌ مَتِیْنٌ ۔ مضبوط پشت والی تلوار۔ ثَوْبٌ مَتِیْنٌ ۔ مضبوط اور سخت کپڑا * ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں امتداد پایا جاتا ھے ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۷/۱۸۳) ۔ میری تدبیر بڑی محکم مضبوط اور شدید ھوا کرتی ھے ۔ کوئی اسے توڑ نہیں سکتا ۔ اسی اعتبار سے خدا کو اَلْمَتِیْنُ کہتے ھیں (۵۱/۵۸) ۔ یعنی وہ جس کے محکم قوانین کے سہارے کائنات کے خیمے ایستادہ ھیں ۔ یعنی خود بھی محکم اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا ۔ بعض نے کہا ھے کہ ذُوالْقُوَّۃِ وہ ھوتا ہے جس کی قوت دوسروں پر بھی اثر انداز ھو ۔ اور مَتِیْنٌ اسے کہتے ھیں جو اپنی ذات میں محکم اور مضبوط ھو* ۔ لیکن ھمارا خیال ھے کہ مَتِیْنٌ میں دونوں باتیں آسکتی ھیں ۔

## متی

مَتٰی ۔ کب ۔ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ (۳۴/۲۹) ۔ یہ وعدہ کب (پورا) ھوگا؟ (کبھی یہ ۔ جب ۔ کے معنوں میں بھی آتا ھے ۔ اُسوقت یہ شرطیہ ھوتا ھے)

## م ث ل

مِثْلٌ ۔ کسی کے مشابہ یا مانند یا برابر ۔ مَثَلٌ کے معنی کسی چیز کی (Description) ھیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے بیان کی جائے ۔ مِثَالٌ کے معنی ھیں انداز، اسلوب ، شکل و صورت ۔ وہ نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے ۔ قالب (Pattern) ۔ وہ مقدار جس کے مطابق کوئی چیز ماپی جائے یا قطع کی جائے ۔ نیز (Example) ** ۔ اَمْثَلُ کے معنی افضل کے ھیں ۔ اس کا مؤنث مُثْلٰی ھے ۔ اَلطَّرِیْقَۃُ الْمُثْلٰی ۔ اُس طریقہ کو کہتے ھیں جو حق وعدل کے مطابق اور اس سے زیادہ مشابہ ھو ۔ تَمْثِیْلٌ کے معنی تصویر بنانا اور تَمَثُّلٌ کے معنی ھیں کسی کے مانند بن جانا ۔ اِمْتِثَالٌ ۔ کسی کے طریقہ کی پوری پیروی کرنا ۔ مَثَلَ الرَّجُلُ کے معنی ھیں وہ آدمی سیدھا کھڑا ھو گیا * ۔ (نیز زمین سے چپک جانے کے لئے بھی بطور اضداد استعمال ھوتا ھے) * ۔ مُثْلَۃٌ کے معنی ھیں کسی کو قتل کرکے اسکے ھاتھ پیر کاٹنا اور اسکی صورت بگاڑ دینا * ۔ مَثُلَۃٌ (اور مَثْلَۃٌ) جسکی جمع مَثُلَاتٌ ھے *** ۔ عبرتناک سزائیں نیز تاریخ کے وہ واقعات جو شاھراہ زمانہ پر اسطرح کھڑے ھوں کہ ان سے ھر رھرو عبرت حاصل کرے * (۱۳/۶) ۔

---

*تاج ۔ **لین و تاج و محیط ۔ ***محیط ۔

تِمْثَالٌ - تصویر کو کہتے ہیں جسکی جمع تَمَاثِیْلُ ہے - صاحب تاج العروس کے نزدیک قرآن کریم میں تماثیل سے مراد انبیاء کرام[ؑ] کی تصاویر ہیں * - لیکن عیسائیوں کے نزدیک تَمَاثِیْلُ مجسموں (Statues) کو کہتے ہیں - اور تصاویر (Paintings) کو** -

قرآن کریم میں مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں مَثَلٌ کے معنی مثال کے ہیں - یعنی مشابہ اور مانند - اور (۲/۱۰۶) میں مِثْلِهَا کے معنی ہیں جو اس جیسا ہو - سورہ رعد میں مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِی وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (۱۳/۳۵) میں مَثَلٌ کے معنی تمثیلی بیان کے ہیں -

سورۃ طٰہٰ میں بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی (۲۰/۶۳) کے معنی وہ راستہ ہیں جوحق و عدل اور توازن و تناسب سے زیادہ قریب ہو - اقرب الموارد میں کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مَثَلَ کے معنی فَضَلَ ہے - یعنی بڑھا - زیادہ ہؤا اور غالب آیا - اس اعتبار سے اَمْثَلُ کے معنی اَفْضَلُ اور اَغْلَبُ ہو گئے (اس کا مؤنث مُثْلٰی ہے) - لہذا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی کے معنی ہوئے ایسا مسلک و مشرب جو دیگر مسالک و مشارب پر غالب ہو - ہر غالب قوم اپنے مسلک و مذہب کو افضل اور غالب سمجھتی ہے خواہ وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو - اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً (۲۰/۱۰۴) کے معنی ہیں وہ شخص جو اعلیٰ درجہ کے طریقہ پر ہو - سورۃ نحل میں ہے کہ جو لوگ مستقبل کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے ان کا کرداری ڈھانچہ بہت ہی برا ہے - اس کے لئے مَثَلُ السَّوْءِ (۱۶/۶۰) کے الفاظ آئے ہیں - ان کے برعکس وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (۱۶/۶۰) - جو عملی ڈھانچہ خدا کے قانون کے مطابق بنتا ہے وہ نہایت بلند ہوتا ہے - اس لئے کہ کائنات کے جس قدر بلند ڈھانچے ہیں سب قانون خداوندی کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں -

سورۃ انبیاء میں ان بتوں کے لئے تَمَاثِیْلُ کا لفظ آیا ہے (۲۱/۵۲) جن کی پرستش قوم ابراہیم کیا کرتی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ تَمَاثِیْلُ کے معنی مجسمے ہیں - اس لئے (۳۴/۱۳) میں جہاں آیا ہے کہ حضرت سلیمان[ؑ] تماثیل بنوایا کرتے تھے تو اس سے مراد مجسمے ہی ہیں - سورۃ مریم میں جہاں ہے فَاَرْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا (۱۹/۱۷) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریم[ؑ] کی نگاہ میں ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا - اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے - یعنی حضرت مریم[ؑ] نے یہ کچھ اپنے خواب میں دیکھا -

---

* تاج - ** لین و تاج و محیط -

سورۃ آل عمران میں ہے - مِثْلَيْهِمْ ( ۳/۱۲ ) - یعنی اپنے سے دگنے -

قرآن کریم میں ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهٖ..... ( ۲/۲۳ ) - "جو کچھ ہم نے اپنے بندے کی طرف نازل کیا ہے اگر تم اس کی بابت شک میں ہو (کہ یہ منجانب اللہ نہیں ہے) تو تم اس کی مثل ایک سورت (بنا کر) لاؤ" - اس کے بعد خود ہی کہدیا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا.... ( ۲/۲۴ ) - لیکن اگر تم ایسا نہ کرو - اور تم ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکو گے—تو... (اس چیلنج کو دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے - دیکھو ۱۰/۳۸ و ۱۱/۱۳) -

یہ قرآن کریم کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے زمانۂ نزول کے (عرب) مخاطبین کو بھی دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو دیتا چلا آ رہا ہے، لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نہ تو اس زمانے کے عربوں نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے) ایسے قبول کیا اور نہ ہی اس کے بعد آجتک کسی میں اس کی ہمت پڑی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنا کر دکھائے - یہ چیلنج لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہے - معنوی حیثیت سے قرآنی حقائق ان بلندیوں پر ہیں جن کا تصور بھی فکر انسانی نہیں کر سکتا - جہاں تک اس کے اسلوب بیان کا تعلق ہے، اس کی مثل و نظیر تو ایک طرف پروفیسر گب ( H. A. R. Gibb ) کے بیان کے مطابق اس کا ترجمہ بھی دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا*** - حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل نرالا ہے - یہ نہ نثر ہے نہ نظم - نہ ہی اس اسلوب کی عربی لٹریچر میں کوئی مثال ملتی ہے (نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد) - اس لئے قرآن اپنے لفظوں اور معنوں، دونوں کے ساتھ، خدا کا کلام اور بے مثل و بے نظیر ہے - اس کی مثل کچھ ہو ہی نہیں سکتا -

## م ج د

اَلْمَجْدُ - اس کے اصلی معنی کثرت کے ہوتے ہیں* - یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ سے ماخوذ ہے جو اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کسی وسیع اور نہایت سرسبز چراگاہ میں داخل ہوجائیں جہاں چارہ کثرت سے ہو** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی صفاتِ محمودہ (مثلاً کرم و شرافت وغیرہ) میں انتہا تک پہنچ جانا ہیں - اس نے مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے معنی "اونٹ شکم سیر ہونے کے قریب ہوگیا" دئے ہیں -

*محیط - **راغب - ***Modern Trends in Islam. p. 4

اَمْجَدَ نَا فُلَانٌ* کے معنی ہیں ہمیں فلاں آدمی نے مہمانی کے طور پر اتنا دیا جو ہمیں کافی ہو گیا اور بچ بھی رہا۔ نیز اَمْجَدَ الْعَطَاءَ۔ اسے بکثرت بخشش دی ۔ اَمْجَدَ الاِبِلَ ۔ اونٹوں کو پیٹ بھر چارہ دیا*۔ عربوں میں چونکہ سخاوت (کسی کو دینا) بہت بڑا شرف تھا اس لئے ان کے ہاں اَلْمَجْدُ بلند ترین شرف کو کہتے تھے****۔ اہل لغت نے مجد اور شرف کو ہم معنی لکھا ہے اور دونوں کے متعلق کہا ہے کہ ان میں آبائی شرف بھی شامل ہے ۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے مَجِيْدٌ آیا ہے ۔ شَرِيْفٌ کہیں نہیں آیا ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مجد جوہر ذاتی ہے جس میں آبائی شرف کو دخل نہیں ۔

قرآن کریم نے خدا کی صفت مَجِيْدٌ بتائی ہے (۱۱/۷۳ و ۸۵/۱۵) ۔ یعنی سامان ربوبیت (خواہ وہ طبعی زندگی سے متعلق ہو یا انسانیت کی راہ نمائی کے متعلق) کو نہایت کثرت اور فراوانی سے دینے والا ۔ وسعت اور فراخیاں پیدا کرنے والا ۔ انتہا تک پہنچا دینے والا ۔ اور اسی بناء پر وہ حَمِيْدٌ ہے ۔ یعنی تعریف اور ستائش کا مالک ۔

## م ج س

اَلْمَجُوْسِيَّةُ ۔ ایک قدیم مذہب جسکی تجدید جناب زرتشت نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مَجُوْسٌ کہتے ہیں ***۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لئے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا ۔ قرآن کریم میں اَلْمَجُوْسُ (۲۲/۱۷) کا ذکر یہودیوں ، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے ۔ قرآن کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا ۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لئے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے ۔

## م ح ص

اَلْمَحْصُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اس کے عیوب سے پاک کرنا **۔ مَحَصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ ۔ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو اس سے الگ کر دیا اور اسطرح سونے کو خالص کر لیا ****۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔ ****محیط ۔

مَحَصَ السِّنَانَ - اس نے نیزے کو جلادی ، چمکایا * - قرآن کریم میں ہے - وَلِيُمَحِّصَ مَافِي قُلُوْبِكُمْ (۳/۱۵۳) - تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں کھوٹ ہے اسے نکال دے -

نیز حَبْلٌ مَحِصٌ - اس رسی کو کہتے ہیں جس کا چبھنے والا رواں استعمال سے صاف ہو گیا ہو اور وہ اسطرح نرم ہو گئی ہو - اور فَرَسٌ مَحْصٌ وَمُمَحَّصٌ - مضبوط جسم والا گھوڑا * - اس اعتبار سے مَحْصٌ کے معنی مضبوط اور طاقتور بنانے کے آئیں گے - سورہ آل عمران میں یہ لفظ مَحْقٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳/۱۴۰) - مَحْصٌ اور مَحْقٌ دونوں میں کمی کرنے کا مفہوم ہوتا ہے - لیکن مَحْصٌ میں کسی کی کمزوریوں کو کم کرکے اسے محکم بنانا مقصود ہوتا ہے اور مَحْقٌ میں کسی کو مٹا دینا مفہوم ہوتا ہے - (دیکھئے عنوان م - ح - ق)

# م ح ق

مَحَقَهُ - اسے مٹا دیا حتکہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا * - اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا کم کیا *** - اَلْمَحْقُ - کسی چیز کا تمام کا تمام ضائع ہو جانا حتکہ اس کا کچھ حصہ بھی نظر نہ آئے - مَحَقَ الْحَرُّ الشَّيْئَ - گرمی نے اس چیز کو جلا کر تباہ کر دیا - اِمْتَحَقَ النَّبَاتُ - سخت گرمی کے باعث پودے سوکھ کر جل گئے * - اَلْمَحَقَةُ - ہلاکت * - راغب کے نزدیک اس کے معنی کم ہو جانے کے ہیں ** - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - چنانچہ اَلْمَحَاقُ ( م کی تینوں حرکات کے ساتھ ) - قمری مہینوں کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا -

سورہ بقرۃ میں ہے يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰو (۲/۲۷۶) - خدا کا قانون ربٰو کی بنا پر حاصل شدہ سرمایہ کو کم کر دیتا یا برباد کر دیتا ہے - وہ معاشرہ کبھی ثمر بار نہیں ہو سکتا جس کا معاشی نظام ربٰو پر قائم ہو - یہاں يَمْحَقُ بمقابلہ يُرْبِي آیا ہے جس کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں - سورہ آل عمران میں يَمْحَقُ بمقابلہ يُمَحِّصُ آیا ہے (۳/۱۴۰) جس کے لئے دیکھئے عنوان (م - ح - ص)

# م ح ل

اَلْمَحْلُ - خفیہ تدبیر - مکر - چال - شدت - شدید بھوک - قحط سالی - بارش کا بند ہو جانا اور زمین کا خشک ہو جانا - زَمَانٌ مَاحِلٌ - خشک

*تاج - **راغب - ***محیط -

زمانہ جس میں بارش نہ ہو۔ اَرْضٌ مَحِلٌ ۔ وہ زمین جہاں وقت پر بارش نہ ہوئی ہو اور اس وجہ سے وہاں قحط ہو گیا ہو۔ اَمْحَلَ الْقَوْمُ ۔ وہ قوم قحط سالی میں مبتلا ہو گئی ۔ مَاحَلَهٗ مِحَالاً ۔ اس نے اس سے دشمنی کا برتاؤ کیا ۔ اس سے زور آزمائی کی تاکہ معلوم ہو جائے کہ دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے ۔ چنانچہ اَلْمَاحِلُ ۔ جھگڑا کرنے والے حریف کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳/۱۳) ۔ اس کے معنی ہیں سختی سے گرفت کرنے والا ۔ سختی سے سزا دینے والا ۔ بڑی قوت کے ساتھ مواخذہ کرنے والا ۔ جس کا قانون مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہو اور جو اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں بڑی سختی برتتا ہو اور کسی سے رعایت نہ کرتا ہو۔ اس میں سختی کے ساتھ قوت کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں مَحِّلْنِیْ يَا فُلَانُ ۔ اے شخص! مجھے قوت پہنچا * ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مِحَالٌ دراصل حَوْلٌ اور حِيْلَةٌ سے مشتق ہے اور اس میں میم زیادہ ہے ۔ (اسکے لئے دیکھئے ح ۔ و ۔ ل ) لیکن یہ بہت بعید ہے ۔

## م ح ن

مَحْنٌ کے اصلی معنی کوڑے مارنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْمِحْنَةُ اسم ہے جس کی جمع مِحَنٌ آتی ہے ۔ یعنی وہ مشقتیں جن سے کسی کی آزمائش کی جائے ۔ مَحَنَ الْبِئْرَ مَحْنًا ۔ اس نے کنوئیں کی مٹی وغیرہ نکال کر اسے صاف کر دیا** ۔

مَحَنَ الْاَدِيْمَ ۔ اس نے چمڑے کو نرم کر دیا ۔ اسے چھیل کر صاف کر دیا ۔ اس نے چمڑے کو کھینچکر وسیع کر دیا ۔ مَحَنَ الْفِضَّةَ ۔ اس نے چاندی کو آگ میں تپا کر صاف اور خالص کر دیا ** ۔

قرآن کریم میں ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (۴۹/۳) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقویٰ کے لئے پاک اور صاف کر دیا ۔ یا انہیں نرم اور کشادہ کر دیا ۔

اِمْتِحَانٌ کے معنی کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے یا آزمانے کے ہیں ۔ سورہ الممتحنہ میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ (۶۰/۱۰) ۔ اے جماعت مومنین !

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کرکے آئیں تو ان کے اندرونی حالات معلوم کر لیا کرو۔

## م ح و

مَحَاهُ یَمْحُوْهُ مَحْوًا۔ اس نے اس کے اثر اور نشان کو مٹا دیا اور ختم کر دیا، زائل کر دیا۔ اَلْمَحْوَۃُ۔ بارش جو خشک سالی کے آثار مٹا دے۔ مَحَا الصُّبْحُ اللَّیْلَ۔ صبح نے نمودار ہو کر رات کو مٹا دیا۔ اَلْمَحْوُ۔ اس سیاہ نشان کو کہتے ہیں جو چاند کے اندر نظر آتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو لے جانے اور غائب کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں مَحْوٌ بمقابلہ اِثْبَاتٌ آیا ہے۔ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ (۱۳/۳۹)۔ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق (نہ رکھنے کے قابل چیز کو) مٹا دیتا اور رکھنے والی چیز کو قائم رکھتا ہے۔ مٹاتا اسے ہے جو تخریبی نتائج پیدا کرے اور باقی اسے رکھتا ہے جو تعمیری نتائج کی حامل ہو (۴۲/۲۴)۔ یعنی جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو (۱۳/۱۷)۔ محو و اثبات کا یہ اٹل قانون، کارگہ فطرت کے ہر گوشے میں کارفرما ہے اور اسی قانون کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ہوتے ہیں۔ یعنی بقائے نافع (۱۳/۱۷)۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ''بقائے نافع'' کا اصول ''بقائے اصلح'' (Survival of the Fittest) کے اس اصول سے بہت بلند ہے جسے ڈارون (اور اس کے متبعین نے) طبیعیاتی قانون ارتقا میں دیکھا تھا۔ انسانی دنیا کے لئے صحیح اصول یہی ہے کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) ''زمین میں وہی چیز (وہی نظریہ۔ وہی نظام) ٹھہرتی ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو''۔ یعنی وہ نظریہ زندگی اور نظام حیات جو نفع بخش ہو اور اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، پارٹی، قوم، یا ملک تک محدود نہ ہوں، پوری کی پوری انسانی دنیا کو محیط ہوں۔ دنیا کے تمام انسان ان سے متمتع ہوں۔

## م خ ر

مَخْرٌ۔ شق کرنا۔ پھاڑنا۔ چیرنا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں**۔ مَخَرَتِ السَّفِیْنَۃُ۔ کشتی پانی کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ مَخَرَ السَّابِحُ

---

*تاج۔ **محیط و ابن فارس۔

تیرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَ تَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْہِ (۱۶/۱۴) ۔ اس میں مَوَاخِرَ مَاخِرَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں سینہ بحر کو چیر کر چلنے والی (کشتیاں) ۔

# م خ ض

مَخَضَ اللَّبَنَ ۔ دودھ (دھی) کو بلویا ۔ اسی سے مَخَضَ الشَّیْئَ مَخْضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو سختی سے ہلانا ۔ اس طرح حرکت دینا جس طرح دھی کو بلوتے وقت حرکت دیتے ہیں ۔ تَمَخَّضَ الْوَلَدُ ۔ بچے نے حاملہ کے پیٹ میں اس طرح حرکت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا ہے ۔ اَلْمَاخِضُ ۔ وہ حاملہ جس کے وضع حمل کا وقت قریب آ گیا ہو ۔ مَخَضَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت کو درد زہ شروع ہو گیا**۔ سورۃ مریم میں اَلْمَخَاضُ (۱۹/۲۳) انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی دردِ زہ ۔

# م د د

مَدٌّ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو لمبائی میں کھینچنا اور کسی چیز کا دوسری سے طول میں ملے ہوئے ہونا ۔ اسی نسبت سے مَدٌّ کے معنی سیلاب کے آتے ہیں کیونکہ اس میں پانی دور تک مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ بڑھانے اور اضافہ کرنے کو بھی مَدٌّ کہتے ہیں ۔ مَدُّ الْبَحْرِ ۔ سمندر کے چڑھاؤ کو کہتے ہیں ۔ یہ الْجَزْرُ (اتار) کی ضد ہے ۔ مَدٌّ کے معنے بچھانے اور پھیلانے کے بھی ہیں ۔ مَدَّ نَظَرَہٗ اِلَیْہِ ۔ اس کی طرف جھانک کر دیکھا ۔ نظر اٹھا کر دیکھا ۔ مَدٌّ اور اِمْدَادٌ کے معنی مہلت دینے کے بھی آتے ہیں ۔ مَدِیْدٌ ۔ لمبی پھیلی ہوئی یا کھینچی ہوئی چیز کو کہتے ہیں ۔ مِدَادٌ ۔ روشنائی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ قلم سے برابر آتی رہتی ہے اور بعد میں آنے والی روشنائی پہلی روشنائی سے ملتی رہتی ہے ۔ مَدٌّ کے معنی مدد دینے کے بھی آتے ہیں** ۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ مَدٌّ بیشتر شر کے لئے آتا ہے اور اِمْدَادٌ خیر کے لئے*** ۔ (مثالیں آگے آتی ہیں) ۔

مَادَّۃٌ ۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو بڑھائے** ۔ اہل لغت نے اس کے معنی اَلزِّیَادَۃُ الْمُتَّصِلَۃُ بھی بتائے ہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو اسطرح بڑھے کہ اس کے اجزاء باہمدگر ملے رہیں ۔ یہ لفظ (Matter) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

سورۃ النمل ۔ ( ۲۷/۳۹ ) میں یہ مادہ "بڑھاپے" کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ سورۃ حجر میں ہے ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ ( ۱۵/۸۸ ) ۔ تو اپنی آنکھوں کو (اس طرف) مت بڑھا ۔ یعنی ان چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھ ۔ روشنائی کے معنوں میں مِدَادٌ ( ۱۸/۱۰۹ ) میں آیا ہے ۔ "پھیلے ہوئے" کے معنوں میں ( ۵۶/۳۰ ) میں ۔ یعنی ظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ ۔ اِمۡدَادٌ خیر اور بھلائی کے معنوں میں ۔ کُلًّا نُّمِدُّ ھٰۤؤُلَآءِ وَ ھٰۤؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّکَ ( ۱۷/۲۰ ) میں آیا ہے ۔ اس لئے کہ یہ امداد ربوبیت اور پروردگاری کے سرچشمہ سے متعلق ہے ۔ آیت کے معنی ہیں "ہم سب کو مدد دیتے ہیں ۔ آگے بڑھاتے ہیں ۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی ۔ یہ تیرے رب کی عطا سے ہوتا ہے" ۔ وَ اَمۡدَدۡنٰکُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ( ۱۷/۶ ) میں اَمَدَّ بھی خیر اور بھلائی کے لئے آیا ہے ۔ آیت کے معنی ہیں "اور مال اور اولاد سے تمہیں مدد دی ۔ آگے بڑھایا" ۔ اس کے برعکس ، سورۃ مریم میں ہے قُلۡ مَنۡ کَانَ فِی الضَّلٰلَۃِ فَلۡیَمۡدُدۡ لَہُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا ( ۱۹/۷۵ ) ۔ "کہو کہ جو کوئی گمراہی میں رہے تو رحمٰن اس کے لئے مہلت کا عرصہ لمبا کرتا جائے گا" ۔ اس میں مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے سَنَکۡتُبُ مَا یَقُوۡلُ وَ نَمُدُّ لَہٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ( ۱۹/۷۹ ) ۔ یہاں بھی مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ یعنی "ہم اسے لکھتے جائینگے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لئے عذاب کو لمبا کھینچتے جائینگے" ۔

ھُوَ الَّذِیۡ مَدَّ الۡاَرۡضَ ( ۱۳/۳ ) میں مَدَّ کے معنی پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں ۔ "اللہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے" ۔ اور وَ یَمُدُّھُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ ( ۲/۱۵ ) میں اس کے معنی مہلت دینے اور دور تک لے جانے کے ہیں ۔

سورۃ کہف میں مَدَدًا ( ۱۸/۱۰۹ ) اضافہ کے معنوں میں آیا ہے ۔

## م د ن

مَدَنَ بِالۡمَکَانِ ۔ اس نے اس جگہ قیام کیا ۔ اَلۡمَدِیۡنَۃُ ( ۳۶/۲۰ ) ۔ بڑا شہر اس کی جمع مَدَائِنُ ہے ۔ یعنی بہت سے شہر ( ۷/۱۱۱ ) ۔ قلعہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دِیۡنٌ سے مشتق ہے (دیکھئے عنوان د ۔ ی ۔ ن) ۔ مَدَائِنُ ایران (فارس) کے ایک بڑے شہر کا نام تھا جو بغداد کے قریب تھا ۔ مَدۡیَنُ حضرت شعیبؑ کے قریہ کا نام* ( ۷/۸۵ ) ۔ تَمَدۡیَنَ الرَّجُلُ ۔ آدمی آسودہ

*محیط و راغب و تاج ۔

و خوش حال ہوا ۔ تَمَدَّنَ الرَّجُلُ ۔ اس آدمی نے شہر والوں کی عادات اختیار کرلیں ۔ دیہاتی پن چھوڑ کر شہریت و شائستگی اختیار کی ۔ مَدَّنْتُ مَدِیْنَۃً ۔ میں نے شہر بنایا** ۔ اسے آباد کیا اور بسایا* ۔

## مَدْیَنُ

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے (۷/۸۵) ۔ نیز وہ علاقہ جس کی طرف حضرت موسیٰؑ گئے تھے (۲۸/۲۲) ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''شعیبؑ'' ۔ نیز عنوان ''موسیٰؑ'' ۔

## م ر أ

اَلْمَرْءُ ۔ (میم پر تینوں حرکتیں جائز ہیں) نیز اُمْرُؤٌ ۔ انسان یا مرد ۔ اَلْمَرْأَۃُ اور اَلْاِمْرَأَۃُ عورت کو کہتے ہیں ۔ مُرُوْءَۃٌ ۔ انسانیت ۔ آدمیت کمالِ مردانگی ۔ مَرِیَٔ الطَّعَامُ مَرَاءَۃً ۔ کھانا خوشگوار ہوگیا ۔ هَنِیْئٌ* ۔ لذیذ کھانے کو کہتے ہیں ۔ اور مَرِیْئٌ اس کھانے کو جس کا نتیجہ عمدہ ہو* ۔ هَنِیْئًا مَرِیْئًا (۴/۴) ۔

## م ر ج

مَرْجٌ ۔ ملانا ۔ خلط ملط کر دینا ۔ مَرَجٌ کے معنے گڈ مڈ ہونے ، مل جانے اور اختلاط کے ہیں (راغب نے یہ معنی اَلْمُرُوْجُ کے دئے ہیں) ۔ اسی سے اَلْمَرَجُ کے معنی اضطراب اور التباس کے ہیں ۔ نیز فتنہ و فساد کے*** ۔ سورۃ قٓ میں ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں فَهُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ (۵۰/۵) ۔ وہ پیچیدہ معاملہ کے اندر ہیں ۔ وہ بڑے الجھاؤ اور پریشانی کی حالت میں ہیں ۔ انہیں التباس ہو رہا ہے ۔ وہ اسی اضطراب میں ہیں جو بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے ۔ اَلْمَارِجُ ۔ مختلط چیز ۔ بلند اور تندو تیز شعلہ*** ۔ (لیکن ، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا ۔ مَرْجٌ کےمعنی کھلا چھوڑ دینے کے بھی آتے ہیں ۔ اسی لئے اَلْمَارِجُ ۔ آگ کے آزاد شعلے کو کہینگے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو) ۔ سورۃ رحمٰن میں ہے ۔ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵/۱۵) ۔ آگ کے مخلوط یا بھڑکنے والے شعلے سے ۔ لیکن اَلْمَرْجُ وسیع چراگاہ اور کھلی جگہ کو بھی کہتے ہیں جس میں جانور آزادانہ (کھلے طور پر) چرتے پھرتے رہیں*** ۔ (غالبًا اس لئے کہ اس طرح کھلے طور

*تاج ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج و راغب ۔

پر چرنے پھرنے سے ایک دوسرے کے جانور آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں) ۔ اَمْرَجَہَا ۔ اُس نے جانوروں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلیں پھریں ۔ چنانچہ اَلْمَرَجُ اُن اونٹوں کو کہتے ہیں جو بغیر چرواہے کے آزاد چر پھر رہے ہوں ۔ اسی سے اَلْمَرْج کے معنی جاری کرنے چلانے اور کھلا چھوڑنے کے بھی ہوتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے جانے اور اضطراب کے ہیں ۔

قرآن کریم میں مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ (۲۵/۵۳) ; (۵۵/۱۹) آیا ہے ۔ جس کے معنی ہیں اس نے دو دریا جاری کر رکھے ہیں جو آپس میں ملتے ہوئے بہہ رہے ہیں ۔

# م ر ح

اَلْمَرَحُ ۔ اس خوشی اور نشاط کو کہتے ہیں جس میں شدت اور زیادتی سے انسان اپنی حدود سے متجاوز ہو جائے ( اور اس میں اوچھے پن یا اترانے کی کیفیت پیدا ہو جائے) ۔ اکڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے معنے ایسی خوشی بتائے ہیں جس میں فرط طرب سے آدمی آپے سے باہر نکل جائے ۔ فَرَسٌ مِمْرَحٌ ۔ طاقت کی مستی میں اٹھلا کر چلنے والا پر نشاط گھوڑا ۔ قَوْسٌ مَرُوْحٌ ۔ کڑی کمان ** ۔ جو انتہائی تیزی سے تیر پھینکتی ہو ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْشِ فِیْ الْاَرْضِ مَرَحًا (۱۷/۳۷) ۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو ۔ اسکی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی ۔ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۴۰/۷۵) ۔ یعنی یہ لوگ بغیر ایسے کام کئے جو تعمیری نتائج مرتب کریں ، یونہی اکڑتے رہتے ہیں ۔ انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے ۔ وَ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) ۔ چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے کئے نہیں ۔

# م ر د

مَرَدَ ۔ یَمْرُدُ کے معنی ہیں سرکشی کرنا ۔ مَرَدَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں وہ اس چیز کا عادی ہو گیا ۔ وہ اسے برابر کرتا رہا ۔ تَمَرَّدَ کے اصلی معنی مشتاق ہو جانے اور عادی ہوجانے کے ہیں*** ۔ چنانچہ قرآن کریم

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ *** تاج ۔

میں ہے۔ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ (۹/۱۰۱) - وہ منافقت کے عادی ہوچکے ہیں۔
اَلْمَرْدَاءُ - اُس عورت کو کہتے ہیں جس کے سر پر بال نہ ہوں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے چھلکے یا اوپر کے روئیں اور بالوں کو صاف کر دینا ہوتے ہیں - اس سے اَلْاَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کی ڈاڑھی نمودار نہ ہوئی ہو - قرآن کریم نے شیطان کو مَرِیْدٌ کہا ہے (۴/۱۱۷)- پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مطلب ہوگا سرکش - راغب نے اسے شَجَرَۃٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ بتایا ہے جس کے معنے ہیں وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں - ان معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا وہ جو ہر قسم کی بھلائیوں اور خوشگواریوں سے محروم ہو چکا ہو - یہ معنی رَجِیْمٌ اور لَعِیْنٌ کے مرادف ہیں - (دیکھئے عنوانات ر - ج - م اور ل - ع - ن)

اَلْمَرِیْدُ - کھجور جو دودھ میں بھگو دی جائے تاکہ نرم ہو جائے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے مَل دیا جائے حتیٰکہ وہ نرم ہوجائے مَرِیْدٌ کہلاتی ہے * - قرآن کریم میں صَرْحٌ مُمَرَّدٌ آیا ہے (۲۷/۴۴) - اس کے معنی ہیں ہموار یا چکنا کیا ہوا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی لمبی عمارت کے بھی ہیں - ویسے اَلتَّمْرِیْدُ فِی الْبِنَاءِ کے معنی ہوتے ہیں عمارت کو چکنا اور ہموار کرنا - اس پر پلاسٹر لگانا - اَلْمَارِدُ - بلند - نیز سرکش - خیر سے عاری * (۳۷/۷) -

## م ر ر

مَرَّ - مَرَّبِہٖ - مَرَّعَلَیْہِ - اس کے پاس سے گزر گیا - اَلْمَرَّۃُ - ایک بار - مَرَّتَانِ - دو بار - فِیْ کُلِّ مَرَّۃٍ - ہر بار - اَوَّلَ مَرَّۃٍ - پہلی بار - اَلْمُرُّ - کڑوا* - اِسْتَمَرَّ الشَّیْءُ - چیز ہمیشہ رہی - مسلسل رہی - ایک ہی طریقہ پر چلتی رہی***- سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴/۲) وہی جھوٹ جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے - یعنی اِفْکٌ قَدِیْمٌ (۴۶/۱۱) -

سورۃ بقرہ میں ہے - اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ...... (۲/۲۲۹) - طلاق دو ہی بار ہوسکتی ہے - اس کا عام طور پر مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی آدمی دو مرتبہ طلاق ، طلاق کہدے (یا ایک ایک مہینہ کے وقفہ کے بعد دو بار طلاق کا اعلان کردے) تو اس سے طلاق نہیں پڑتی (واپسی ہو سکتی ہے) لیکن اگر تین مرتبہ کہدے تو پھر معاملہ ختم ہوجاتا ہے - اس کے بعد اگر یہ (سابقہ میاں بیوی) پھر باہمی نکاح کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کسی

*تاج - **راغب - ***محیط -

دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے ہم بستر ہو۔ (اسے حلالہ یا تحلیل کہتے ہیں)۔ یہ خیال اور طلاق کا طریق قرآن کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طلاق کے لئے ایک خاص طریقہ مقرر ہے۔ یعنی پہلے باہمی افہام و تفہیم۔ پھر ثالثوں کے ذریعے مصالحت کی کوشش۔ پھر عدالت کے ذریعے فیصلہ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے اور باہمی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر یہی مرد اور عورت چاہیں تو باہمی نکاح کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسا، اس جوڑے کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ ہوسکتا ہے۔ اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق کی نوبت آگئی تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کرسکتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کے بعد مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو پھر وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا مطلب اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے۔ جب تک طلاق (قیدِ نکاح سے آزادی) عمل میں نہ آجائے اسے طلاق کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اس لئے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کے معنی واضح ہیں۔ یعنی قیدِ نکاح سے ایسی آزادی دو مرتبہ ہوسکتی ہے جس میں لوٹ آنے کی اجازت ہو۔ تیسری مرتبہ کی آزادی کے بعد اس کی اجازت نہیں۔

اَلْمَرُّ۔ رسی کو بھی کہتے ہیں۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ۔ میں نے رسی کو بٹ دیا۔ اس سے اس کے معنی قوت اور استحکام کے آتے ہیں۔ اِسْتَمَرَّ مَرِيْرُهٗ۔ اس کا ارادہ مستحکم ہوگیا۔ اِسْتَمَرَّ بِالشَّيْءِ۔ وہ اس چیز کے اٹھانے پر قادر ہوگیا۔ اہل عرب کہا کرتے ہیں اَرْجَى الْغِلْمَانِ الَّذِيْ يَبْدَأُ بِحُمْقٍ ثُمَّ يَسْتَمِرُّ۔ سب سے عونہار لڑکا وہ ہے جو ابتداءً بیوقوفی کرے اور پھر درست ہو جائے۔ اس سے اَلْمِرَّةُ کے معنی خلقی قوت و شدت اور عقل و اصالت کے آتے ہیں*۔ چنانچہ صاحب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ مِرَّةُ الْاِنْسَانِ آدمی کی قوت کو کہتے ہیں۔ سورۃ القمر میں جو آیا ہے فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹)۔ تو اس کے معنی سخت شدت کا دن ہیں (اس کے معنی ہیں ایسا دن جس کی نحوست مسلسل رہے)۔ نیز اس نے کہا ہے کہ سورۃ اعراف میں جو ہے حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ (۷/۱۸۹)۔ تو اس میں فَمَرَّتْ بِهٖ کے معنی سختی یا شدت کو محسوس کرنا ہیں۔

سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ کو ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳/۶) کہا گیا ہے۔ اس کے معنی صاحب قوت و حکمت بھی ہوسکتے ہیں۔ یعنی وہ جس کے ارادے مستحکم

*تاج۔

اور تدبیریں قوی ہوں - اور یہ بھی کہ جو زندگی کی مختلف گزرگاہوں کا مالک ہو - اس لئے کہ "مَرُوْرٌ" کے بنیادی معنی گزر جانے کے ہیں - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ "مِرَّۃٌ" کے معنی ایسی حالت کے ہیں جس پر کوئی چیز مستقلاً چلتی رہے - اس اعتبار سے اس کے معنے قوانین خداوندی (سنۃ اللہ) کے ہونگے جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی -

## م ر ض

مَرَضٌ - توازن اور اعتدال کا اس طرح بگڑ جانا کہ کسی قوت میں اضمحلال، ضعف یا کمی واقع ہوجائے - کمی کے لحاظ سے شَمْسٌ مَرِیْضَۃٌ - سورج کو اس وقت کہتے ہیں جب گرد و غبار سے اس کی روشنی مدھم پڑ گئی ہو - اور اَرْضٌ مَرِیْضَۃٌ - ایسی زمین کو جس میں طاقت کم ہو - یا جس میں پیداوار کم ہوتی ہو - نیز وہ زمین جہاں بد امنی ہو - مَرَضٌ کے معنی ظلمت اور تاریکی کے بھی آتے ہیں - اورشک اور نفاق کے بھی* -

قرآن کریم میں مَرَضٌ بمقابلہ شِفَاءٌ آیا ہے ($\frac{26}{80}$) جہاں اس کے معنی جسمانی مرض کے ہیں - اور فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَرَضٌ ($\frac{2}{10}$) - جہاں اس کے معنی قلب و نگاہ کے توازن کے بگاڑ اور نفسیاتی الجھاؤ کے ہیں - لہذا، جسمانی بیماری ہو یا ذہنی اورقلبی فتور، دونوں کے لئے مَرَضٌ کا لفظ آتا ہے - سورۃ بقرہ میں سطحی جذبات پرستوں یا مفاد پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَرَضٌ ($\frac{2}{10}$)- اس قسم کی ذہنیت یا سیرت کو، قلب (Psyche) یا (Mind) کا مرض کہنا ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہے جس سے (بیسویں صدی سے پہلے) انسانی علم بالعموم بے بہرہ تھا - اسی جہت سے قرآن کریم نے اپنے متعلق کہا ہے شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ($\frac{10}{57}$)- اس میں "قلب کے امراض" کا علاج اور شفاء ہے -

اگر اس کا علاج وحی کی رو سے نہ کیا جائے تو یہ مرض اپنے زور دروں سے از خود بڑھتا رہتا ہے ($\frac{2}{10}$) -

## م ر و

صَفَا اور مَرْوَۃ مکہ میں مسجد حرام سے باہر دو پہاڑیاں ہیں - صَفَا (صَفَاۃٌ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مَرْوٌ چھوٹے چھوٹے سفید براق کنکروں کو - مراسم حج کے سلسلہ میں قرآن کریم نے انہیں

*تاج -

میں "شَعَائِرِ اللہِ (۲/۱۵۸) کہا ہے ۔ شَعَائِر، کسی نظام یا مملکت کی اُن محسوس علامات (نشانات) کو کہتے ہیں جو تقاریب اور مراسم میں اُس نظام یا مملکت کے قائمقام سمجھی جاتی ہیں ۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا اُس کے شعائر میں سے ہوتا ہے ۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دل میں اُس سلطنت کا احترام ہے ۔ قرآن کریم نے جن محسوس علامات کو شعائر اللہ قرار دیا ہے اُن سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکومتِ خداوندی (قرآنی نظام مملکت) کے محسوس نشان ہیں جن کا احترام درحقیقت حکومتِ خداوندی کے احترام کا مرادف ہے ۔ اس سے زیادہ ان محسوس علامات ( Symbols ) کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی ۔ (نیز دیکھئے عنوان ش ۔ ع ۔ ر) ۔

## م ر ی

مَرَی النَّاقَةَ یَمْرِیْھَا مَرْیاً ۔ اونٹنی کے تھنوں کو ہاتھ سے سہلانا (مس کرنا) کہ وہ دودھ دیدے ۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں ۔ چنانچہ اَلْمِرْیَةُ ۔ اور اَلْمَرْیَةُ ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جو اسطرح نکالا جائے**۔

اس سے اس کے معنی ہیں تردد اور کوشش سے کسی بات کا نکالنا ۔ چنانچہ مِرْیَةُ الْفَرَسِ کے معنی ہیں وہ چال جو گھوڑا وغیرہ کھانے سے گھوڑا نکالے** ۔ لہذا مِرْیَةٌ کسی معاملہ میں تردد کو کہتے ہیں ۔ نیز شک اور جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ راغب نے ان معانی کی یہی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ مِرْیَةٌ شک سے خاص ہوتا ہے* ۔ جھگڑے کے مفہوم میں مناوی نے کہا ہے کہ مِرَاءٌ دوسرے کے کلام میں اظہار خلل کے لئے طعن کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے آدمی کی تحقیر کی جائے، اور بس ۔ اِمْتَرَی فِیْہِ وتَمَارَی کے معنی شک کرنے کے ہیں ۔ فراء نے تَتَمَارَی کے معنی تکذیب کرنے کے بتائے ہیں** ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ (۴۲/۱۸) ۔ جو لوگ اَلسَّاعَةُ کے بارے میں شک اور تردد میں پڑے ہیں ۔ سورہ کہف میں ہے ۔ فَلَا تُمَارِ فِیْھِمْ (۱۸/۲۲) ۔ ان سے ان کے بارے میں جھگڑا مت کر ۔ سورہ بقرہ میں ہے ۔ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۲/۱۴۷) ۔ جھگڑا کرنے والوں یا شک اور تردد کرنے والوں میں سے نہ ہوجا ۔

## مریم

مَرْیَمُ ۔ یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کوئی بہت ہی عجیب بات کرتا ہے اسے عرب

*راغب ۔ **تاج ۔

يَا مَرْيَمُ کہکر خطاب کرتے ہیں ۔ اور اَلْمَرْيَمُ مِنَ النِّسَاءِ اُس عورت کو کہتے ہیں جو مردوں کے ساتھ باتیں کرنا پسند کرے لیکن برائیوں سے دور رہتی ہو* ۔

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کا نام مریم بتایا ہے ۔ (۳/۴۵) ۔ آپ (حضرت مریمؑ) کی والدہ کو اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۴) کہکر پکارا گیا ہے ۔ اس کے معنی ” عمران کی بیوی ،، یا ” آل عمران کی عورت ،، کے ہیں ۔ سورہ مریم میں ہے کہ آپ کی قوم کے لوگوں نے آپ کو یااُخْتَ هٰرُوْنَ (۱۹/۲۸) ” اے هارون کی بہن ،، بھی کہا تھا ۔ اس کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ آپ کے کسی بھائی کا نام هارون تھا ۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت هارونؑ (مورث اعلیٰ) کیطرف نسبت کی وجہ سے ایسا کہا گیا تھا ۔ سورہ تحریم میں آپ کو اِبْنَتَ عِمْرَانَ (۶۶/۱۲) کہا گیا ہے ۔

آپ کی والدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے منت مانی تھی جس کی بنا پر آپکو هیکل کی خدمت کے لئے مختص کر دیا گیا (۳/۳۵-۳۶) ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ح ۔ ر ۔ ر)

حضرت عیسیٰؑ کو قرآن کریم میں عام طور پر ”ابن مریم،، کہکر پکارا گیا ہے ۔ رینان اپنی کتاب (Life of Jesus) میں اس ضمن میں لکھتا ہے ۔

”آپ (حضرت عیسیٰؑ) طبقۂ عوام سے متعلق تھے ۔ آپکے والد ، یوسف اور والدہ ، مریم ، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے ۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا ۔ . . . . آپ کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا ۔ اس کے بعد حضرت مریمؑ ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں ۔ یہ وجہ ہے کہ حضرت مسیحؑ عام طور پر ” ابن مریم ،، کے نام سے موسوم ہوئے ۔ یعنی جب آپکو آپکے همنام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو ”یسوع ابن مریم ،، یا ابن مریم کہا جاتا تھا ،، ۔

حضرت مریمؑ کی زندگی کے متعلق تفصیلی حالات میری کتاب ”شعلۂ مستور ،، میں ملیں گے ۔

## م ز ج

اَلْمَزْجُ ۔ ملانا ۔ مَزَجَ الشَّرَابَ بِالْمَاءِ ۔ اس نے شراب میں پانی ملا دیا ۔ مِزَاجٌ ۔ وہ شے جو (شراب میں) ملائی جائے** ۔ مِزَاجُ الْخَمْرِ کَافُوْرٌ ۔ اس شراب میں کافور کی خوشبو ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

دو ملی ہوئی چیزوں میں سے ہر شے دوسری کیلئے مِزَاجٌ کہلاتی ہے ۔ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ ۔ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا (۷۶/۵) ۔ وہ ایسے پیالہ سے پیتے ہیں جس میں کافور کی آمیزش ہوتی ہے ۔ كَافُوْر ( دیکھئے ک ۔ ف ۔ ر) کی تاثیر یہ ہے کہ وہ حدت کو برودت (ٹھنڈک) میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ ایک منظم اور بامقصد جماعت کی پہلی منزل اپنے اوپر پابندیاں عائد کرکے ڈسپلن پیدا کرنے کی ہوتی ہے ۔ پھر اس کے بعد اگلی منزل یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کی مدافعت میں ، نظامِ خداوندی کے مخالفین کے مقابلہ میں سخت گرم جوشی دکھاتے ہیں ۔ اس کے لئے کہا کہ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (۷۶/۱۷) یہ اس پیالہ سے پیتے ہیں جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوتی ہے ۔ سونٹھ کی تاثیر حدت پیدا کرنا ہوتی ہے ۔ اس جماعت کے لئے یہ دونوں منزلیں ضروری ہیں ۔ یا یہ کہ وہ اپنوں کے ساتھ ٹھنڈک کا برتاؤ کرتے ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں گرمی کا ۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان (اقبال)

متضاد اور مخالف قوتوں میں صحیح صحیح امتزاج سے مومن کی سیرت تعمیر ہوتی ہے ۔ اسی کو اپنے اندر الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى کا منعکس کرنا کہتے ہیں ۔ یعنی مختلف صفات خداوندی کا خاص تناسب و توازن سے اپنے اندر اجاگر کئے جانا ۔

# م ز ق

مَزَقَهُ ۔ يَمْزِقُهُ ۔ اس نے اسکو پھاڑ دیا ۔ یا اس میں سوراخ کردیا ۔ فَتَمَزَّقَ ۔ پس وہ پھٹ گیا ۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اَلْمِزَقُ ۔ پھاڑے ہوئے کپڑے وغیرہ کے ٹکڑے ۔ تَمَزَّقَ الْقَوْمُ ۔ قوم منتشر اور پراگندہ ہو گئی * ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۷) ۔ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جاؤ گے ۔ اس دنیا میں قومی ضعف و انتشار ، اور مرنے کے بعد طبعی انتشار ، دونوں کو محیط ہو سکتا ہے ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ *تاج و محیط ۔

# م ز ن

اَلْمُزْنُ - وہ سفید اور روشن بادل جس میں پانی ہو۔ اس قسم کے بادل کا ٹکڑا مُزْنَۃٌ کہلائیگا*۔ فُلَانٌ یَتَمَزَّنُ۔ فلاں آدمی بادل کی مشابہت اختیار کرتا ہے - یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے**۔ قرآن کریم میں پانی کے متعلق ہے - ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ .... (۵۶/۶۹)۔ کیا اُسے بادل میں سے تم نیچے لاتے ہو...؟ یعنی سامانِ رزق سب کا سب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

# م س ح

اَلْمَسْحُ - پونچھنا - کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ہاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینا، جیسے مَسَحْتُ رَاْسِیْ مِنَ الْمَاءِ وَجَبِیْنِیْ مِنَ الرَّشْحِ - میں نے پانی کو اپنے سر سے اور پسینے کو اپنی پیشانی سے پونچھ ڈالا - ابو زید نے کہا ہے کہ کلام عرب میں مَسَحَ کے معنی تر کرنے یا دھونے کے بھی ہیں - یعنی آلائش کو پانی کے ساتھ صاف کردینا - مَسَحْتُ یَدِیْ بِالْمَاءِ - میں نے اپنے ہاتھ کو پانی سے دھویا - اور تَمَسَّحْتُ بِالْمَاءِ - میں نے غسل کیا* - ابن فارس نے لکھا ہے کہ مَسَحْتُہٗ بِیَدِیْ کے معنے ہیں ، میں نے اس پر اپنا ہاتھ پھیرا - سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے گھوڑے ان کے سامنے آئے فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ (۳۸/۳۳) - تو وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا - ( جیسے سوار اپنے گھوڑوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں)۔

اَلْمَسْحُ - اَلْمِسَاحَۃُ - ناپنا - مَسَحَ الْاَرْضَ - اس نے زمین کی پیمائش کی* - اس کا (Survey) کیا - اَلْمِسْحُ - راستے کو کہتے ہیں اور اَلْمَسِیْحُ اس شخص کو جو بہت چلنے والا (سیر و سیاحت کرنے والا) ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پھیلا کر کسی چیز پر چلانا۔

حضرت عیسیٰؑ کو مَسِیْحٌ بھی کہتے ہیں (۳/۴۴) - صاحب قاموس نے اس کے اشتقاق میں قریب پچاس اقوال نقل کئے ہیں* - ان میں ایک یہ بھی ہے (اور راغب نے اس کی تائید کی ہے کہ) چونکہ آپ بہت چلنے والے تھے اس لئے آپ کو مَسِیْحٌ کہا گیا ہے - اس کے بعد راغب لکھتا ہے

*تاج - **راغب -

کہ اُن کے زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے تھے - انہیں مَشّائِیْنَ اور سَیّاحِیْنَ کہا جاتا تھا**- اور حضرت مسیح ؑ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے ، اس لئے انہیں مَسِیْح* کہا گیا ہے*** - لیکن صاحب محیط نے کہا ہے کہ قدیم زمانہ میں کاہنوں اور بادشاہوں کے بدن پر تیل وغیرہ کی مالش کی جاتی تھی - چنانچہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بدن پر بھی مالش کی گئی تھی اس لئے آپ کو مَسِیْح* کہا گیا (The Annointed)****- (نیز دیکھئے عنوان س - ی - ح جس میں لکھا گیا ہے کہ مَسِیْح* غالباً عربی لفظ نہیں) -

سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب تم صلٰوۃ کے لئے اٹھو تو فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ - اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک ہاتھوں کو دھو لیا کرو - اس کے بعد ہے وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (۵/۶) - یہاں چونکہ وَ امْسَحُوْا - فَاغْسِلُوْا سے الگ آیا ہے اس لئے اس کے معنی دھونے کے نہیں ہونگے - صرف پونچھ لینے کے ہونگے -

اس سے آگے ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو ، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے ، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو - فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا - تو پاکیزہ مٹی کا قصد کرو - فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِنْهُ (۵/۶ و ۴/۴۳) - ''پاکیزہ مٹی کا قصد کرو'' - بات تو قرآن کریم نے اتنی ہی کہی ہے لیکن اس اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ بدن کی آلائش کو پاکیزہ مٹی سے صاف کر لیا کرو - اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لیا کرو'' - یعنی پونچھ لیا کرو -

اصل یہ ہے کہ صلٰوۃ سے پہلے وضو سے جہاں مقصود ہاتھ پاؤں کو پاک اور صاف کرنا ہے وہاں اس سے مراد ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تمہیداً ضروری ہوتی ہے - پانی نہ ملنے (یا اس سے پرہیز) کی صورت میں ہاتھ پاؤں دھونے کا مقصد حل نہیں ہو سکتا، لیکن ''تیمم'' سے صلٰوۃ کی تیاری کا نفسیاتی پہلو ضرور سامنے آجاتا ہے - یعنی اس سے انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے -

## م س خ

اَلْمَسْخُ - کسی کی شکل و صورت بدل دینا اور بگاڑ دینا - یعنی پہلی شکل کے مقابلہ میں زیادہ بد نما اور قبیح بنا دینا*****- راغب نے کہا ہے کہ

*تاج- **راغب - ***اس فرقہ کا نام (Essenes) ایسینی تھا- تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شعلۂ مستور (تذکرہ حضرت عیسیٰ)- ****محیط - *****تاج و راغب و محیط

بگاڑنے اور قبیح بنانے کا یہ عمل جسمانی ساخت میں بھی ہوتا ہے اور عادات و اخلاق میں بھی ۔ لیکن دونوں صورتوں میں ، یہ تبدیلی قباحت کو لئے ہوئے ہوگی ۔ اس نہج سے اَلْمَسِيْخُ مِنَ النَّاسِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس میں حسن اور ملاحت نہ ہو ۔ یا جو کمزور اور احمق ہو ۔ لَحْمٌ مَسِيْخٌ ۔ وہ گوشت جس میں کوئی مزہ نہ ہو* ۔ طَعَامٌ مَسِيْخٌ ۔ وہ کھانا جس میں نہ نمک ہو ، نہ رنگ نہ مزہ ۔ اِنْمِسَاخُ حَمَاةِ الْفَرَسِ ۔ گھوڑے کی ٹانگ کی مچھلی کا لاغر ہو جانا (تاج) ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ (۳۶/۶۷) ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کی قوت و مقدرت کے باوجود انہیں کمزور و عاجز کر دیں ۔ ان کی قوت و مقدرت مبدل بہ ضعف و درماندگی ہو جائے ۔

## م س د

اَلْمَسْدُ ۔ بٹنا ۔ مَسَدَ الْحَبْلَ ۔ اس نے رسی کو بٹ دیا ۔ اَلْمَسَدُ ۔ کھجور کے پٹھے جنہیں بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے ۔ اس طرح بٹی ہوئی رسی کو بھی کہتے ہیں** ۔

قرآن کریم میں حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ (۱۱۱/۵) آیا ہے ۔ یعنی کھجور کے پٹھوں کی بٹی ہوئی رسی ۔ قانونِ مکافات کی محکم گرفت مراد ہے ۔

## م س س

مَسٌّ ۔ چھونا ۔ کسی چیز تک پہنچنا** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَسٌّ لَمْسٌ کے ہم معنی ہے ۔ فرق یہ ہے کہ لَمْسٌ تلاش کرنے اور ٹٹولنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو تلاش کیا جا رہا ہو وہ مل بھی جائے ، برخلاف مَسٌّ کے کہ اس کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب کہ حاسّہ لَمْس کے ذریعہ اس چیز کا ادراک بھی کر لیا جائے ۔

(۱) کسی چیز کا جو ابتدائی اثر ہو اسے بھی مَسٌّ کہتے ہیں ۔ وَجَدَ فُلَانٌ مَسَّ الْحُمّٰى ۔ اسے بخار کی ابتدائی کیفیت محسوس ہوئی ۔ لَمْ يَجِدْ مَسًّا مِنَ النَّصَبِ ۔ اسنے ذرا سی بھی تھکن محسوس نہ کی ۔ نیز ، ہر پیش آنے والی چیز اور اذیت کو مَسٌّ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ مجازاً اس کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے** ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ نیز ابن فارس ۔ **تاج و راغب ۔

اَلتَّمَاسُّ باہم ایک دوسرے کو چھونا ۔ کنایۃً مجامعت کو کہتے ہیں * (۵۸/۳)۔ مجامعت کے لئے مَسٌّ اور مَسَاسٌ بھی استعمال ہوتا ہے ** ۔ (۲/۲۳۶) میں مجامعت کے لئے تَمَسُّوْھُنَّ آیا ہے ۔

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جس سامری نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا اسے سزا یہ دی گئی تھی اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (۲۰/۹۷)۔ تاج العروس میں ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو کہتا رہے کہ میں کسی کو نہیں چھوتا اور کوئی مجھے نہ چھوئے ۔ مطلب یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اور اسطرح وہ '' اچھوت'' (Un- Touchable) بن گیا تھا ۔ یعنی اُس سے سب نے معاشرتی تعلقات منقطع کر لئے تھے ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ لَمْسٌ ہاتھ سے چھونے کے لئے خاص ہے اور مَسٌّ عام ہے ۔ یعنی ہاتھ سے چھونے اور بدن کے کسی عضو سے چھونے کے لئے بھی آتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے ۔ یعنی یہاں قرآن کریم کو مس کرنے کے معنی اسے چھونا نہیں ، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے **۔ روح المعانی سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی تطہیر اور قلب و دماغ کی پاکیزگی اولین شرط ہے ۔ جو شخص غیر قرآنی خیالات اور نظریات کو لیکر قرآن کریم کی طرف آئیگا، قرآنی حقائق اس پر کبھی بے نقاب نہیں ہونگے ۔ فکر و ادراک کی پاکیزگی کے ساتھ ہی قلب و نگاہ کی عفت و تطہیر بھی ضروری ہے ۔ جو قلب انسانیت سوز خیالات کی آماجگاہ ہو وہ قرآن کریم کی روشنی سے منور نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم سے راہ نمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو خالی الذہن ہو کر اسکی طرف آئے اور اس کے دل میں تلاش حقیقت کی سچی تڑپ ہو ۔ پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن کریم سے مس نہیں ہو سکتا ۔

## م س ک

اَلْمَسْکُ ۔ کھال (جس میں گوشت اور ہڈیاں وغیرہ بند رہتی ہیں یا جس کی مشک وغیرہ بنائی جاتی ہے) ۔ چونکہ مشک وغیرہ پانی کو روک لیتی ہے اس لئے مَسَکَ بِہٖ ۔ اَمْسَکَ ۔ تَمَاسَکَ ۔ اِسْتَمْسَکَ ۔ تَمَسَّکَ ۔ مَسَّکَ کے معنی ہیں کسی کو پکڑ لینا ۔ کسی چیز سے چمٹ

*تاج و راغب ۔ **محیط و تاج ۔

جانا * ۔ اَلاِمْسَاکُ ۔ بخل کرنا ** ۔ اَلْمِسْکُ ۔ مُشک * (کیونکہ وہ اُس خون سے ترتیب پاتی ہے جو ہرن کے نافہ میں رک گیا ہو) ۔

سورۂ بقرہ میں اِمْسَاکٌ بمقابلہ تَسْرِیْحٌ آیا ہے (۲/۲۲۹) ۔ یعنی نکاح میں رکھنا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ اِنْفَاقٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔ سورۂ فاطر (۳۵/۲) میں یہ فَتَحَ (کھولدینے) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور (۳۵/۴۱) میں زَالَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور زَالَ کے معنی اپنی جگہ سے ھٹ جانا ھیں ۔ سورۂ ص (۳۸/۳۹) میں مَنَّ (احسان کرنے) کے مقابلہ میں اَمْسَکَ آیا ہے ۔ اس میں بھی بخل کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ سورۃ تطفیف میں جنت کی ''شراب'' کے متعلق ہے خِتٰمُہٗ مِسْکٌ (۸۳/۲۶) ۔ اس کی مہر مشک کی ہے ۔

سورۃ مائدہ میں شکاری جانوروں کے شکار کے سلسلے میں ہے فَکُلُوْا مِمَّا اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۵/۴) ۔ ''جس شکار کو وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں ۔ اس میں سے کھاؤ'' ۔

# م س و (ی)

اَلْمَسَاءُ ۔ شام کے وقت کو کہتے ھیں ۔ صَبَاحٌ کی ضد ہے ۔ مَسَاکَ فُلَانٌ وَاَمْسٰی وَمَسّٰی ۔ فلاں آدمی نے تجھ سے کسی بات کا وعدہ کیا مگر پھر اس نے اس کے پورا کرنے میں دیر لگا دی ۔ مَسَّاکَ اللّٰہُ بِالْخَیْرِ ۔ خدا تمہاری شام بھلائی کے ساتھ گزارے ۔ اَلْمُمْسٰی وَالْمِمْسٰی ۔ شام کا وقت *** ۔ اَمْسٰی ۔ وہ شام کے وقت میں داخل ہوا ۔

ابن القوطیہ نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ ظہر سے مغرب تک کے درمیانی وقت کو کہتے ھیں ۔ محمد نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ کا لفظ دو وقتوں پر بولا جاتا ہے ۔ ایک تو زوالِ آفتاب کے وقت پر اور دوسرے اس وقت پر جب آفتاب غروب ہو ** ۔ عرب کے لوگ مَسَاءٌ کا لفظ کنایۃً تباہی اور شر کے لئے ، اور صَبَاحٌ کا لفظ مسرت اور خیر و برکت کے لئے بولتے ھیں ** ۔

قرآن کریم میں ہے فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰/۱۷) ''پس اللہ کے لئے پاکیزگی ہے جب تم شام کے وقت میں داخل ہوتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو'' ۔ یہ اس کا عام ترجمہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات زمان (Time) کے تعینات سے بلند ہے ۔ صبح ، شام (یا رات دن) کے امتیازات تمہارے لئے ھیں ۔ خدا کی ذات ان تحدیدات اور تعینات سے بہت بلند ہے ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** محیط ۔ *** تاج ۔

۴

# مسیح

حضرت عیسیٰ ؑ کا دوسرا نام (۳/۴۴) یا لقب ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ ح ۔ نیز عیسیٰ ؑ ۔ (آپ کی زندگی کے تفصیلی حالات میری کتاب شعلۂ مستور'' میں ملینگے )۔

# م ش ج

مَشَجَ بَيْنَهُمَا ۔ اس نے دونوں کو باھمدگر خلط ملط کر دیا ۔ ملا دیا *۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ھیں ۔ شَيْئٌ مَشِيْجٌ ومَشْجٌ ۔ ملی ھوئی چیز ۔ اسکی جمع اَمْشَاجٌ ھے *۔

قرآن کریم میں ھے ۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (۷۶/۲) ۔ ھم نے انسان کو اس نطفہ (مادہ) سے پیدا کیا جس میں مختلف جوھر امکانی شکل میں(Potentialities)مخلوط ھوتے ھیں ۔ اس سے رحم مادر میں جنین وجود میں آجاتا ھے ۔ نَبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (۷۶/۲)۔ پھرھم ایسا انتظام کر دیتے ھیں کہ جنین کے ان مضمر جوھروں کی نمود ھو جائے تا آنکہ وہ صاحب سماعت و بصیرت بن جائے ۔

# م ش ی

مَشْیٌ ۔ پیدل چلنا ۔ راغب نے کہا ھے کہ مَشْیٌ کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اپنے ارادے سے منتقل ھونے کے ھیں ۔ مجازاً مَشْیٌ کے معنی راہ پا جانے اور رھنمائی حاصل کرنے کے بھی آتے ھیں **۔ اَلْمَاشِيَةُ (جمع اَلْمَوَاشِي) اونٹ بکری وغیرہ چوپایوں کو کہتے ھیں ۔ تاج العروس میں ھے کہ دراصل مَشَاءٌ کے معنی کثرت اور نشوو نما کے ھیں ۔ چنانچہ اِمْرَاَةٌ مَاشِيَةٌ اس عورت کو کہتے ھیں جس کے بہت بچے ھوں **۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) انسان وغیرہ کی حرکت ۔ اور (۲) نمو اور زیادتی کے ھیں ۔

قرآن کریم میں قَامُوْا کے مقابلہ میں مَشَوْا آیا ھے (۲/۲۰)۔ یعنی چلنا۔ سورہ اعراف میں ھے ۔ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَا (۷/۱۹۵)۔ کیا ان کے پاؤں ھیں جن کے ذریعہ وہ چل سکتے ھیں ؟

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط۔

سورہ قلم میں مَشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ آیا ہے (۶۸/۱۱)۔ اسکے معنی ہیں وہ شخص جو بہت زیادہ ادھر کی باتیں اُدھر پہنچاتا رہے ۔ کبھی اس کے پاس پہنچے کبھی اُس کے پاس جائے ، اور اسطرح لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرے ۔

# م ص ر

اَلْمِصْرُ ۔ دو چیزوں کے درمیان حد کو کہتے ہیں ۔ شہر کو مِصْرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مَمْصُوْرٌ یعنی محدود ہوتا ہے ۔ اس کے گردا گرد حد بندی کی جاتی ہے ۔ مِصْرٌ کے معنی ہیں کوئی شہر یا علاقہ ۔ اور مِصْرُ۔ ملک مصر (Egypt) کو کہتے ہیں ۔ سرخ مٹی کو بھی مِصْرٌ کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں مِصْرٌ ( بمعنی شہر) سورہ بقرہ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔ میدانوں کی بے پایاں وسعتوں کے مقابلہ میں ، محدود بستی۔

# مُصَیْطِرٌ

اسکا مادہ س ۔ ط ۔ ر ہے ۔ اسے اُسی عنوان کے تابع دیکھئے ۔

# م ض غ

اَلْمُضْغَةُ ۔ گوشت کا ٹکڑا ۔ ( گوشت کے علاوہ دوسری چیزوں کے ٹکڑے کو بھی کہہ سکتے ہیں )۔ مُضْغَةٌ مِنَ اللَّحْمِ ۔ گوشت کی اتنی مقدار کو کہتے ہیں جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالی جا سکے۔ اَلْمَضَاغُ ۔ جو چیز چبائی جائے ۔ مَضَغَہٗ یَمْضَغُہٗ مَضْغاً ۔ کسی چیز کو دانتوں سے چبانا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

قرآن کریم میں جنین ( رحم میں بچے ) کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت کو مُضْغَةٌ (۲۲/۵) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ حالت جس میں جنین ایک گوشت کے لوتھڑے کے مانند ہوتا ہے ( اور اس میں ہنوز ہڈیاں سخت نہیں ہوتیں ) ۔

# م ض ی

مَضَی الشَّیْءُ ۔ یَمْضِیْ ۔ کسی چیز کا ( پہلے ) گزر جانا اور چلے جانا ۔ مَضَی السَّیْفُ مَضَاءً ۔ تلوار نے کاٹ دیا ( تیز ہونے کی وجہ سے)۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔

اَلْمَاضِيْ - شیر ، کیونکہ وہ اپنی جرأت کی وجہ سے آگے ہی آگے رہتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے - تلوار ( جو تیز ہو) کیونکہ وہ جس چیز پر ماری جاتی ہے اُسے کاٹ دیتی ہے * -

قرآن کریم میں ہے - فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۸/۳۸) - امم سابقہ کی سنت گذر چکی ہے - تاریخی وقائع و حوادث سے مراد ہے -

## م ط ر

اَلْمَطَرُ - بارش * - (۳/۱۰۲) - اَلْاِمْطَارُ - عذاب کی بارش کے لئے بھی بولتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ مَطَرَ اس بارش کے لئے بولتے ہیں جسکے نتائج خوش گوار اور بھلے ہوں - اور اَمْطَرَ اس کے لئے جو نقصان رساں ہو** - ابن فارس کہتا ہے کہ اُمْطِرَ (مجہول) صرف عذاب ہی کے لئے آتا ہے - قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق ہے - وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا (۷/۸۴) ,, اور ہم نے ان پر ایک بارش برسائی - مُمْطِرٌ - بارش لانے والا - هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (۴۶/۲۴) - یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے -

## م ط ی (و)

مَطَا - مَطْوًا - اس نے چلنے میں پورا زور لگایا اور تیز چلا - مُطَوَاءٌ - انگڑائی - بیشتر بخار کے وقت آنے والی انگڑائی کو کہتے ہیں - اسی سے مَطَا وَتَمَطّٰی کے معنی بڑھنا ، لمبا ہونا ، دراز ہونا ، ہو گئے - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - چنانچہ تَمَطَّى النَّهَارُ کے معنی ہیں دن نے انگڑائی لی - یعنی طلوع آفتاب کے بعد اس نے بڑھنا شروع کیا - اَلتَّمَطِّيْ کے معنی ہیں اکڑ کر چلنا - اتراتے ہوئے جانا - چلنے میں ہاتھوں کو بڑھانا اور پھیلانا *** - راغب نے لکھا ہے کہ المَطَا پشت کو کہتے ہیں اور تَمَطّٰی کے معنے ہیں اپنی پیٹھ کو اونچا کرنا اور بڑھانا - (اکڑنے میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ) - قرآن کریم میں ہے - ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (۷۵/۳۳) - ,, وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اتراتا ہوا گیا ،، -

## مع

مَعَ - ساتھ - یہ لفظی و معنوی دونوں معینوں کے لئے بولا جاتا ہے - جسمانی معیت کے لئے قرآن کریم میں ہے - دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ (۱۲/۳۶) - ,,اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے،، - اور معنوی معیت

---

*تاج **راغب - ***تاج و راغب -

کے لئے - وَ اللہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۶۶) - ''اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ اور صابرین کسی مقام پر (ایک جگہ) اکٹھے ہوجاتے ہیں - یا اللہ صابرین کے زمرے میں شامل ہوجاتا ہے - اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت صابرین کے ساتھ ہوتی ہے -

کبھی یہ عِنْدَ - یعنی ''پاس'' - کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسا کہ کہتے ہیں - جِئْتُ مِنْ مَعِ الْقَوْمِ - میں قوم کے پاس سے آیا

# م ع ز

مَعْزٌ (جمع - واحد مَاعِزٌ) بکری* - (۶/۱۴۴) - گٹھیلے بدن والے قوی آدمی کو بھی اَلْمَاعِزُ کہتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور صلابت کے ہیں - اور بکری کو اَلْمَعْزُ اس لئے کہتے ہیں کہ ضَأْنٌ (بھیڑ) کے مقابلہ میں اس میں ایک طرح کی سختی ہوتی ہے -

# م ع ن

اَلْمَعْنُ - معمولی اور حقیر چیز - ایک طرف یہ قصیر اور قلیل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف، طویل اور کثیر کو بھی کہتے ہیں - زمین کے اوپر بہنے والا پانی - اَلْمَاعُوْنُ - ہر بھلائی - بارش - کیونکہ وہ خدا کی طرف سے بلا مشقت مل جاتی ہے - پانی - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - ہر وہ چیز جو یونہی بلا مشقت مل جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے۔ وہ چیزیں جو مانگنے والوں سے روکی نہ جائیں - سامانِ نشو و نما - مَعَنَ الْفَرَسُ - گھوڑا دوڑتے ہوئے دور نکل گیا - مَعَنَ الْمَاءُ - پانی بہا - مَعَنَ النَّبْتُ - پودے پانی سے سیراب ہو گئے - مَعِیْنٌ - جاری پانی جو کھلا ہوا بہ رہا ہو**- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بہنے یا چلنے وغیرہ میں سہولت کے ہیں - یعنی آسانی سے کسی کام کا ہو جانا -

قرآن کریم میں ہے - ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ (۲۳/۵۰) - ایسی سر زمین جو ہموار ہو اور اس میں پانی جاری ہو - سورۃ ماعون میں ہے وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) - وہ ان چیزوں کو روک رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے منفعتِ عامہ کے لئے ملی ہیں - یعنی سامان نشو و نما جسے بہنے پانی کی طرح عام ہونا چاہئے*** - جسے آبِ رواں کی طرح ہر ضرورتمند کے دروازے کے سامنے سے گزرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لے -

---

*تاج - **تاج و محیط و لطائف اللغۃ - ***ابن قتیبہ (القرطین - ج/۲ صفحہ ۲۱۹)

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْن عَیْن سے ہے* - اسی لئے اسے عَیْن (ع - ی - ن) کے عنوان کےتحت بھی لکھا گیا ہے - وھاں بھی دیکھ لینا چاھئے -

## م ع ی

اَلْمَعْیُ - اَلْمِعیٰ - آنت - (جمع اَمْعَاءٌ) - اَلْمَاعِیَۃُ - ٹکڑے ٹکڑے کاٹی ھوئی چیز - تَمَعّی الشَّرُّ فِیْمَا بَیْنَھُمْ - شر اُن کے درمیان پھیل گیا ** - قرآن کریم میں جھنم کے گرم پانی کے متعلق ہے کہ وہ حیات بخش ھونے کی بجائے ہلاکت آفریں ھوگا - فَقَطَّعَ اَمْعَاءَ ھُمْ (۴۷/۱۵) - اور اُن کی انتڑیاں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا - ان کی حیاتِ انسانی منقطع ھو جائیگی - یا زندگی بخش ذرائع ختم ھو جائینگے - سامان و ذرائعِ نشوونما سے محرومی ھو جائیگی - (غذا کو جزوِ بدن بنانے کا بڑا ذریعہ انتڑیاں ھوتی ھیں) -

## م ق ت

اَلْمَقْتُ - سخت بغض اُس شخص کے خلاف جسے تم دیکھو کہ وہ برے کام کا خوگر ھوگیا* - نِکَاحُ الْمَقْتِ - باپ کے مر جانے پر اسکی منکوحہ سے نکاح کر لینا ، جاھلیت میں عربوں میں ایسے نکاح ھوتے رھتے تھے*** - قرآن کریم نے اسکی سخت ممانعت کی ہے (۴/۲۲) - ویسے عام نفرت اور بیزاری کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ھوا ہے - لَمَقْتُ اللّٰہِ اَکْبَرُ مِنْ مَقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۴۰/۱۰) - اللہ کی بیزاری تمہاری اپنی بیزاری سے کہیں بڑھ کر ہے - لیکن مَقْتُ اللّٰہِ کے معنی ھونگے انسان کے برے اعمال کے ناخوش گوار نتائج جو قانون خداوندی کے مطابق مرتب ھوتے ھیں - کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۳) - " اللہ کے نزدیک یہ نہایت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو کچھ کرتے نہیں ھو " - (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوانات غ - ض - ب اور س - خ - ط وغیرہ) -

## م ک ث

اَلْمَکْثُ - کسی جگہ پر انتظار کے ساتھ جم کر رھنا - اَلْمَاکِثُ - کسی جگہ انتظار میں ٹھہرنے والا - اَلْمُتَمَکِّثُ - منتظر - اَلْمَکَاثُ - دیر کرنا - ٹھہرنا - انتظار کرنا - اَلتَّمَکُّثُ - کسی کے انتظار میں ٹھہرے رھنا **** -

* راغب - ** تاج و محیط - *** تاج - **** تاج و محیط و راغب -

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم بقا چاہتے ہو - تمہاری آرزو یہ ہے کہ جریدۂ عالم پر تمہارا دوام ثبت ہو جائے - تم زندۂ جاوید ہو جاؤ - تمہارے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں - تو اس کے لئے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) - جو چیز تمام نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہوگی وہی دنیا میں باقی رہے گی - طبعی دنیا میں بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قانون کارفرما ہے - لیکن دنیائے انسانیت میں ''بقائے نافع'' کا قانون نفاذ پذیر ہے - لہذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو - جس سے ربوبیتِ عامہ ہو جائے - اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں - یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظام ربوبیت کا مطلوب ہے - کیونکہ اس کا خدا ''رب العالمین'' ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے - وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا (۱۷/۱۰۶) - قرآن کریم کو ہم نے بتدریج نازل کیا ہے - اور اس کے مضامین کو الگ الگ بیان کیا ہے تاکہ تو اسے اسی طرح سے، ٹھہر ٹھہر کر، بتدریج لوگوں کے سامنے پیش کرے - سورۃ نمل میں ہے - فَمَکَثَ غَیْرَ بَعِیْدٍ (۲۷/۲۲) - وہ تھوڑا عرصہ ٹھہرا - سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا اُمْکُثُوْا (۲۸/۲۹) - تم یہاں ٹھہرو -

## م ک ر

اَلْمَکْرُ - خفیہ تدبیر - چنانچہ جب غلہ کو گھروں میں چھپا کر رکھ لیا جائے (احتکار) تو اسے بھی اَلتَّمْکِیْرُ کہتے ہیں - جنگ کی تدبیر اور حیلہ کو بھی اَلْمَکْرُ کہتے ہیں* -

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ مَکْرٌ اس خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اس شخص کو جس کے خلاف یہ تدبیر کی جائے اس مقام تک پہنچا دے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو** -

قرآن کریم میں، نظام خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی سازشوں کو مَکْرٌ کہا گیا ہے - اور جماعتِ مومنین کی طرف سے ان کے جواب یا خدا

*تاج - **المنار ج/۳ صفحہ ۳۱۵ -

کے قانون مکافات کی رو سے ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو بھی مَکْرٌ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ۔ وَ اللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (۸/۳۰)۔ وہ تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے اور خدا (کا قانون) ان کے خلاف تدبیریں کر رہا تھا ۔ خدا کی تدبیریں بہترین ہوتی ہیں ۔ بڑی مؤثر اور کارگر ۔

## م ک ک

مَکَّ الْعَظْمَ ۔ اس نے ہڈی کو اس طرح چوس لیا کہ اس کا گودا سب صاف کر دیا* ۔ (ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔) مَکَّ الْفَصِیْلُ مَا فِیْ ضَرْعِ اُمِّہٖ ۔ اونٹنی کے بچے نے وہ تمام دودھ چوس لیا جو اس کی ماں کے تھن میں تھا ۔ مَکَّہٗ ۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا ۔ کم کر دیا* ۔

مَکَّۃُ ۔ یعقوب نے کہا ہے کہ مَکَّۃُ پورے حرم کو کہتے ہیں ۔ اور بَکَّۃُ شہر مکہ کو کہتے ہیں ۔ مَکَّۃُ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے ۔ مثلاً (۱) اسے اس لئے مَکَّۃُ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو کم کر دیتا یا فنا کر دیتا ہے ۔ (۲) چونکہ اس شہر میں پانی بہت کم تھا اس لئے یہاں کے باشندے یہاں کا پانی گویا چوس ڈالتے تھے یا سب کا سب نکال لیتے تھے ۔ (۳) مَکَّ کے معنی جذب کرنے اور کھینچنے کے بھی آتے ہیں ۔ یہ شہر چونکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا اور جذب کرتا ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ (۴) بَکَّ کیطرح مَکَّ بھی اژدھام کو کہتے ہیں ۔ اور چونکہ اس شہر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ یا بَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ (۵) مُکَاکٌ اور مُکَاکَۃٌ ۔ ہڈی سے نکالے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں* جو ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے ۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں مَکَّۃُ اس شہر کے لئے آیا ہے جس میں مسجد حرام ہے ۔ (۴۸/۲۴) ۔ اسی کو بَکَّۃُ بھی کہا گیا ہے (۳/۹۵) ۔ [دیکھئے عنوان ب ۔ ک ۔ ک] ۔

## مَکَّۃ

مکہ معظمہ ۔ (دیکھئے عنوان م ۔ ک ۔ ک اور ب ۔ ک ۔ ک) ۔

---

*تاج و راغب ۔

# م ک ن

المَکِیْنَۃُ - تمکن و اقتدار کو اور المُکْنَۃُ - قدرت و استطاعت کو کہتے ہیں - اَلْمَکَانَۃُ - وقار اور سکون کو کہتے ہیں ، اور المَکَانُ اس جگہ کو جو کسی چیز کو محیط اور اس پر حاوی ہو*- ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَلْمُکْنَاتُ پرندوں کے گھونسلوں کو کہتے ہیں - [بعض کے نزدیک مَکَانٌ کا مادہ (ک - و - ن) ہے] - نیز اس کے معنی سمت اور جہت کے بھی آتے ہیں - قرآن کریم میں ہے وَ یَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ ( ۱۴/۱۷ ) - ہر سمت سے اس کی طرف موت آ رہی ہوگی - (یہ مَکَانٌ ک - و - ن سے ہے) -

سورۃ نساء میں ہے زَوْجٍ مَکَانَ زَوْجٍ ( ۴/۲۰ ) ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی - سورۃ یونس میں مَکَانَکُمْ ( ۱۰/۲۸ ) - اپنی جگہ پر ٹھہرنے کے لئے آیا ہے -

مَکُنَ الشَّیْئُ - چیز قوی اور مضبوط ہوگئی - راسخ ہوگئی - اپنی جگہ پر جم گئی - اَمْکَنَ فُلَانًا اْلاَمْرُ - فلاں آدمی کے لئے وہ کام آسان اور سہل ہوگیا - اسے اس پر قدرت حاصل ہوگئی - تَمَکَّنَ مِنَ الْاَمْرِ - وہ اس پر قادر اور کامیاب ہوگیا* -

اس اعتبار سے مکان کے معنی قدر و منزلت اور رتبہ اور درجہ کے آتے ہیں - وَرَفَعْنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا ( ۱۹/۵۷ ) - اور ہم نے اسے بلند مرتبہ عطا کیا - استطاعت اور مقدرت کے معنوں میں سورۃ انعام میں ہے - اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ ( ۶/۱۳۵ ) - تم اپنی استطاعت بھر ، اپنی پوری پوری طاقت کے مطابق ، جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے پروگرام کے مطابق کرو - سورۃ یٰسٓ میں ہے - لَمَسَخْنٰھُمْ عَلٰی مَکَانَتِھِمْ ( ۳۶/۶۷ ) - ہم ان کی طاقت اور مقدرت کے باوجود انہیں مٹا ڈالیں - ان کی قوت و مقدرت کو کمزور و ناتوان بنا دیں - مَکِیْنٌ - زبردست قدرت اور منزلت والا - جو اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم کر بیٹھ جائے - عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ( ۸۱/۲۰ ) - صاحب عرش کے نزدیک قدر و منزلت والا - مَکَّنَ - جما دینا - مضبوط بنا دینا - قرار گیر بنا دینا - وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمْ ( ۲۴/۵۵ ) - وہ ان کے دین کو ان کے لئے قائم اور مضبوط کردیگا - جو نظام زندگی ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے اسے متمکن فی الارض کردیگا - نیز اس کے معنی حکومت عطا کرنا بھی ہیں - کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ( ۱۲/۵۶ ) - اسطرح ہم نے یوسف کو اس

*تاج - **محیط -

ملک میں حکمرانی عطا کر دی۔ اسے صاحب اختیارات بنا دیا ۔ اَمْکَنَہٗ مِنَ الشَّیْءِ ۔ اسے کسی چیز پر غلبہ اور قابو دے دیا ۔ سورہ انفال میں ہے ۔ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ (۸/۷۱) سو اللہ نے ان پر قابو پا لیا ۔

قرآن کریم نے اپنی صداقت کے پرکھنے کے لئے تین معیار بتائے ہیں۔ یا تو اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ یا تاریخی شواہد سے دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور یا استنتاجی طریق (Pragmatic test) کے ذریعے اسکی صداقت کو پہچانو (۱۰/۳۹)۔ استنتاجی طریق کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس کا دعوی سچا ہے یا نہیں ۔ اسے اپنے دعوی کی صداقت پر اسقدر محکم یقین ہے کہ وہ اس استنتاجی طریق پر بڑا زور دیتا ہے ۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اپنے مخالفین سے بار بار کہتے ہیں کہ اِعْمَلُوا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ ۔ تم اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ اِنِّی عَامِلٌ ۔میں اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ (۶/۱۳۶) ۔ عنقریب (نتائج سے) معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار اس گھر (دنیا) کی کامیابی و کامرانی کس کے حصہ میں آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) ۔ تم دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کسقدر سچا ہے کہ جو قوم نوع انسانی کے حقوق میں کمی کرتی ہے اور خدا کے قوانین سے سرکشی برتتی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اسلام کو سچا ثابت کرنے کا یہ طریقہ تھا ۔ یعنی اس کے عملی نظام کے نتائج سے دنیا پر واضح کر دینا کہ یہ نظام کسطرح بے مثل و بے نظیر ہے ۔ یہ تھا اسلام کا دعوی ۔ اور اب حالت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے نظری دلائل سے کچھ متاثر بھی ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کی عملی حالت دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ جس ''مذہب'' پر چلنے والوں کی یہ حالت ہو وہ کس طرح نوع انسانی کی فلاح و فوز کا ضامن بن سکتا ہے ؟ اور اس پر بھی جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ تم جس ''مذہب'' پر چل رہے ہو یہ خدا کا وہ دین نہیں جو اس نے رسول اللہؐ کی وساطت سے بھیجا تھا تو انہیں اسقدر غصہ آجاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ انہوں نے اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر رکھا ہے ۔ اب ان کے پاس کوئی کسوٹی ہی نہیں جس سے اس کا فیصلہ کیا جاسکے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ

ٹھیک ہے یا غلط ۔ اسکی کسوٹی صرف ایک ہے ۔ اور وہ یہ کہ اعمال کے جو نتائج قرآن کریم نے بتائے ہیں ، اگر ہمارے اعمال سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام پا رہے ہیں ۔ اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ، تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام نہیں پا رہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اعمال کے نتائج مرنے کے بعد مرتب ہونگے لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام اعمال کے نتائج مرنے کے بعد ہی مرتب ہونگے اور اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آئیگا ۔ قرآن کریم کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور یہی وہ نتائج ہیں جن سے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے اور قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی ۔

# م ک و

مَکَا ۔ یَمْکُوْ ۔ مُکَاءً ۔ سیٹی بجانا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہاتھوں کو ایک خاص ہیئت سے اکھٹا کرکے سیٹی کی آواز نکالنے کو کہتے ہیں ۔ راغب نے مَکَا الطَّیْرُ کے معنی پرندہ کے سیٹی جیسی آواز نکالنے کے لکھے ہیں** ۔ اَلْمُکَّاءُ ۔ ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو باغات میں رہتا ہے * ۔ ( اس کا یہ نام اس لئے پڑا ہے کہ اسکی آواز سیٹی کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے ) ۔ قرآن کریم میں عہد جاہلیہ کے عربوں کے متعلق ہے ۔ مَاکَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَاءً وَّ تَصْدِیَۃً (۸/۳۵) ۔ خانہ کعبہ کے قریب ان کی صلوۃ بے معنی آوازوں اور بے مطلب حرکتوں کے سوا کچھ نہیں ۔ یعنی ایسی نماز جس میں محض چند الفاظ ( بلا سمجھے ) دھرا لئے جائیں اور چند حرکات ادا کر دی جائیں ۔ سوچئے کہ کیا آج ہماری نمازیں بھی بالعموم یہی کچھ بن کر نہیں رہ گئیں ؟ چند الفاظ کا دھرانا جنکا مفہوم نہ سمجھا جائے ۔ اور چند حرکات جن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ قرآن کریم نے جس صلواۃ کا حکم دیا تھا وہ قلب و دماغ کی تطہیر اور معاشرہ میں صالح انقلاب لانے کا ذریعہ تھی ۔ اس میں ہر شخص کو معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ کیوں ایسا کر رہا ہوں ۔ اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا ۔ دین ( نظام خداوندی ) کے پروگرام کی ہر کڑی ایک غایت لئے ہوتی ہے اور انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے ۔ لیکن جب دین کا مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کے پروگرام کی یہ

*تاج ۔ **راغب ۔

حیات بخش کڑیاں ، محض رسم بنکر رہ جاتی ہیں جن کی ادائیگی مقصود بالذات سمجھ لی جاتی ہے ۔ اس مقام پر دین ، '' مذہب'' بنکر رہ جاتا ہے ۔

# م ل أ

مَلَأَ الشَّيْئَ يَمْلَأُهُ مَلْأً ۔ کسی چیز کو بھر دیا ۔ فَامْتَلَأَ ۔ پس وہ بھر گئی ۔ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (۱۸/۷) ۔ میں ضرور جہنم کو بھر دونگا ۔ مِلْءٌ ۔ وہ مقدار جس سے کوئی چیز بھر جائے* ۔ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا (۳/۹۰) ۔ زمین بھر سونا ۔ مَالِئُوْنَ ۔ بھرنے والے (۳۷/۶۶) ۔

اَلْمَلَأُ ۔ باہم مشورہ کرنا ۔ نیز جماعت ۔ جتھا ۔ قوم کے سردار و شرفاء ۔ رؤساء و امراء و اکابر وغیرہ* ۔ اَلْمَلَأُ الْأَعْلٰى (۳۸/۶۹) ۔ بڑے بڑے سردار ۔ بالاتر گروہ کے افراد ۔ لیڈر قسم کے لوگ ۔ دوسری جگہ نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اَلْمَلَإِ الْأَعْلٰى کی باتیں نہیں سن سکتے (۳۷/۸) ۔ یہاں اس سے مراد ہے عالم بالا کی بلند جماعتیں ۔ یعنی خدا کے عالم امر کے متعلقین ۔ مدبراتِ امورِ السمٰوٰت ۔ الْمِيْلَاءُ و الْمِمْلَاءُ ۔ مال دار لوگ ۔ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں ۔ جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں* ۔ قرآن کریم میں اَلْمَلَأُ بھی انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی وہ لوگ أَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۳/۳۳) ۔ جنہیں سامان زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جس قوم میں بھی کوئی رسول آیا سب سے پہلے اس قوم کے دولت مند طبقہ نے اس کی مخالفت کی ۔ وَمَا أَرْسَلْنَا فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ایسا پیغام لاتے تھے جس کی سب سے بڑی زد دولت مند طبقہ پر پڑتی تھی ۔ اسی لئے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے پیغام کی مخالفت کرتے تھے ۔ اگر محض ''پوجا پاٹ'' کا سوال ہوتا تو دولت مندوں کا اس سے کیا بگڑتا تھا جو وہ اس کی مخالفت کرتے ۔ دولت مند تو بلکہ ایسے کاموں میں پیش از پیش حصہ لیتے ہیں اور چندے دیتے ہیں ۔ قرآن کریم کی تصریحات اس پر شاہد ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ جس انقلاب آفریں پروگرام کو لے کر آتے تھے اس میں رزق کے سرچشمے دولت مندوں کے ہاتھوں سے چھن

---

*تاج ۔

کر خدا کے قانونِ ربوبیت کے ہاتھوں میں آجاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ یہ طبقہ ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ آج بھی جہاں قرآنی انقلاب کی آواز اٹھیگی سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا اور مذہبی پیشوائیت اس مخالفت میں ان کے ساتھ ہوگی۔

(نیز دیکھئے عنوان ت۔ ر۔ ف)۔

## م ل ح

اَلْمِلْحُ۔ نمک۔ سخت نمکین (کڑوا) پانی جو شیریں پانی کی ضد ہوتا ہے۔ اَلْمَلَّاحُ۔ نمک فروخت کرنے والا۔ کشتی چلانے والا کیونکہ وہ ہمیشہ شور پانی میں رہتا ہے۔ عرب، نمک کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس لئے ذمہ داری اور پاس خاطر کے لئے بھی اَلْمِلْحُ کا لفظ بولتے تھے، اور حسن لطیف کے لئے بھی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سفید ہونے کے ہیں اور نمک کو مِلْحٌ اس کے سفید ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں کڑوے، سخت نمکین پانی کے لئے مِلْحٌ کا لفظ آیا ہے۔ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵/۵۳)۔ وہ بہت سخت کھاری ہے۔

## م ل ق

مَلَقَ۔ يَمْلِيقُ۔ مٹا دیا۔ نرم کیا۔ اَلْمَالَقُ۔ اس لکڑی کے تختے کو کہتے ہیں جس سے ہل چلائی ہوئی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے۔ مَلَقَ الْاَرْضَ تَمْلِيقًا۔ لکڑی کے تختے سے زمین کو ہموار کرنا۔ اسی سے، کسی شخص کو ہموار (یا خوش) کرنے کے لئے جو چاپلوسی کی جاتی ہے اسے بھی تَمَلُّقٌ و مَلَقٌ کہتے ہیں۔ اِنْمَلَقَ کے معنے ہیں چکنا اور ہموار ہونا۔ اَلْمَلَقَةُ۔ چکنے پتھر کو کہتے ہیں**۔ اَلْمَلِقُ۔ ضعیف اور کمزور کو کہتے ہیں جسے حوادث زمانہ نے رگید کر نرم و خوار کردیا ہو۔ اور اَلْمُمْلِيقُ اس شخص کو جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اَمْلَقَ مَا مَعَهُ۔ جو کچھ اس کے پاس تھا اسے خرچ کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ روکا۔ اسی سے رَجُلٌ اَمْلَقُ مِنَ الْمَالِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ مال و دولت نہ رہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی چیز سے عاری ہونے اور کسی چیز کے نرم ہونے کے ہیں۔ اِمْلَاقٌ۔ مفلسی۔

*تاج۔ **تاج و محیط۔

قرآن کریم میں ہے کہ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے۔ یعنی اس خدشہ سے کہ تم اس سے مفلس ہو جاؤ گے (۶/۱۵۲) مار نہ ڈالو یا علم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔ یاد رکھو! قرآنی نظام میں یہ ذمہ داری نظام کی ہوگی کہ تمہارے رزق کا بھی کفیل ہو اور تمہاری اولاد کے رزق کا بھی۔ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاهُمْ (۶/۱۵۲)۔ "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) بھی"۔ خدا کی اس قسم کی ذمہ داریاں، اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔

# م ل ک

مُلْکٌ۔ قوت رکھنا۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا *۔ اختیار و ارادہ۔ اتھارٹی۔ (Authority)۔ بنیاد محکم۔ وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو**۔ اسی لئے پانی اور غذا نیز دیگر اسباب و ذرائع کو بھی مِلْکٌ کہا جاتا ہے۔ عرب، لِیْ فِی الْوَادِیْ مِلْکٌ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وادی میں چراگاہ، پانی، مویشی، سب موجود ہیں۔ چونکہ صحرا میں زندگی کا سب سے بڑا سہارا پانی ہوتا ہے اس لئے پانی کو مِلْکٌ کہتے ہیں۔ لَیْسَ لَهُمْ مِلْکٌ کے معنی ہیں ان کے پاس پانی نہیں۔ ان کے ہاں محاورہ ہے اَلْمَاءُ مَلَکَ اَمْرَهُ۔ پانی ہر معاملہ کو درست کر دیتا ہے۔ یعنی جس کے پاس پانی ہو وہ اپنے معاملات میں آزاد ہوتا ہے اور اس کے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں***۔

جس ذریعے (یا چیز) سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسے مِلَاکُ الْاَمْرِ کہتے ہیں۔ اسی لئے مِلَاکٌ گارے کو بھی کہتے ہیں***۔ (کیونکہ اس سے پتھروں کو جوڑتے اور درست کرتے ہیں تاکہ حوض یا تالاب کا پانی ضائع نہ ہونے پائے)۔

مَلَکَ الْعَجِیْنَ یَمْلِکُهٗ۔ آٹے کو اچھی طرح گوندھنے کو کہتے ہیں جس سے اس کے سب اجزا یکسان ہو جائیں***۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ (م۔ ل۔ ک) کا خاصہ قوت اور شدت ہے****۔

مَلْکُ الطَّرِیْقِ (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ)۔ راستہ کی حد، نیز راستے کے درمیانی یا بڑے اور واضح حصے کو کہتے ہیں***۔ مَلَکُوْتٌ۔

*محیط۔ **لین۔ ***تاج و ابن فارس۔ ****العلم الخفاق۔

عزت و اقتدار ۔ حکومت و سلطنت ۔ نیز ملکِ عظیم کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ھے ۔ لیکن یہ اللہ تعالی کی مملکت کے لئے مخصوص ھے * ۔ اس لئے کہ کائنات میں تمام اختیار و اقتدار اُسی کا ھے ۔ وھی اسکی بنیاد اور سہارا ، اور اسکی تمام کار فرمائیوں کا مالک ھے ۔

مَالِکٌ کے معنی ھیں صاحب اختیارواقتدار ۔ سورہ نحل میں لاَ یَمْلِکُ کی تفسیر لاَ یَسْتَطِیْعُوْنَ (۷۳/۱۶) نے کر دی ھے ۔ اسی طرح مَمْلُوْکٌ کی تشریح لایَقْدِرُ عَلٰی شَیْئٍ (۷۵/۱۶) نے کر دی ۔ یعنی جسے کسی چیز پر کوئی اختیار نہ ھو ۔ اور سورہ یٰس میں فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ کے بعد وَذَلَّلْنٰھَا (۷۲/۳۶) نے واضح کر دیا کہ مَالِکٌ وہ ھے جس کے تابع دوسرا ھو جائے ۔ سورہ بقرہ میں ( حضرت طالوت کے تذکرہ کے ضمن میں ) جہاں بنی اسرائیل نے کہا ھے کہ وَابْعَثْ لَنَامَلِکًا ۔ (۲۴۶/۲)۔ تو اس کے معنی یہ ھیں کہ ھمارا کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے ( نُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) تاکہ ھم اس کی زیر کمان خدا کی راہ میں جنگ کریں ۔ کمانڈر، صاحبِ اقتدار ھی کو کہتے ھیں ۔ اس سے متصل آیت (۲۴۷/۲) میں بھی مُلْکٌ کے معنی اقتدار و اختیار (Authority) کے ھیں ۔ اسی طرح مَااَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا (۸۷/۲۰) کے معنی ھیں " ھم نے جو وعدہ تیرے ساتھ کیا تھا اسکی خلاف ورزی اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کی " * ۔

تصریحات بالا سے واضح ھے کہ خدا کے مَالِکٌ ھونے میں جہاں اس کے کامل اختیار و اقتدار کا تصور ھے اسکے ساتھ ھی یہ تصور بھی ھے کہ اسکی یہ مالکیت استبداد کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور درستگی کے لئے ھے تاکہ اس کا نظم و نسق ٹھیک ٹھیک قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا رھے اور ھر شے کو اسکی زندگی کی بنیادی ضروریات بہم پہنچتی رھیں ۔

قرآن کریم میں ایک اصطلاح آتی ھے ۔ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۔ اس کے لفظی معنی ھیں " جن کے مالک تمہارے دائیں ھاتھ ھوئے " ۔ یہ اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ھوئی ھے ۔ مثلاً —

(۱) ان لوگوں کے لئے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رھے ھوں ۔ (Subordinates) ۔ جو کسی کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے اُس کی ھدایات کے مطابق کام کریں ۔ گھر کے ملازم وغیرہ بھی اسی ضمن میں آجاتے ھیں ۔ (دیکھئے (۳۶/۴ ; ۷۱/۱۶ ; ۳۱/۲۴ ; ۵۸/۲۴ ; ۲۸/۳۰) ۔

*تاج ۔

(۲) اُن عورتوں کے لئے جو نکاح میں آچکی ہوں (۳۳/۵۲) ۔ اسی طرح سورہ نساء میں جہاں محرمات کی فہرست کے بعد کہا ہے کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۲۴) ۔ تو اس میں اگر مُحْصَنٰت کے معنی '' پاک دامن عورتیں '' لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاک دامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں آجائیں ۔ اور اگر '' مُحْصَنٰت '' کے معنی شوہر دار عورتیں ہوں (دیکھئے عنوان ح ۔ ص ۔ ن) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام شوہردار عورتیں حرام ہیں بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے ہاں آچکی ہوں اگرچہ ان کے پہلے شوہر کہیں موجود ہوں ۔ (دیکھئے شق نمبر ۳)۔

لیکن سورہ ممتحنہ میں ہے کہ اگر کفار مکہ کی مومن عورتیں تمہاری طرف آجائیں تو انہیں ان کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ ۔ صرف ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں دیدو اور ان سے نکاح کر لو ۔ (۶۰/۱۰) یہ وہ '' شوہر دار عورتیں '' ہیں جن سے (ان کے شوہروں کے ہوتے ہوئے) نکاح کی اجازت دی گئی تھی ۔ اس اعتبار سے (۴/۲۴) میں اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد یہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے اسطرح نکاح کیا گیا تھا ۔

(۳) مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ لونڈیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (مثلاً ۲۳/۶ ؛ ۲۴/۳۳ ، ۳۳/۵۰)۔ لونڈیوں کے ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کا رواج عام تھا ۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ لونڈیاں جو ان کے معاشرہ کے رواج کے مطابق ان کے گھروں میں موجود تھیں اسی طرح ان کے گھروں میں رہیں ۔ اگر ان لونڈیوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا تو اس سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوجاتیں ۔ اس لئے انہیں علی حالہ رہنے دیا گیا ۔ قرآن کریم نے ان لونڈیوں کے لئے بھی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدی ہوتے تھے ۔ سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم آگیا کہ انہیں احساناً یا فدیہ لیکر رہا کرنا ہوگا (۴۷/۴) ۔ اس حکم کے بعد جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو گیا اور اس طرح اسلام نے غلامی کے دروازے کو یکسر مسدود کر دیا ۔ کسی انسان کو خرید کر غلام بنا لینے کا تصور ہی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے جو شرف و تکریم آدمیت کا علمبردار (۱۷/۷۰) ہے اور جو کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے (۳/۷۸) ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ لونڈیوں کے لئے آئے ہیں وہ انہی لونڈیوں کے لئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ ان لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا لیا گیا، اور نئی لونڈیاں بنانے کا سلسلہ از روئے قرآن ختم ہو گیا۔ لہذا اب مسلمانوں کے ہاں لونڈیوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اب جو لوگ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ سے لونڈیوں کے جواز کی سند لاتے ہیں وہ قرآن کریم پر ظلم کرتے ہیں۔ اب قرآن کریم میں مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ سے متعلق ہدایات کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم حلقۂ اسلام میں داخل ہو جس کے ہاں لونڈیاں موجود ہوں تو قرآن کریم کی یہ ہدایات ان کے لئے خضر راہ بنینگی۔

(مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے ضمن میں ی۔م۔ن۔ کا عنوان بھی دیکھئے)

[مَلٰئِکَۃٌ کے لئے دیکھئے عنوان أ۔ل۔ک]

## م ل ل

اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ عَلَی الْکَاتِبِ۔ میں نے کاتب کو کتاب املاء کرائی۔ لکھائی*۔ اس معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں ($\frac{2}{282}$) میں آیا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ مِلَّۃٌ کی اصل اسی سے ہے**۔ اس صورت میں مِلَّۃٌ کے معنی ہونگے لکھا ہوا قانون۔

طَرِیْقٌ مَلِیْلٌ۔ اُس واضح راستے کو کہتے ہیں جس پر بکثرت آمد و رفت ہوتی ہو۔ اس اعتبار سے مِلَّۃٌ کے معنی طریقہ اور راستہ کے ہونگے۔ ان معانی کو ابو اسحٰق نے لکھا ہے۔ اور اساس میں بھی اس کی تائید آئی ہے۔ یہیں سے مَلَّۃٌ کا لفظ نکالا گیا ہے جس کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے کیونکہ اس جگہ پر آمد و رفت کی کثرت سے راستہ کے نشان پڑ جاتے ہیں۔ نیز اَلْمَلَّۃٌ۔ گرم ریت کو بھی کہتے ہیں جس میں روٹی پکائی جاتی ہے***۔ مناوی نے لکھا ہے کہ مَلَالٌ اس تکان اور دل برداشتگی کو کہتے ہیں جو کسی کام کو مسلسل کرنے سے پیدا ہو جائے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکتا جانے اور تھک جانے کے ہیں۔

قرآن کریم میں مِلَّۃٌ کا لفظ مشرب و مسلک اور دینی طریقہ کے لئے آیا ہے۔ حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ($\frac{2}{120}$)۔ تا آنکہ تو ان کے طریقے (یا دین) کی پیروی کرنے لگے۔ اسلام کو مِلَّۃَ اِبْرَاهِیْمَ ($\frac{2}{135}$) کہا گیا ہے۔ یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا۔

*محیط۔ **راغب۔ ***تاج۔

# م ل و (ی)

اِمْلَاءٌ کے معنی بڑھانے (ڈھیلا چھوڑنے اور مہلت دینے) کے آتے ہیں۔ اس لئے مدت طویلہ کو مَلَاوَۃٌ مِنَ الدَّھْرِ وَ مَلِیٌّ مِنَ الدَّھْرِ کہتے ہیں*۔ اَلْمَلِیُّ۔ زمانہ کی طویل مدت**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا (۱۹/۴۶)۔ تو ایک طویل مدت تک مجھ سے الگ ہو جا۔ اَمْلَیْتُ الْبَعِیْرَ۔ میں نے اونٹ کی پیکڑی میں (جس سے وہ بندھا تھا) کشادگی پیدا کر دی۔ یعنی اسے ڈھیلا کر دیا**۔ اس سے یہ لفظ مہلت دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وسعت کے معنوں میں سورۃ محمد میں شیطان کے متعلق ہے وَ اَمْلٰی لَهُمْ (۴۷/۲۵)۔ وہ ان سے لمبے لمبے وعدے کرتا رہتا ہے۔ بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں بندھاتا رہتا ہے۔ مہلت کے معنوں میں سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ اُمْلِیْ لَهُمْ (۷/۱۸۳) میں انہیں مہلت دیتا ہوں۔

اَمْلَیْتُ الْکِتَابَ۔ میں نے کتاب کو لکھوایا۔ املاء کروایا۔ یہ اصل میں اَمْلَلْتُ ہے*۔ سورۃ بقرۃ میں ہے فَلْیُمْلِلْ (۲/۲۸۲)۔ چاہئے کہ وہ لکھوائے۔ سورۃ فرقان میں ہے فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ (۲۵/۵)۔ (اس کے لئے م۔ ل۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

# مَهْمَا

دیکھئے عنوان مَنْ اور عنوان مَا۔ (مَنْ + مَا = مِمَّا) کبھی اس کے آخر کا الف حذف ہو جاتا ہے اور یہ مِمَّ رہ جاتا ہے۔

# مَنْ

مَنْ۔ جو۔ جس۔ جو کوئی۔ وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۱/۱۹)۔ جو کوئی (یا جو کچھ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔

(۲) استفہامیہ معنوں میں۔ یعنی کون، کس۔ جیسے مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶/۵۲)۔ ہمیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا؟

*راغب۔ **تاج۔

# مِن

مِنْ ۔ حسب ذیل معانی کے لئے آتا ہے :—

(۱) "سے" کے معنوں میں ۔ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۷/۱) ۔ مسجد حرام سے (یعنی وہ آغازِ سفر کا مقام تھا) ۔
اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ (۲۷/۳۰) ۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے ۔

(۲) کل میں سے بعض (اسے تبعیض کہتے ہیں) ۔ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (۲/۲۵۳) ۔ ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے خدا ہم کلام ہؤا ۔

(۳) پوری جنس کے لئے (اسے تبیین کہتے ہیں) ۔ مثلاً ۔ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ (۳۵/۲) ۔ اللہ جو رحمت بھی انسانوں کے لئے کھولتا (بھیجتا) ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ رحمت میں سے کوئی ایک حصہ بھیجتا ہے ۔ رحمت جو بھی ہوگی اسے رحمت ہی کہا جائے گا ۔ رحمت کا حصہ نہیں کہا جائے گا ۔ اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے ۔ مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ (۷/۱۳۲) جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی ہم تمام نشانیوں سے ایسا ہی برتاؤ کرینگے ۔ لہذا تبیین میں کل کا مفہوم ہوتا ہے ۔ یعنی اس قسم کی پوری کی پوری چیز ۔ (مِنْ کے استعمال میں تبعیض اور تبیین کے فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) ۔

(۴) "کی وجہ سے" کے مفہوم کے لئے ۔ مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا (۷۱/۲۵) ۔ وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کئے گئے ۔ یعنی ان کے غرق ہونے کی وجہ ان کی خطا کاریاں تھیں ۔

(۵) ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲/۲۲۰) ۔ اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح ۔ یعنی وہ مفسدین اور مصلحین کو الگ الگ پہچانتا ہے ۔

(۶) ایک کے بدلے میں دوسرا ۔ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (۹/۳۸) ۔ کیا تم مستقبل کے بدلے میں (یا اس کے مقابلہ میں) قریبی مفاد پر رضا مند ہو گئے؟ نیز (۴۳/۶۰) ۔

(۷) نفی (نہیں) کی تاکید کے لئے ۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (۳/۶۲) ۔ اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں ۔

(۸) ب (کے ساتھ) کے معنوں میں - يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ( ۴۲/۴۵ ) - وہ دزدیدہ نگاہ سے (یا خفی نگاہ سے یا گوشہ چشم سے) دیکھتے ہونگے - (نیز ۴۴/۳۰ ) -

(۹) عَلٰى ( پر) کے معنوں میں - وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ . . . . . ( ۲۱/۷۷ ) - اور ہم نے اسے اس قوم پر غالب کردیا -

(۱۰) فِيْ (میں) کے مفہوم میں - اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ( ۶۲/۹ ) - جب جمعہ کے دن تمہیں صلٰوۃ کے لئے آواز دی جائے -

(۱۱) عَنْ (سے) کے مفہوم کے لئے - قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ( ۲۱/۹۷ ) - ہم اس کی طرف سے غفلت میں رہے -

(۱۲) عِنْدَ ( کے نزدیک - کے ہاں ) کے معنوں میں - لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ( ۳/۱۱ ) - اللہ کے ہاں (یا اللہ کے مقابلہ میں) ان کے اموال و اولاد ان کے کسی کام نہ آسکینگے -

(۱۳) زائد بھی ہوتا ہے - مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ ( ۶/۵۹ ) - کوئی پتّا نہیں گرتا کہ . . . . . . (اسے تاکید کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں) -

# م ن ع

مَنْعٌ کے معنی ہیں کسی شخص اور اس چیز کے درمیان حائل ہو جانا جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ یہ اِعْطَاءٌ کی ضد ہے - یعنی نہ دینا - راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے - اِمْتَنَعَ اِمْتِنَاعاً - باز رہنا - رک جانا - مَانِعٌ - مَنَّاعٌ - مَنُوْعٌ - روکنے والا * - مَنَّاعٌ اور مَنُوْعٌ میں ( بمقابلہ مَانِعٌ ) مبالغہ پایا جاتا ہے - یعنی بہت زیادہ روکنے والا - روکنے کی جہت سے بخیل آدمی کو مَانِعٌ اور مَنَّاعٌ کہتے ہیں** - المَنْعٰى - رکنا - محفوظ ہو جانا - مَنُعَ الرَّجُلُ - آدمی محفوظ ہو گیا - حِصْنٌ مَنِيْعٌ - محفوظ اور مضبوط قلعہ - اَلْمُمَانَعَةُ - ایک دوسرے کو روکنے کے لئے جھگڑنا * -

قرآن کریم میں ہے - وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ( ۲/۱۱۴ ) - " اس سے بڑھ کر زیادتی کرنے والا کون ہے جو (لوگوں کو) اس سے روکتا ہے کہ وہ مساجد میں اللہ کا نام لیں " - اس میں مَنْعٌ کے معنی رکاوٹ ڈالنا ، حائل ہونا ہیں - سورہ نساء میں ہے

* د - **راغب -

وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴/۱۴۱) ۔ اسکے معنی حفاظت یا مدافعت کرنے کے ھیں ۔ " (کیا) ھم نے مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی ؟ "

سورہ الماعون میں ہے ۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) ۔ جو چیزیں بہتے پانی کی طرح عام ہونی چاہئیں یہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ھیں اور انہیں روک کر اپنی ملکیت میں لے لیتے ھیں ۔ سورہ معارج میں انسان کی عام نفسیاتی کیفیت کے متعلق ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۱) ۔ جب اسکے پاس مال و دولت آتا ہے تو وہ اسے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اس ذہنیت کا علاج نظام صلٰوۃ کی رو سے ہو سکتا ہے ۔ جیسا کہ (۷۰/۲۵-۲۹) میں بھی کہا گیا ہے ۔ اسی کو سورہ ق میں مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ (۵۰/۲۵) کہا گیا ہے ۔ اسکے برعکس جنتی معاشرہ کے متعلق ہے کہ اس میں سامان خور و نوش بڑی کثرت سے ہوگا (۵۶/۳۲ ; ۱۱/۱۰۸) ۔ اور کوئی اسکے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا ۔ کوئی اسے روک کر نہیں رکھے گا ۔ (۱۰/۱۰۷ ; ۵۶/۳۰) وہ سب کی پرورش کے لئے عام ہوگا (۴۱/۱۰) ۔

## م ن ن

مَنٌّ ۔ ہر اس احسان الہٰی کو کہتے ھیں جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہ اٹھانی جائے ۔ مَنَّ عَلَيْهِ ۔ اس پر احسان کیا ۔ یعنی بلا مزد و معاوضہ کچھ عطا کر دیا ۔ اِمْتَنَّ عَلَيْهِ کے بھی یہی معنی ھیں ۔ نیز مَنٌّ کے معنی احسان جتلانے کے بھی ھیں ، جو معیوب ہے ۔ اَلْمَنُوْنُ ۔ بہت احسان جتانے والا ۔ نیز زمانہ اور موت کو بھی کہتے ھیں ۔ اسی سے رَيْبُ الْمَنُوْنِ ۔ حوادث روزگار کو کہتے ھیں ۔ اَلْمَنَّانُ ۔ بہت زیادہ انعامات عطا کرنے والا * ۔

قرآن کریم میں وحی کو بھی مَنٌّ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے بلا کسب و ہنر محض وہبی طور پر عطا ہوتی ہے (۱۴/۱۱) ۔ یہ مَنٌّ رسول پر ہے ۔ اور رسول کا اس وحی کو لیکر انسانوں کے پاس آنا ، ان انسانوں پر خدا کا مَنٌّ ہے (۳/۱۶۳) ۔ قوم بنی اسرائیل کا فرعون کے استبداد سے نجات پا لینا خدا کا مَنٌّ تھا (۲۸/۵) ۔

سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق ہے کہ انہیں مَنًّا چھوڑ دو ، یا فِدَاءً (۴۷/۴) ۔ یعنی بطور احسان (بلا معاوضہ) یا فدیہ لیکر ۔ سورہ

* تاج و محیط ۔ اقرب الموارد

صٓ میں یہ لفظ اَمْسِکْ کے مقابل میں آیا ہے جسکے معنی روک رکھنے کے ہیں (۳۸/۳۹) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو بہرحال چھوڑنا ہوگا ۔ زرفدیہ لیکر ہو یا احساناً ۔ سورہ المدثر میں ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶) ۔ '' اس نیت سے احسان نہ کر کہ اسکے بدلے میں تجھے اس سے زیادہ واپس ملے گا '' ۔ یہاں سے مَنّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ مومن وہ ہیں جو '' اللہ کی راہ '' میں اسطرح صرف کرتے ہیں کہ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی (۲/۲۶۲) ۔ وہ نہ اس کے معاوضہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی احسان جتا کر وجہ اذیت بنتے ہیں ۔ مَنّ دراصل ایک بھاری وزن ہوتا ہے *۔ لہذا احسان جتانے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ( احسان کے ) بھاری بوجھ کے نیچے دبا دیا جائے ۔

اس بوجھ کے اعتبار سے مَنّ کے معنی ہوتے ہیں تھکا دینا ۔ لاغر اور کمزور کر دینا ۔ مَنَّ النَّاقَةَ - اونٹنی کو سفر کی تکلیف سے تھکا دیا اور لاغر اور کمزور کر دیا ۔ مَنَّ السَّیْرُ فُلَانًا ۔ اسے چلنے نے کمزور کر دیا ۔ ذَھَبَ بِمُنَّتِہٖ ۔ اسکی طاقت زائل کر دی ۔ اَلْمَنِیْنُ ۔ کمزور رسی یا کمزور آدمی ۔ ثَوْبٌ مَنِیْنٌ ۔ کمزور اور بوسیدہ کپڑا ۔ اَلْمَنِیْنَةُ ۔ مکڑی ۔ مَنَّ الشَّیْءُ ۔ چیز کم ہو گئی ۔ اسی اعتبار سے مَنُوْنٌ موت کو کہتے ہیں، نیز زمانہ کو ۔ مَنَّ الْحَبْلَ کے معنی ہیں رسی کو کاٹ دیا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کاٹنا اور (۲) احسان کرنا ، لکھے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۸۴/۲۵ ; ۴۱/۸ ; ۹۵/۶) ۔ ان کے لئے ایسا اجر ہے جس میں کمی نہیں ہوگی ۔ غیر منقطع ۔ مسلسل جاری رہنے والا ۔ ( سلسلہ ارتقاء میں کوئی چیز آگے بڑھ کر پیچھے نہیں آسکتی ۔ یا وہ رک جائیگی اور یا آگے بڑھتی جائیگی ) ۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اجر انہیں بطور احسان نہیں ملے گا بطور استحقاق ملے گا ۔

رَیْبُ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) ۔ زمانے کی اضطرابی کیفیتیں ۔ گردش زمانہ ۔ مرور وقت ۔ حوادث روز گار ۔ واضح رہے کہ یہ لفظ متضاد معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی اَلْمُنَّةُ ۔ قوت کو بھی کہتے ہیں ۔ بالخصوص دل کی قوت کو ۔ اسلئے مَمْنُوْنٌ کے معنی کمزور اور قوی دونوں آتے ہیں **۔ الرمانی نے اَلْمَنُوْنُ کے معنی موت لکھے ہیں *** ۔ صاحب لطائف اللغة نے اسکے معنی اَلدَّھْرُ یعنی زمانہ کے دئے ہیں ۔

---

*تاج و محیط و اقرب الموارد **تاج و راغب ۔ ***الالفاظ المترادفہ ۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ان پر مَنّ نازل ہوتا تھا۔ (۲/۵۷)۔ یہ شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی گوند تھی جو درختوں پر جم جاتی تھی *۔(یہ اب بھی ہوتی ہے اور لذیذ ہوتی ہے۔) لیکن راغب نے اس معنے کے ساتھ دوسرا مفہوم یہ بھی بتایا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے خدا کے انعامات کیطرف اشارہ ہے۔ مَنّ۔ احسان اور سَلْوٰی۔ تسلی کا سامان *۔

## مَنٰوۃ

مَنٰوۃ۔ جاھلیت عرب میں قبیلہ ھذیل و خزاعہ کابت تھا **۔ (۵۳/۲۰)۔ لات قبیلہ ثقیف کا اور عزّٰی قبیلہ غطفان کا۔ ان تینوں کا ذکر (۵۳/۱۹-۲۰) میں آیا ہے۔

## م ن ی

مَنَاہُ یَمْنِیْہِ مَنْیًا۔ اسکا اندازہ کیا۔ اَلْمَانِیْ۔ اندازہ کرنیوالا۔ اَلْمَنٰی۔ اللہ کا اندازہ۔ اَلْمَنِیَّۃُ۔ موت کو کہتے ھیں کیونکہ اس کا اندازہ مقرر کر دیا گیا ہے*۔ اَلْمُنٰی (واحد مُنْیَۃٌ) مقاصد۔ خواھشات۔ آرزوئیں۔ یعنی وہ کام جن کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔ تَمَنَّاہُ تَمَنِّیًا۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کی تمنا کی۔ اُمْنِیَّۃٌ (جمع اَمَانِیّ)۔ خواھش۔ آرزو۔ ارادہ*۔ نیز اس کے معنی جھوٹ اور کذب کے بھی ھیں۔ تَمَنَّی الْحَدِیْثَ۔ بات گھڑلی۔ اَلْاَمَانِیُّ۔ وہ باتیں جن کی تمنا کی جائے اور اکاذیب۔ دونوں معنی ھیں*۔

اَلْمَنِیُّ۔ نطفہ (خواھش اور ارادہ کے اعتبار سے۔ یا اس اعتبار سے کہ اس سے انسان کی پیدائش کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ابن فارس)۔

تَمَنَّی الْکِتَابَ۔ کتاب کو پڑھا۔ اُمْنِیَّۃٌ۔ کتاب کی تلاوت۔ جو کچھ پڑھا جائے ***۔ اس معنی کے لئے تاج العروس نے خاص طور پر اشعار بطور سند نقل کئے ھیں۔ اور ابن فارس نے کہا ہے کہ پڑھنے سے کتاب کے مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ مِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمَانِیَّ (۲/۷۸)۔ ''ان میں ان پڑھ لوگ بھی ھیں جو صرف کتاب کی تلاوت کرسکتے ھیں''۔ (اس کے مطالب کو سمجھ نہیں سکتے)۔ سورۃ حج میں ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ (۲۲/۵۲)۔ اور ھم نے تجھ سے

---

*تاج و راغب۔ **تاج و محیط۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۳۱) نیز ابن فارس۔

پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ (اس کے جانے کے بعد) شیطان (دین سے منحرف کرنے والے لوگ) اس کی کتاب میں (یعنی جس کی وہ تلاوت کرتا تھا** - اس وحی میں) اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے - اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو اس غیر خدائی تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی منزہ شکل میں پیش کردیتا - اس آیت میں اللہ نے بتایا ہے کہ کس طرح مفاد پرست اور سرکش لوگ وحی میں رد و بدل کر دیتے تھے اور کس طرح دوسرا رسول آ کر ان تبدیلیوں کو مٹاتا تھا - یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ قرآن کریم آیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی - اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم - لیکن بہت سے مفسرین نے پہلے، اُمْنِیَّتِہٖ کے معنی ''آرزو'' کر کے خود ہی ایک مشکل پیدا کرلی اور پھر اس مشکل سے نکلنے کے لئے اس قسم کا قصہ وضع کیا جس کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے - چونکہ اس قصہ سے حضور رسالتمآب کی شان اقدس پر طعن پڑتا ہے اس لئے ہم اسے یہاں دھرانا نہیں چاہتے -

مَنِیٌّ - نطفہ - اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی (۷۵/۳۷) - ''کیا وہ (انسان) منی کا ایک نطفہ نہیں تھا جو ڈالی جاتی ہے'' -

# م و ت

مَوْتٌ - دراصل حیات کی ضد ہے - مجازاً یہ سکون کے لئے بھی بولا جاتا ہے* - ہر وہ چیز جس میں جمود کی وجہ سے حرکت و ارتقاء رک جائے، مردہ ہے - چنانچہ کہتے ہیں مَاتَتِ الرِّیْحُ - یعنی ہوا رک گئی اور ساکن ہو گئی - مَاتَتِ النَّارُ - آگ بجھ گئی - مَاتَتِ الْخَمْرُ - شراب کا جوش جاتا رہا - نیند پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے - چنانچہ مَاتَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ سو گیا* - دراصل حیات کے مقابلہ میں موت کی بھی کئی قسمیں ہیں - مثلاً (۱) قوتِ نامیہ (بڑھنے پھولنے کی قوت) کا زائل ہو جانا - جیسے وَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا (۳۰/۱۹) - اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے - (۲) محسوس کرنے کی قوت کا زائل ہو جانا - جیسے قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۱۹/۲۳) - مریم نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی - اور اس درد و کرب کو محسوس نہ کرسکتی - (۳) عقل و شعور کا زوال - جیسے فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (۲۷/۸۰) - تو مردوں کو نہیں سنا سکتا - یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور

*تاج و محیط نیز راغب - **ابن قتیبہ القرطین ج/۲ ص ۳۱

سے کام نہیں لیتے - (۳) حزن اور خوف جو زندگی کو مکدر کردے - یعنی ہر مشقت حالات ، افلاس ، ذلت ، محکومی کی زندگی وغیرہ جیسے - وَ يَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷) - یعنی چاروں طرف سے ذلت و افلاس اور تباہیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر آرہی ہونگی لیکن موت نہیں آئے گی - اس لئے کہ بھوک کے ٹکڑوں سے اتنا کچھ مل جائے گا جس سے طبیعی زندگی باقی رہے* - (یہ جہنم کی زندگی کا نقشہ ہے) - مَوْتٌ - غشی اور جنون کو بھی کہتے ہیں - اَلْمَيْتَةُ - وہ جانور جو بلا ذبح کئے مر جائے* - اَلْمَوْتَةُ - جنون کے مشابہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو بعض آدمیوں کی ہو جاتی ہے - (ابن فارس) -

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات (زندگی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۸) - جس طرح حیات صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کے گونا گوں پہلو ہیں اسی طرح موت بھی صرف سانس بند ہو جانے کا نام نہیں - اس کے بھی مختلف پہلو ہیں - اور بدترین موت ہے قوموں کی اجتماعی زندگی کی موت جس میں وہ نہ زندہ ہوتی ہیں اور نہ مرتی ہی ہیں - یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے - ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۸۷/۱۳) - قرآن کریم کا پیغام حیات اور انہی اقوام کے لئے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت باقی ہو - لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) -

قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آئے ، اس کے سیاق و سباق سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہاں اس کے کون سے معانی مراد ہیں - ہر مقام پر موت کے معنی طبیعی موت (Physical Death) نہیں ہونگے -

(نیز دیکھئے عنوان ح - ی - ی) -

## م و ج

اَلْمَوْجُ - لہر - مَاجَ الْمَوْجُ - لہر بلند ہوئی - اَلْمَوْجُ - سمندر کی موجوں کا اضطراب - مَاجَ يَمُوْجُ - اضطراب اور تحیر کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اضطراب کے ہیں - مَوْجَةُ الشَّبَابِ - جوانی کی لہر کو کہتے ہیں - عنفوان شباب** -

قرآن کریم میں مَوْجٌ کا لفظ دریا یا سمندر کی لہروں کے لئے آیا ہے - (۱۱/۴۲) -

*تاج و محیط نیز راغب - ** تاج -

## م و ر

مَارَ الشَّیْئُ یَمُوْرُ۔ کسی چیز کا بار بار آنا۔ متردد ہونا۔ اَلْمَوْرُ۔ گھومنا۔ موج و اضطراب۔ زمین پر تیزی سے بہنا اور بہ سرعت متحرک ہونا۔ مَارَ مَوْرًا۔ وہ آنے جانے لگا۔ اَلْمَوْرُ۔ روندا ہؤا، ہموار راستہ۔ تیز رفتاری۔ سرعت۔ نیز نرم روی۔ اَلْمُوْرُ۔ مٹی جسے ہوا آڑائے*۔

قرآن کریم میں ہے یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَاءُ مَوْرًا (۵۲/۹)۔ جس (انقلاب کی گھڑی میں) بلندیوں والے اپنے مقام سے ہل کر سخت مضطرب اور اور متردد ہوجائیں گے۔ (یہ مفہوم سماء کے مجازی معنی کی رو سے لیا گیا ہے)۔

## موسیٰ علیہ اسلام

اَلْمُوْسٰی۔ اُسترا۔ مَاسَ رَاْسَہٗ۔ اس نے اس کے سر کو استرے سے مونڈ دیا**۔

مُوْسٰی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ یہ عبرانی لفظ مُوْشَی کا معرب ہے جسکے معنی کھینچکر نکالا ہوا ہوتے ہیں**۔ چونکہ فرعون کے لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا تھا اس لئے آپ کا یہ نام قرار پا گیا***۔

حضرت ابراہیمؑ کے پوتے، حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ آپ کے ایک بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین) کا قبیلہ، فلسطین کے علاقہ (Judea)) میں آباد تھا۔ ان دونوں قبائل کے افراد کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی۔ اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے (جو مشیت کی تدبیر کے ماتحت عجیب حالات میں مصر پہنچ گئے تھے۔ دیکھئے عنوان یوسفؑ) اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اور بڑھتے بڑھتے ایک کثیر التعداد قوم بن گئے۔

مصر میں فراعنہ کی حکومت تھی۔ "فرعون" کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش

---

*تاج و راغب۔ **تاج۔ ***محیط۔

کرتے تھے '' آمن رع '' (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا ۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے ۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فارا ع ( یعنی سورج دیوتا کا اوتار ) قرار پا گیا ۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لیکر اسکندر کے زمانہ ( ۳۳۲ ۔ ق ۔ م ) تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے ۔ حضرت یوسف[ؑ] کے زمانہ میں ہیکسوس ( Hyksos ) کا خاندان برسر حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے ۔

مصر میں بنی اسرائیل کی ابتداء تو ایک معزز گھرانے کی حیثیت سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ یہ قوم فرعون کے محکوم ہو گئے اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو دنیا کا ہر فرعون ، محکوم قوم کے ساتھ کرتا ہے ۔ جب ان پر ظلم و تشدد اپنی انتہا تک پہنچ گیا تو ان میں حضرت موسیٰ[ؑ] پیدا ہوئے جو خدا کے برگزیدہ رسول اور عظیم الشان داعی انقلاب تھے ۔

آپ[ؑ] پیدا تو ہوئے محکوم بنی اسرائیل کے گھرانے میں لیکن مشیت ایزدی نے آپ کی تربیت کا انتظام فرعون کے محلات میں کر دیا تاکہ آپ[ؑ] اسرار و رموز مملکت و سیاست سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں (۲۸/۷-۱۴) ۔ یہاں سے آپ نکلے تو مدین کے علاقہ میں پہنچے (۲۸/۲۲) ۔ جہاں آپ کی شادی ہوئی اور آپ نے آداب شبانی سیکھے ۔

مدین سے واپسی پر ، کوہ طور پر آپ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے (۲۰/۱۲-۱۳) اور آپ کو حکم ہوا کہ آپ فرعون کیطرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اسکے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں ۔ آپ آئے اور اپنے بھائی ہارون[ؑ] کے ساتھ فرعون کے پاس پہنچے (۲۸/۳۴ ؛ ۲۰/۴۳-۴۴) ۔ فرعون اور اسکے پیشوایانِ مذہب کے ساتھ آپ کے معرکے رہے اور بالآخر آپ ، بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر فلسطین کیطرف آ گئے (۲۰/۷۷) اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی ۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کو اُس با برکت زمین کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۷/۱۳۷) ۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ[ؑ] نے موآب کی سرزمین میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی ( دیکھئے استثناء ۳۴/۵) ۔ حضرت ہارون[ؑ] کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی ۔ (قرآن کریم نے ان تفاصیل کا ذکر نہیں کیا ) ۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے ۔ اس کے بعد ، قوم بنی اسرائیل کا عروج ، طبقاً عن طبقٍ بلند سے بلند تر ہوتا گیا ۔ یہی وہ دور تھا جس میں یہ سطوت داؤدی[ؑ] اور شوکت سلیمانی[ؑ] کے وارث ہوئے ۔ پھر انہوں نے حبل اللہ سے تمسک ، یعنی قوانین خداوندی کا اتباع

چھوڑ دیا تو ذلت و مسکنت کی لعنت ان کے پیچھے لگ گئی - ان کی پہلی تباہی بخت نصر (بابلی) کے ہاتھوں ۵۹۹ ق - م میں ہوئی - اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا - قریب ایک سو سال کے اندر، فارس کے تین شہنشاہ، خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہوگئے اور اسطرح یہ پھر یروشلم میں آکر آباد ہوگئے - (سورہ بقرہ آیت ۲۵۹ میں تمثیلی انداز میں ان کی اس تباہی اور باز آفرینی کا ذکر کیا گیا ہے)- ۳۳۲ ق - م میں اسکندر (یونانی) نے یہودیوں کی مرکزیت پر پھر ایک کاری ضرب لگائی - پھر ۳۲۰ ق - م میں بطلیموس نے مصر کے راستے یروشلم پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا - انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہوگئے - ٦٦ ق - م میں ان کی آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی - پامپئی رومی بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا - اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے - پھر ۵۱ ق - م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے - فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا موقعہ دیا گیا جب ان میں حضرت عیسیٰ ؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے لیکن انہوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دنیا پر روشن ہے - اس اتمام حجت کے بعد ان کی تباہی کا آخری وقت آگیا - چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے ۷۰ء میں ایسا وار کیا جس سے اس قوم پر اجتماعی ہلاکت کی مہرثبت ہوگئی -

سورہ بنی اسرائیل میں بخت نصر کے ہاتھوں پہلی بربادی اور اس آخری بربادی کے متعلق ذکر آیا ہے (دیکھئے ہیکل)-

حضرت موسیٰ ؑ خدا کے نبی تھے - انہیں اللہ نے کتاب دی تھی - وَاِذْ آتَيْنَا مُوْسٰى الْكِتَابَ (۲/۵۳) حضرت ہارون ؑ بھی نبی تھے - انہیں بھی کتاب ملی تھی - چنانچہ سورہ صفٰت میں حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون ؑ دونوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے وَآتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱۱۷) "اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی" - قرآن کریم میں حضرت موسیٰ ؑ یا حضرت ہارون ؑ کی کتاب کا نام مذکور نہیں - اَلتَّوْرَاةُ کا ذکر ہے (۳/۳)- لیکن تورات درحقیقت ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰ ؑ سے لیکر حضرت عیسیٰ ؑ سے پہلے مختلف انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوتی رہیں - ان کے مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہتے ہیں-

یہودیوں نے اس کتاب میں تحریف کر دی تھی ۔ لفظی تحریف بھی (٤/٤٦) اور معنوی بھی (٢/٧٥) ۔ نیز اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کردئیے تھے (٢/٧٩)۔ اور یوں تلبیس حق و باطل ہوگئی تھی (٣/٧١) ۔ اس لئیے اس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے (١١/١١٠) ۔ ان کی تبئین و توضیح قرآن کریم نے آکر کی (٥/١٥) ۔ [نیز دیکھئیے عنوان ”تَوْرَاتٌ“]

# م و ل

اَلْمَالُ ۔ ہر وہ چیز جس کے تم مالک ہو جاؤ ۔ اس کی جمع اَمْوَالٌ آتی ہے ۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ دراصل مَالٌ اس سونے چاندی کو کہتے ہیں جس کا کوئی مالک بن جائے ۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کے ذخیرہ کو بھی مَالٌ کہنے لگ گئے ۔ ویسے عربوں کے ہاں زیادہ تر اونٹوں کے گلے کو مَالٌ کہتے تھے کیونکہ ان کے مال زیادہ تر اونٹوں ہی کی شکل میں ہوتے تھے ۔ رَجُلٌ مَیِّلٌ ۔ بڑا مال دار آدمی ۔ مُلْتُہٗ ۔ میں نے اسے مال دے دیا ۔ تَمَوَّلْتُ اور اسْتَمَلْتُ کے معنے ہیں ، میں بہت مالدار ہو گیا ۔ مَوَّلَہٗ ۔ اس نے اسے مال دار کر دیا* ۔ عام ائمہ لغت کے نزدیک اَلْمَالُ کے مادہ کا درمیانی لفظ واو ہی ہے ۔ لیکن راغب نے اسے اَلْمَیْلُ کے تحت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف** ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس لئے مال کہا گیا ہو کہ اس کی خاطر انسان کو کسی ایک طرف جھکنا پڑتا ہے ۔ لیکن اگر راغب کی تحقیق صحیح ہوتی تو مَالٌ کی جمع اَمْیَالٌ ہوتی نہ کہ اَمْوَالٌ ۔

نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں جماعت مومنین کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان میں نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ (٢/١٥٥) بھی ہے ۔ یعنی مال و دولت میں کمی ہو جانا ۔ لیکن اس کے بعد اس جماعت کو ، ان کے مخالفین کے اَمْوَالٌ کا مالک بنا دیا جاتا ہے اور انہیں ہر طرح کی فراوانی حاصل ہو جاتی ہے (٣٣/٢٧) ۔ لہذا مال کی فراوانی ، نظام خداوندی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی رحمت ہے ۔ لیکن وہی مال جو نظام ربوبیت کی اجتماعی تحویل میں ہو (٩/١١١) ۔ اگر ہر فرد اپنا اپنا مال اپنے ہی مفاد کی خاطر جمع کرے تو اس مال سے وہ جہنم تیار ہوتی رہتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (١٠٤/٦-٧) ۔ اسی کا نام سرمایہ داری ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا ۔ (٩/٣٤-٣٥) ۔

---

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔

# م و ہ

مَاءٌ ۔ دراصل مَوَہٌ تھا ۔ واو کو الف سے بدل دیا اور ھاء کو ھمزہ سے ۔ اس طرح یہ لفظ مَاءٌ بن گیا ۔ اس کے معنی ھیں ۔ پانی ۔ اس کی جمع مِیَاہٌ آتی ھے ۔ مَاھَتِ السَّفِیْنَۃُ کے معنی ھیں کشتی میں پانی بھر گیا ۔ بَنُوْ مَاءِ السَّمَاءِ ۔ عربوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ بارش کی تلاش میں رہتے اور جہاں بارش کا پانی ملتا وھیں پہنچ جاتے* ۔

قرآن کریم میں ھے کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ (۱۱/۷) ۔ خدا کا عرش پانی پر تھا ۔ اس کے مفہوم کے لئے ع ۔ ر ۔ ش کا عنوان دیکھئے ۔

# م ہ د

مَھْدٌ کے معنی ھیں جگہ کو ھموار اور نرم بنانا ۔ اَلْمَھْدُ ۔ نرم اور ھموار زمین ۔ اَلْمِھَادُ ۔ بستر کو کہتے ھیں کیونکہ وہ نرم اور ھموار ھوتا ھے** ۔ بچھی ھوئی اور ھموار ھونے کی جہت سے قرآن کریم میں زمین کو مِھَاداً کہا گیا ھے (۷۸/۶) ۔ یعنی وسیع بچھائی ھوئی اور ھموار ۔ چونکہ بچے کا بسترہ ھموار اور نرم ھوتا ھے اس لئے اسے اَلْمَھْدُ کہتے ھیں ۔ یعنی گہوارہ*** ۔

تَمْھِیْدُ الْاَمْرِ کے معنی ھیں کسی معاملہ کو ھموار کرنا اور درست کرنا ۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ھے کہ مجازاً اس سے مراد مال و جاہ میں فراخی کرنے کے ھو جاتے ھیں** ۔ یعنی نرم اور پُر آسائش زندگی بنانا ۔ قرآن کریم میں ھے ۔ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِھِمْ یَمْھَدُوْنَ (۳۰/۴۴) ۔ جو صلاحیت بخش کام کرتے ھیں وہ اپنی ذات کے لئے آسائشیں بہم پہنچاتے ھیں اور اسکی اصلاح اور ھمواری کی کوشش کرتے ھیں ۔ سورۃ بقرہ میں جہنم کو بِئْسَ الْمِھَادُ (۲/۲۰۶) کہا ھے ۔ یہاں اس کے معنی رھنے یا ٹھہرنے کے مقام کے ھیں ۔

قرآن کریم میں اللہ کو مَاھِدٌ کہا گیا ھے ۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمَاھِدُوْنَ (۵۱/۴۸) ۔ اور ھم نے زمین کو بچھایا اور ھم کیا اچھے آسائشیں بہم پہنچانے والے ، یا ٹھکانا مہیا کرنے والے ھیں ۔

سورۃ مریم میں ھے کہ حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو ساتھ لے کر ھیکل کے پجاریوں کے پاس آئیں تو وہ (احبار و رھبان) ان کے پیچھے پڑ گئے (کہ انہوں نے ھیکل کی راھبہ کی زندگی چھوڑ کر آئین خانقاھیت کے خلاف

*تاج نیز ابن فارس ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

متاھل زندگی کیوں اختیار کرلی تھی) ۔ انہوں نے خود جواب دینے کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کردیا کہ تمہارے اعتراضات کا یہ جواب دیں گے ۔ اس پر ہیکل کے شیوخ نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَھْدِ صَبِیًّا (۱۹/۲۹) ۔ ''ہم اس سے کسطرح بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے'' ۔ یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ اس سے (جو ہماری سن رسیدگی کے مقابلہ میں یوں ہے جیسے گود میں کھیل رہا ہو) جو کل ابھی ہمارے سامنے بچہ تھا ۔ جو ہمارے ہاتھوں کا کھلایا ہوا ہے ۔ اس سے ہم مناظرہ شروع کردیں ۔ اس سے ''فی المھد'' (جھولے میں) کے معنی واضح ہیں ۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ''ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں'' ۔ یا ''جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش'' ۔ خود صَبِیًّا کے معنی بھی دودھ پیتا بچہ نہیں ۔ (دیکھئے عنوان ص ۔ ب ۔ و)

یہی ''تکلم فی المھد'' ہے (یعنی کم عمری میں لوگوں سے اہم حقائق پر گفتگو کرنا) جس کی طرف (۵/۱۱۰ و ۳/۴۵ میں) اشارہ کیا گیا ہے ۔

احبار و رھبان کے سوال کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں ۔ آپ نے فرمایا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ۔ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ....... (۱۹/۳۰) ۔ میں خدا کا بندہ ہوں ۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی ۔

[مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''شعلہ مستور''] ۔

## م ہ ل

اَلْمَھْلُ ۔ اَلْمَھَلُ ۔ اَلْمُھْلَةُ ۔ سکون ۔ اطمینان ۔ نرمی ۔ اَمْھَلَہٗ ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا ، اس پر سختی نہیں کی ۔ اسے مہلت دے دی ۔ ڈھیل دیدی ۔ تَمَھَّلَ فِیْ عَمَلِہٖ ۔ اس نے اپنے کام میں جلدی نہ کی ، اطمینان اور سکون سے کام لیا ۔ اَلْمَھْلُ ۔ سکینت اور وقار ۔ نیز اچھے کام میں آگے بڑھنا ۔ اَلْمَاھِلُ ۔ تیز رو ۔ آگے بڑھنے والا* ۔ سورۃ طارق میں ہے فَمَھِّلِ الْکٰفِرِیْنَ اَمْھِلْھُمْ رُوَیْدًا (۸۶/۱۷) ۔ ان مخالفین سے نرمی کا برتاؤ کرو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو ۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے ۔ اسی کو مہلت کہتے ہیں ۔ یہ خدا کے قانونِ تدریج و امہال کے مطابق طے پاتا ہے ۔

*تاج و راغب ۔

(غالباً) سکون و جمود کے لحاظ سے ، ہر دھات کو اَلْمُھْلُ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ یہ پگھلے ہوئے پیتل ، تانبے یا لوہے کے لئے آتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ زیتون کے تیل اور اس کی تلچھٹ کے لئے آتا ہے - نیز یہ اس راکھ اور انگاروں کو بھی کہتے ہیں جو روٹی سے اس وقت جھڑتی ہے جب اسے بھوبھل سے نکالتے ہیں - قبیلہ عامر اس لفظ کو زھر کے لئے بولتا ہے* - بہر حال اس میں ہلاکت کا پہلو نمایاں ہے - سورۃ معارج میں ہے یَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ (۸/۷۰) - یہاں مُھْلٌ کے معنی پگھلی ہوئی دھات کے لئے جائیں تو زیادہ موزوں ہوگا - یعنی بڑے بڑے فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی - سورۃ کہف میں ہے یُغَاثُوْا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ (۲۹/۱۸) - اہل جہنم کو جو پانی دیا جائے گا وہ مُھْلٌ کیطرح ہوگا - یہاں اس کے معنی زھر کئے جائیں تو بھی ٹھیک ہے اور اگر آتشین لاوا کئے جائیں تو بھی مناسب ہے - مطلب یہ ہے کہ مُمِدِّ حیات چیزیں بھی ان کے حق میں ہلاکت آفریں ہونگی۔

## مَهْمَا

مَهْمَا - (کہتے ہیں کہ یہ مَا اور مَا کا مرکب ہے اور پہلے مَا کا الف ھاء سے بدل دیا گیا ہے) - " جو کوئی (چیز) بھی " - " جو کچھ بھی " - وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ (۱۳۲/۷) - انہوں نے کہا کہ جو کوئی نشانی بھی تو لائے گا . . . . نیز اس کے معنی " جب کبھی " بھی ہوتے ہیں -

## م ہ ن

مَاهَنَهٗ - اُس نے اسے اچھی طرح استعمال کیا - خوب رگڑا - اِسْتَهَنَهٗ - اس نے اس سے خدمت یعنی کام لیا اور اسطرح اسے کمزور کر دیا - اَلْمَتَهِيْنُ - اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو کثرت محنت سے اسقدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس سے اونٹنی کو حاملہ نہ کرایا جائے تا کہ کمزور بچے پیدا نہ ہوں - اَلْمَاهِنُ - غلام اور خدمتگار - اَلْمِهْنَةُ - خدمت کرنے میں مہارت و ہوشیاری - اَلْمَهِيْنُ مِنَ الرِّجَالِ - حقیر آدمی - ذلیل آدمی - قلیل الرائے - قلیل التمییز* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بے وقعتی اور حقارت کے ہوتے ہیں -

قرآن کریم میں اس مادہ کے لئے جس سے انسان کی (رحم میں) تخلیق ہوتی ہے سُلٰلَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِيْنٍ (۸/۳۲) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں -

*تاج و محیط -

یعنی کمزور اور حقیر پانی سے نکالے ہوئے جوہر کے ذریعے۔ تقابل کی غرض سے ایسا کہا گیا ہے۔ یعنی اس قسم کے حقیر سے قطرہ سے، اس قسم کا جیتا جاگتا، خوبصورت، ہونہار، سمیع و بصیر بچہ پیدا کر دینا، خدا کے قانونِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ کہاں وہ قطرۂ آب، کہاں یہ دُرِّ شاہوار!

# م ی د

مَادَ قَوْمَهٗ۔ وہ اپنی قوم کے لئے سامان خوراک لایا۔ مَادَ هُمْ يَمِيْدُهُمْ بمعنی مَارَهُمْ ہے۔ یعنی انہیں سامان خوراک دیا۔ اسی سے اَلْمُمْتَادُ۔ سامان خوراک لینے والے کو کہتے ہیں۔ مِدْتُهٗ۔ وَاَمَدْتُهٗ۔ میں نے اسے عطا کیا۔ مَادَنِيْ فُلَانٌ۔ فلاں نے مجھ پر احسان کیا*۔ راغب نے اسکے معنے "اس نے مجھے کھلایا" بھی لکھے ہیں**۔ مَادَ کے معنی شدت سے ہلنا اور حرکت کرنا بھی ہیں، نیز جھکنا۔ مَادَتْ بِهِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین اسے لیکر گھومی۔ اَلْمَائِدَةُ۔ کھانا۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَلْمَائِدَةُ اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا ہو۔ اگر اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مائدۃ نہیں بلکہ خِوَانٌ کہیں گے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اسے مَائِدَةٌ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ میزبان کی طرف سے عطا اور تفضل کے طور پر مہمان کو دیا جاتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) حرکت اور (۲) نفع پہنچانا ہیں۔

اَلْمَائِدَةُ کے ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ ($\frac{5}{112}$) "وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے"۔ ہر نبی کی طرح، حضرت عیسیٰؑ بھی اپنی جماعت سے کہ رہے تھے کہ اگر وہ وحی کا اتباع کرتے رہے تو خدا انہیں رزق کریم دیگا۔ دنیا کی سرفرازیاں عطا کریگا۔ لیکن وہ جماعت جس قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہو رہی تھی ان کے پیش نظر، یہ بعید دکھائی دیتا تھا کہ انہیں اس کشائش سے سامان زیست مل سکیگا۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت انہوں نے کہا کہ کیا ایسے حالات میں بھی یہ ممکن ہے کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں سب کو سامان نشو و نما انسانوں کی طرف سے نہ ملے بلکہ نظام خداوندی کی طرف سے ملے تاکہ انہیں روٹی کے بدلے انسانوں کی

*تاج۔ **راغب۔

غلامی اختیار نہ کرنی پڑے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ تم مومن ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ (۵/۱۱۲) ۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ خدا نے کہا کہ وہ یقیناً ایسا انتظام کردیگا (یعنی تقوی' کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا) لیکن فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا . . . . . . (۵/۱۱۵) جو ہمارے اسطرح کے دئے ہوئے رزق پر پردہ پوشی کرنے لگیگا اور اس نظام سے سرکشی برتیگا ، تو اسے سخت عذاب دیا جائیگا۔ لہذا مَآئِدَۃً مِنَ السَّمَآءِ ، نظامِ ربوبیت کا دوسرا نام ہے اور تقوی' کا لازمی نتیجہ۔

ویسے ان آیات کے جو عام معنی لئے جاتے ہیں انہیں قرآن کریم کے کسی اردو ترجمہ سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔

سورہ نحل میں زمین کے متعلق ہے ۔ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (۱۶/۱۵) ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر اطمینان سے سکونت پذیر رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے*۔

کھلی اور فراخ جگہ کو اَلْمَیْدَانُ ۔ اَلْمِیْدَانُ کہتے ہیں *۔ لہذا مَآئِدَۃٌ میں فراخی کا پہلو بھی ہے ۔

## م ی ر

اَلْمِیْرَۃُ ۔ کھانے کی چیزیں جنہیں کوئی شخص لاد کر لائے ۔ مَارَ عِیَالَهٗ یَمِیْرُ ۔ مَیْرًا ۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لایا*۔ سورۃ یوسف میں ہے وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا (۱۲/۶۵) ۔ ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ (سامان خوراک) لائینگے ۔

## م ی ز

مَازَ یَمِیْزُ ۔ کسی چیز کو الگ کرلینا ۔ علیحدہ کرلینا ۔ فَامْتَازَ ۔ پس وہ چیز الگ ہوگئی* ۔ راغب نے اس کے معنے ملتی جلتی چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے کئے ہیں** ۔ قرآن کریم میں ہے حَتّٰى یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۳/۱۷۸) ۔ تاآنکہ (خدا) خبیث کو طیب سے الگ کردے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے ۔ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹) ۔ اے مجرمو! ۔ تم اب الگ ہو جاؤ۔ تَمَیَّزَ ۔ الگ الگ ہو جانا ۔ تَمَیَّزَ الرَّجُلُ مِنَ الْغَیْظِ ۔ وہ غصہ کی شدت سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا* ۔ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ (۶۷/۸) ۔ قریب ہے کہ وہ جوش میں پھٹ پڑے ۔ اَلتَّمْیِیْزُ ۔ ملتی جلتی چیزوں میں فصل کرنا** ۔

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔

# مِیْکَالُ

سورۃ بقرہ میں جِبْرِیْلَ وَ مِیْکٰلَ آیا ھے (۲/۹۸)۔ اس فرشتہ (Michael) کو یہودی اپنا دوست سمجھتے تھے ۔

# م ی ل

مَالَ ۔ وہ جھکا۔ مَالَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف جھکا ۔ اس کی طرف مائل ہوا ۔ متوجہ ہوا ۔ مَالَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس کے خلاف جُھکا ۔ اس پر ظلم کیا ۔ اُس پر حملہ آور ہوا (۴/۱۰۲) ۔ مَالَ عَنِ الْحَقِّ* ۔ وہ انصاف کی راہ سے ہٹ گیا۔ اعراض برتا ۔ اَمَالَہٗ ۔ اسے جھکا لیا ۔ مَالَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا ۔ زوال آفتاب سے مراد ھے ۔ مَیَّلَ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ ۔ اس نے دو معاملوں میں تردد کیا کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو ۔ یعنی اس کا دل کبھی اس کی طرف جُھکا اور کبھی اُس کی طرف* ۔ مَیْلَۃٌ* ۔ ایک بار جھکنا (۴/۱۰۲) ۔

اَلْمِیْلُ ۔ میل ۔ زمین کا ایک معین فاصلہ (مختلف مقامات پر اس فاصلہ کے تعین میں اختلاف ھے) ۔ وہ مینار جو راستہ پر مسافروں کی راہ نمائی کے لئے بنا دیا جاتا ھے ۔ نیز زمین کی طویل اور لامحدود مسافت کو بھی کہتے ھیں ۔ اور سرمہ کی سلائی کو بھی* ۔

راغب نے اَلْمَالُ کو بھی مَیْلٌ* کے تحت ھی لکھا ھے اور بتایا ھے کہ مال کو اس لئے مَالٌ* کہتے ھیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رھتا ھے اور کبھی دوسرے کی طرف** ۔ لیکن ھم نے اس سے اتفاق نہیں کیا ۔ (دیکھئے عنوان م ۔ و ۔ ل) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

# ن

## ن

دیکھئے عنوان ، (ن ۔ و ۔ ن)

## ن أ ی

نَاَیْتُہٗ وَ نَاَیْتُ عَنْہُ ۔ میں اس سے دور ہوا ۔ نَاَیٰ بِہٖ ۔ اسے ہٹایا ، دور کیا ، ایک طرف کیا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَ ھُمْ یَنْھَوْنَ عَنْہُ وَ یَنْئَوْنَ عَنْہُ (۲۶/۶) ۔ وہ (لوگوں کو اس قرآن کریم سے) روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں ۔ اَلْمُنْتَاَیٰ ۔ مقام بعید کو کہتے ہیں ۔ اَلنُّؤْیُ ۔ در اصل اس گڑھے یا نالے کو کہتے ہیں جو خیمہ کے ارد گرد اس غرض سے کھودا جاتا ہے کہ بارش کا پانی خیمہ کے اندر نہ آنے پائے ۔ اس سے دور دور رہے ۔ اسی سے اس کے معنی مفارقت کے بھی آتے ہیں* ۔ اور اعراض برتنے کے بھی** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِہٖ (۸۳/۱۷) ۔ اعراض برتا اور سرکشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو دور لے گیا ۔ پہلو تہی کی ۔ نَاَیٰ فِی الْاَرْضِ ۔ وہ ملک میں دور چلا گیا* ۔

## نا (ضمیر)

نا ۔ (۱) ضمیر مرفوع متصل ہے ۔ جیسے فَعَلْنَا ۔ ہم نے کیا ۔ یہ تثنیہ ۔ جمع ۔ مذکر ۔ مؤنث ۔ سب کے لئے آتی ہے ۔

(۲) ضمیر منصوب متصل ہے ۔ تثنیہ و جمع متکلم کے لئے آتی ہے ۔ اور مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے ۔ اَضَلَّانَا ۔ ان دو نے ہمیں گمراہ کیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے ۔ رَبَّنَا ۔ اے ہمارے رب ۔ (تثنیہ و جمع ۔ مذکر و مؤنث ۔ متکلم کیلئے) ۔

---

*تاج ۔ **راغب نیز ابن فارس ۔

قرآن کریم میں ہے وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۴۱/۲۹) ۔ ''اور جو کافر ہیں وہ کہینگے ۔ ''اے ہمارے رب! ان کو، جنہوں نے جن و انس میں سے ہمیں گمراہ کیا تھا ہمیں دکھا'' ۔ دوسری جگہ ہے کَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۴/۴۵)۔ ''ہم نے ان سے کیا معاملہ کیا ۔ ۔ ۔'' ۔

# ن ب أ (ن ب و)

نَبَأٌ کے معنی ہیں خبر دینا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے ہیں ۔ خبر کو بھی النَّبَأُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ نَبَأٌ ۔ ہر خبر کو نہیں کہتے، بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جسمیں بڑا فائدہ ہو، اور اس سے علم حاصل ہو جائے یا وہ کم از کم ظن غالب تک پہنچ جائے ۔ یہ خبر جھوٹ سے خالی ہونی چاہئے ۔ جیسے تواتر یا خدا یا رسول کی دی ہوئی خبر* ۔ لیکن یہ کلیہ صحیح نہیں ۔ قرآن کریم میں ہے اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا ۔ ۔ ۔ (۶/۴۹) ۔ ''اگر کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اسکی تحقیق کرلیا کرو'' ۔ یہاں فاسق کی لائی ہوئی خبر کو بھی نَبَأٌ کہا گیا ہے ۔ اَنْبَاَ اور نَبَّاَ کے معنی خبر دینے کے ہیں* ۔ نَبِّئْ عِبَادِیْ (۱۵/۴۹)۔ میرے بندوں کو یقینی طور پر بتا دے ۔ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ (۲۶/۶۹)۔ انہیں (کتاب اللہ سے) ابراهیم کی خبر (سرگزشت، یقینی واقعات) بتا دے ۔

نَبَاَ ۔ نُبُوْءًا ۔ کے معنی ہیں بلند ہونا ۔ مرتفع ہونا ۔ اَلنَّبَاَةُ ۔ اونچی زمین کو کہتے ہیں ۔ اَلنَّبِیْئُ ۔ مرتفع جگہ اور واضح راستے کو کہتے ہیں جو ابھر کر سامنے آجاتا ہے* ۔

یہاں تک بات ن ۔ ب ۔ أ (مادہ) کے متعلق تھی ۔ لیکن عربی زبان میں ایک مادہ نبو (ن ۔ ب ۔ و) بھی ہے ۔ نُبُوٌّ ۔ نَبْوَةٌ کے معنی ہیں بلند ہونا ۔ مرتفع ہونا** ۔ اَلنَّبَاوَةُ ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جو دوسری زمینوں سے اونچی ہو ۔ اَلنَّبِیُّ ۔ بلند جگہ کو کہتے ہیں ۔ نیز بلند نشان راہ جس سے رہنمائی حاصل کی جائے* ۔

قرآن کریم میں اَلنَّبِیُّ کا لفظ رسول کے لئے آیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ نَبَأٌ سے مشتق ہے اور اسلئے اس کے معنی ہیں خبریں دینے والا ۔ لیکن یہ تورات کا

*تاج و لطائف اللغۃ نیز اقرب الموارد ۔ **تاج و ابن فارس ۔

دیا ہوا تصور ہے ۔ یہودیوں میں نَبِیّ ہیکل کے ایک خاص منصبدار کا لقب تھا۔ جو پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ اسی لئے انگریزی میں نبی کو (Prophet) کہتے ہیں ۔ یعنی پیش گوئیاں (Prophecies) کرنے والا ۔ لیکن قرآن کریم نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں بلند مقام ۔ لہذا نبی کے معنے ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم سے کہا یا نَبِیءُ اللہ (ہمزہ سے، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لفظ نبأ سے مشتق ہے) تو حضور نے فرمایا لَسْتُ بِنَبِیءِ اللہ وَ لٰکِنْ نَبِیُّ اللہ ۔ اس سے واضح ہے کہ یہ لفظ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے ۔ نبی اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالم الغیب و الشہادۃ (دنیائے محسوس و غیر محسوس) دونوں کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے ۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیائے محسوسات تک پہنچاتا اور انہیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے ۔ رسول اللہ نے جب اپنی نبوت کا اعلان قریش کے سامنے کیا تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور قوم سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک دشمن کا لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے کے لئے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور کرینگے۔ (ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑ کی دوسری جانب بھی دیکھ سکتے ہیں ۔ اور ہم دامن کوہ سے اسکی دوسری سمت نہیں دیکھ سکتے) ۔ اور دوسرے اس لئے کہ آپ نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا ۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اسی طرح اس حقیقت کو بھی مان لو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش زندگی کے نتائج ، ہلاکتوں اور بربادیوں کا ایک لشکر جرار اپنے ساتھ لئے تمہاری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں ۔ لہذا تم اس روش کو چھوڑ کر زندگی کی صحیح روش اختیار کرو ۔

اس سے مقام نبوت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے ۔ یعنی نبی ، علم کے اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں وہ (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے ۔ یہ مقام نبوت ہے ۔ پھر وہ اس علم (وحی) کو لیکر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تاکہ ان تک ان حقائق کو پہنچائے ۔ اور عملاً متشکل کرکے دکھائے ۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کا دوسروں تک پہنچانا) ۔ نبوت ، رسول اللہ پر ختم ہو گئی ۔ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا ۔ (اسلئے کہ جسقدر وحی کی ضرورت تھی وہ دیدی

گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا) - باقی رھا فریضۂ رسالت - یعنی اس وحی کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا - تو یہ فریضہ اس امت کے سپرد ھو گیا جسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا - (اسے تبلیغ اور اقامت دین کہا جائیگا - '' رسالت'' کہنے سے غلط فہمی کا امکان ھوتا ھے) - یہ سلسلہ قیامت تک جاری رھے گا - رسول میں نبوت اور رسالت ایک ھی ذات کے اندر مجتمع ھوتی ھے اس لئے قرآن کریم کی رو سے ھر نبی رسول ھوتا ھے اور ھر رسول نبی - ان میں کوئی فرق نہیں ھوتا - ختم نبوت کے بعد اب کوئی نبی نہیں ھو سکتا - نہ ھی اس معنی میں رسول - لیکن تبلیغ (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانے) کا فریضہ امت کے سپرد ھے - لہذا امت اپنے نظام کی وساطت سے '' فریضۂ رسالت'' کی ادائیگی کے لئے رسول اللہؐ کی جانشین ھے - قرآن کریم میں حضورؐ خاتم النبیین کی نبوت محفوظ ھے اور امت کے قرآنی نظام کے ذریعے '' فریضۂ رسالت'' قیامت تک مسلسل آگے جاسکتا ھے -

عام طور پر کہا جاتا ھے کہ رسول وہ ھے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ھے جو کتاب نہ لائے - یہ خیال قرآن کریم سے بے خبری پر مبنی ھے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ نے تمام انبیاء کو کتاب دی تھی - وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ..... ($\frac{2}{213}$) - یہی الفاظ رسولوں کے لئے آئے ھیں ($\frac{57}{25}$) - انبیاء کی انہی کتابوں کو مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ($\frac{2}{136}$) کہا گیا ھے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ھے - حضرت عیسٰےؑ نے کہا تھا اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ($\frac{19}{30}$) '' اللہ نے مجھے الکتاب دی ھے اور (اسطرح) مجھے نبی بنایا ھے'' - ان تصریحات سے ظاھر ھے کہ ھر نبی صاحب کتاب ھوتا ھے - جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ھے ، نبوت اور رسالت ایک ھی حقیقت کے دو رخ ھیں - اسی لئے حضرات انبیاء کرامؑ کو (مثلاً خود نبی اکرمؐ کو) کہیں نبی کہا گیا ھے ($\frac{65}{1}$) اور کہیں رسول - ($\frac{48}{29}$) - حتکہ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ھے وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ($\frac{19}{54}$) - '' ایک پیغامبر (رسول) جسے نبوت عطا کی گئی تھی'' - ختم نبوت ($\frac{33}{40}$) کے معنی یہ ھیں کہ اب کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرے - علم جسقدر وحی کے ذریعے دیا جانا مقصود تھا ، وہ سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ھے - لہذا الہام یا کشف وغیرہ کے ذریعے خدا سے براہ راست علم پانے کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدہ کے منافی ھے -

ھم نے اوپر کہا ھے کہ نَبِيٌّ کا لفظ نَبَاوَةٌ سے مشتق ھے - لیکن اگر اسے نَبَأٌ سے مشتق مانا جائے تو اس میں بھی بلندی مقام اور اخبار

عن الغیب (غیب کی باتوں سے باخبر کرنے) کے دونوں مفہوم آجائینگے۔ اس ''غیب'' کے معنی وحی ہونگے جو نبی کو خدا کیطرف سے ملتی ہے۔ (دیکھئے عنوان غ۔ ی۔ ب)۔ نہ کہ پیش گوئیاں جن کے مدعی (مسلم اور غیر مسلم) ہر جگہ ملتے ہیں۔

## ن ب ت

اَلنَّبْتُ۔ اَلنَّبَاتُ۔ ہر وہ چیز جو زمین سے اُگے*۔ اَلْمَنْبِتُ۔ اگنے کی جگہ۔ اس مادہ میں ابھرنے اور نمایاں ہونے کے معنی بھی ہیں۔ چنانچہ لڑکی کے سینہ کے ابھرنے کے لئے نَبَتَ ثَدْیُ الجَارِیَۃِ کہا جاتا ہے اور لڑکے کے بالغ ہو جانے کو بھی نَبَتَتْ عَانَۃُ الغُلَامِ اور اَنْبَتَ الغُلَامُ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز التَّنْبِیتُ کے معنی تربیت کرنے کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوئی ہوئی چیز میں نشو و نما ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (۲۲/۵)۔ زمین ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے۔ سورہ آل عمران میں حضرت مریم کے متعلق ہے وَاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (۳/۳۶)۔ (اس کے رب نے) اُسے عمدہ پرورش سے پروان چڑھایا۔ یہاں جسمانی پرورش اور اخلاقی تربیت دونوں مقصود ہیں۔

نوع انسان کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۷۱/۱۷)۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تمہیں نباتات کی طرح نشو و نما دیتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ نے نوع انسان کو تمام کرہ ارض پر درخت کی شاخوں کیطرح پھیلا دیا ہے جس کی جڑ اور تنا ایک ہی ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو زمین سے اسی طرح اگایا ہے جسطرح نباتات اگتے ہیں۔ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ اور اسطرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ (انسانی تخلیق اور نظریہ ارتقاء کے متعلق تفصیلات میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

## ن ب ذ

نَبَذَ۔ کسی چیز کو اسلئے پھینکدیا کہ اسکی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ چنانچہ اَلْمَنْبُوذُ ایسے بچے کو کہتے ہیں جسے راستے میں پھینکدیا گیا ہو***۔ (یعنی ولدالزنا)۔ لہذا اسکے معنی ہیں کسی چیز کو حقارت کی وجہ سے

*راغب۔ **تاج۔ ***تاج و راغب۔

توجہ کے قابل نہ سمجھنا ۔ نَبَذَ العَھْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَبَذَ الاَمْرَ ۔ کسی کام کو بیکار چھوڑ دینا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ہیں ۔

اَلاِنْتِبَاذُ ۔ ایک طرف ہٹ جانا ۔ کنارہ کش ہو جانا ۔ (۱۹/۱۶) ۔ اَلنَّبْذُ ۔ کھجور یا کشمش کو پانی میں ڈال کر ایک طرف رکھ چھوڑنا تاکہ وہ نبیذ بن جائے** ۔

کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ (۱۰۴/۴) ۔ سرمایہ دار اور اُس کا تمام مال ایک بے قدرو قیمت متاع کی طرح بیکار رہ جائیگا ۔ (حُطَمَۃٌ کے لئے دیکھئے ح ۔ ط ۔ م )

سورہ انفال میں قوم مخالف سے معاہدات کے ضمن میں ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ . . . (۸/۵۸) ۔ اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خدشہ ہو تو ان سے برابری کی حالت میں معاہدہ کو ان کی طرف پھینکدو ۔ یعنی خیانت کے خدشہ سے تم ، بلا تنبیہہ ، یونہی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے لگ جاؤ ۔ نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی فکر کرو ۔ بلکہ جس برابری کی حیثیت سے تم نے ان سے معاہدہ کیا تھا ، اسی حیثیت سے ان سے کہدو کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا اس لئے تمہارا اور ہمارا معاہدہ کالعدم سمجھا جائے ۔ عَلٰی سَوَاءٍ (یعنی انہیں برابری کی حیثیت دو ۔ یا یکبارگی معاہدہ کوکالعدم قرار دینے سے انہیں اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو از روئے عدل و انصاف انہیں اس نقصان سے بچاؤ ) کی شرط جس اصولِ عدل کی گواہی دیتی ہے وہ قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے ۔ اس کے برعکس ، غیر مسلموں (زمانہ نبوی ؐ کے اہل کتاب ) کی حالت یہ تھی کہ اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ . . . (۲/۱۰۰) " جب کبھی وہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو ان میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو (ردی کی ٹوکری میں ) پھینکدیتا ہے ۔ ان دونوں آیتوں میں خالی نَبَذَ اور نَبَذَ عَلٰی سَوَاءٍ کا فرق بین طور پر سامنے آجاتا ہے ۔

## ن ب ز

اَلنَّبْزُ ۔ کسی کا نام دھرنا ۔ کوئی برا لقب دینا ۔ اَلتَّنَابُزُ ۔ ایک دوسرے کو عار دلانا ۔ ایک دوسرے کو عار دلانے والے القاب سے یاد کرنا ۔ ایک دوسرے کے مذموم نام رکھنا ۔ اَلنَّبِیْزُ ۔ اخلاق اور حسب کے اعتبار سے کمینہ ۔ اَلنَّبْزُ ۔ کھجور کے درخت کا بالائی چھلکا* ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **محیط ۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱)۔ آپس میں ایک دوسرے کے طنز و تحقیر آمیز نام نہ دھرا کرو۔

## ن ب ط

اَلنَّبَطُ۔ وہ پانی جو کنواں کھودتے پر پہلے پہل نکلے۔ اَنْبَطَ الْحَافِرُ کھودنے والا کھودتے کھودتے پانی تک پہنچ گیا۔ اسی سے اس کے معنی ہوتے ہیں بات کو گہرائی سے نکال لینا اور ظاہر کر دینا*۔ تحقیقات کے بعد بات کی اصل تک پہنچ جانا اور اسے ظاہر کر دینا۔ قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳)۔ ان میں سے وہ لوگ جو تحقیقات کے بعد بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے اس کے معنی استخراج کے ہیں*۔ یہی معنی ابن فارس نے بھی لکھے ہیں۔ یعنی پیش نظر واقعات سے خاص نتیجہ نکالنا۔ اس کے غوامض تک پہنچ جانا۔

## ن ب ع

اَلنَّبْعُ۔ چشمہ سے پانی کا نکلنا۔ اَلْيَنْبُوْعُ۔ چشمہ، جہاں سے پانی نکلتا ہو (جمع يَنَابِيْعُ)*۔ قرآن کریم میں ہے۔ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا (۱۷/۹۰)۔ "تو ہمارے لئے اس زمین سے چشمہ بہا دے"۔ سورۃ زمر میں ہے۔ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ (۳۹/۲۱)۔ "پھر اسے (پانی کو) چشمے بنا کر زمین میں بہاتا ہے"۔ مَنْبَعُ الْمَاءِ۔ پانی پھوٹنے کی جگہ*۔

## ن ت ق

نَتَقَ۔ يَنْتِقُ۔ (يَنْتُقُ)۔ کسی چیز کو سخت حرکت دینا۔ اور ہلانا*۔ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷/۱۷۱)۔ جب ہم نے اس پہاڑ میں زلزلہ پیدا کیا جو ان کے سروں کے اوپر تھا۔ اَلنَّاتِقُ مِنَ الْخَيْلِ۔ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو اچھال اچھال کر اس کا کچومر نکال دے۔ یا اسے گرا دے۔ اَلنَّتْقُ کے معنے اکھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں اور ہلا کر جھاڑ دینے کے بھی*۔ یہ سب حرکت ہی کے مظاہرے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنے کے ہیں کہ وہ ڈھیلی ہوجائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھینچنے، ہلانے اور اسے اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے ہیں۔

---

*تاج۔ **راغب۔

# ن ش ر

نَشَرَ - يَنْشُرُ - نَشْرًا وَ نِشَارًا - کسی چیز کو بکھیر دینا - فَانْتَشَرَ - پس وہ بکھر گئی - اَلنَّشَرُ - راز کی باتوں کو پھیلانا - بہت زیادہ باتیں کرنا - اَلْمُنْتَشِرُ - کمزور آدمی جس میں کوئی بھلائی کی بات نہ ہو - اَلْمِنْشَارُ - اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس سے کچی کھجوریں گر جائیں - یعنی وہ پکنے سے پہلے ہی گر جائیں اور اس طرح اس کا پھل کسی کام نہ آئے* - قرآن کریم میں مجرمین کے اعمال کے متعلق ہے فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ہم انہیں بے نتیجہ اور رائیگاں جانے والا بنا دینگے - مکافاتِ عمل کی میزان میں ان کا کچھ وزن نہیں ہوگا - وہ فضا میں منتشر ذرات کی طرح ہو جائیں گے - یعنی وہ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرسکینگے - (''بے نتیجہ'' رہ جانے سے یہی مطلب ہے) -

بکھرنے کے معنوں میں سورۃ انفطار میں ہے - اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۸۲/۲) - جب ستارے بکھر جائینگے - ان کا شیرازہ منتشر ہوجائیگا -

# ن ج د

اَلنَّجْدُ - زمین کا وہ حصہ جو بلند اور سخت ہو - نیز بلند ، کھلے اور واضح راستے اور ، ماہر راہنما کو بھی کہتے ہیں** -

نَجَدَ الْاَمْرُ يَنْجُدُ - معاملہ واضح اور ظاہر ہوگیا** - قرآن کریم میں ہے - وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰/۱۰) ہم نے انسان کو (حق و باطل کے) دونوں راستے (وحی کے ذریعے) دکھا دئے - اب اس کے بعد وہ صاحب اختیار ہے کہ ان میں سے جونسا راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرلے - واضح رہے کہ حق و باطل کے راستے ، وحی (قرآن) کی رو سے دکھائے گئے ہیں - انسان کے اپنے اندر اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ وحی کی روشنی کے بغیر از خود خیر و شر میں تمیز کرسکے - (دیکھئے عنوان ل - ھ - م اور ف - ط - ر) -

نیز ، خدا کا کام صرف راستے دکھا دینا ہے - صحیح راستہ پر چلا دینا نہیں - یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ جونسا راستہ چاہے اختیار کرلے- یہی اختیار ، انسان کو اس کے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بنا دیتا ہے اور اسی سے وہ اپنے اعمال کے (اچھے اور برے) نتائج کا مستحق قرار پاتا ہے -

*تاج و محیط و راغب - **تاج و راغب -

# ن ج س

اَلنَّجَسُ ۔ یہ طَاهِرٌ کی ضد ہے (جس کے لئے دیکھئے عنوان ط ۔ ھ ۔ ر) قَدْ نَجِسَ ثَوْبُہٗ ۔ اس کا کپڑا ناپاک ہوگیا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ نَجَاسَۃٌ ۔ دو طرح کی ہوتی ہے ۔ ایک تو وہ جس کا ادراک حاسہ (بصارت) سے کیا جا سکتا ہے ۔ اور دوسرے وہ جس کا ادراک بصیرت سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسے دل کی آلودگی ۔ نگاہ کی ناپاکی ۔ انہی معنوں میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (۹/۲۸) ''مشرکین یقیناً آلودگیوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں''۔ دَاءٌ نَاجِسٌ ۔ ایسی بیماری جس سے انسان اچھا نہ ہو* ۔

اهل عرب اپنے بچوں کے گلے میں آسیب اور نظر بد وغیرہ سے بچنے کے لئے تعویذ پہنا دیا کرتے تھے ۔ یہ تعویذ گندی چیزوں کے ہوا کرتے تھے ۔ مثلاً مردوں کی ہڈیاں ۔ یا حیض کا کپڑا وغیرہ ۔ اسے وہ اَلتَّنْجِیْسُ کہتے تھے** ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ازالۂ نجاست کی وجہ سے اس عمل کو اَلتَّنْجِیْسُ کہا گیا ہو ۔

# ن ج م

اَلنَّجْمُ ۔ ستارہ جب وہ نکلا ہوا ہو ۔ جمع اَنْجُمٌ اور نُجُوْمٌ ۔ نیز اَلنَّجْمُ اُس پودے کو کہتے ہیں جسکا تنہ نہ ہو اور وہ زمین پر پھیل جائے ۔ برخلاف اَلشَّجَرُ کے جسکا تنہ ہوتا ہے*** ۔ اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵/۶) کے یہی معنی ہیں ۔ (یہ دونوں لفظ اسم جمع ہیں ۔ ان کا واحد ''ۃ'' سے بنتا ہے ۔ اگرچہ ، جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے ، اَلنَّجْمُ کی جمع بھی آتی ہے ۔ ویسے ، اسم جمع بالعموم لفظاً واحد استعمال ہوتے ہیں اور معناً جمع ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں ۔ اَلنَّجْمَۃُ کلمہ (لفظ اور بات) کو بھی کہتے ہیں*** ۔ قرآن کریم کے آہستہ آہستہ بالاقساط نازل ہونے کو بھی اَلنَّجْمُ کہا جاتا ہے*** ۔ لیکن قرآن کریم میں اس مفہوم کے لئے یہ لفظ نہیں آیا ۔

نَظَرَ فِی الْاَمْرِ ۔ کسی معاملہ میں اس غرض سے غور و فکر کرنا کہ اسکی تدبیر کس طرح سے کی جائے ۔ چنانچہ سورہ صٰفّٰت میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق جو ہے کہ فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸) تو اسکے معنی غوروفکر

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

کرنے کے ہیں* ۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم نے (ن ۔ ظ ۔ ر) کے عنوان میں لکھا ہے ۔ یعنی نکتہ چینی کرنا ۔ عیب نکالنا تنقید کرنا ۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ اَلنَّجُوْمُ رؤسائے قوم یا چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو کہتے ہیں**۔ برخلاف اَلشَّمْسُ کے جس سے مراد ایران کی سلطنت ہے ($\frac{81}{1-3}$) ۔

## ن ج و

نَجَاءٌ ۔ نَجَاةٌ نَجَايَةٌ ۔ کسی ایسی چیز سے محفوظ رہنا جس میں خطرہ ہو ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ نَجْوَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بلند جگہ ۔ اَلنَّجْوَةُ وَالْمَنْجٰی ۔ اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس کی بلندی کی وجہ سے اس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلنَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ ۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جو اپنی بلندی کی وجہ سے ارد گرد سے الگ اور ممتاز نظر آئے ***

نَجَا ۔ يَنْجُوْ ۔ نَجَاءً ۔ تیز چلنے اور آگے نکل جانے کو بھی کہتے ہیں ۔ ایک حدیث میں ہے اِذَا سَافَرْتُمْ فِي الْجَدْبِ فَاسْتَنْجُوْا ۔ جب تم کسی خشک اور قحط زدہ زمین میں سفر کرو تو وہاں سے تیزی سے گذر جاؤ ۔ اسی لئے نَاقَةٌ نَاجِيَةٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں***۔

راغب نے کہا ہے کہ نَجَاءٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں **** ۔ نَجَا غُصُوْنَ الشَّجَرَةِ ۔ درخت کی شاخیں کاٹ دیں ۔ نَجَا الْجِلْدَ کے معنی ہیں کھال کھینچ دی *** ۔ ابن فارس نے اس کے دو بنیادی معنی لکھے ہیں جو باہمدگر متضاد ہیں ۔ (۱) کسی چیز کو چھیل دینا اور کھول دینا ۔ اور (۲) چھپانا اور پوشیدہ کرنا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اسکا استعمال بلندی کے معنوں میں بھی بتایا ہے ۔

اس لفظ کے بنیادی معنوں کو سامنے رکھنے سے نجات کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ دوسرے مذاہب میں انسان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کے جیل خانے میں بری طرح قید ہے ۔ اسے اس قید سے رہائی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں ، اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے ۔ اس سزا سے خلاصی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ابن آدم پیدائشی طور پر اپنے

*تاج ۔ **غریب القرآن (میرزا ابوالفضل ۔) ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناھوں کو اپنی پیٹھ پر لادے ھوئے آتا ھے اور اس کثافت سے اسکا چھٹکارا ناممکن ھے جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے۔ ویدانت (یعنی ھندوؤں کے تصوف) کا عقیدہ یہ ھے کہ انسانی روح (آتما) اپنی اصل (پرماتما) سے الگ ھو کر مادہ کی دلدل میں پھنسکر چیخ پکار کر رھی ھے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پاکر جزو کا اپنی اصل سے جاکر مل جانا نجات ھے۔ ایسا ھی تصور بدھ مت میں ھے جنکا عقیدہ ھے کہ ھر آرزو ایک مصیبت کا پیش خیمہ ھوتی ھے۔ انسان، ترک آرزو سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ھے۔ اسے نروان کہتے ھیں۔ مختصراً یہ کہ ان مذاھب نے تصور یہ دیا ھے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے اچھی حالت میں تھا۔ اس میں آکر یہ مصیبت میں پھنس گیا۔ اب اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرکے، پھر سے اپنی پہلی حالت میں پہنچ جانا (نجات) مقصود حیات ھے۔ قرآن کریم ان تمام تصورات کی تردید کرتا ھے۔ وہ کہتا ھے کہ انسان نہ تو اپنے کسی سابقہ جنم کے گناھوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ھے اور نہ ھی اپنے اولین ماں باپ کے گناھوں کی آلودگی کو اپنے ساتھ لاتا ھے۔ اس لئے دنیا جیل خانہ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود حیات ھو۔ نہ ھی انسانی روح، خدا کی روح کا جزو ھے جو مادہ کی دلدل میں پھنسی ھوئی ھے اور یہاں سے خلاصی پا لینے کا نام نجات ھے۔ وہ کہتا ھے کہ ھر انسانی بچہ ایک سادہ لوح (Clean Slate) لیکر دنیا میں آتا ھے۔ اسے فطرت کیطرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ھیں۔ اس میں "کچھ بننے" کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) ھوتی ھیں۔ ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصود حیات ھے تاکہ انسان اس زندگی سے بلندتر زندگی بسر کرنے کے قابل ھو سکے۔ مقصود زیست (As you Were) ھونا نہیں۔ ترقی کرنا اورآگے بڑھنا ھے۔ زمین کی زندگی انسان کی تربیت گاہ ھے۔ اس میں اسکی ذات کی نشوونما (Development) ھوتی ھے جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگواریاں اور شادکامیاں حاصل کر لیتا ھے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ھو جاتا ھے۔ لہذا دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لینا مقصودِ حیات نہیں۔ اس دنیا کو مسخر کرکے اسکی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اسطرح اپنی ذات کی نشو و نما اور انسانیت کی فوز و فلاح حاصل کرنا مقصود حیات ھے۔

دنیا میں باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش لازمی ھے۔ اور اس کشمکش ھی سے انسانی ذات کا استحکام ھوتا ھے۔ جو جماعت، قانون خداوندی کے

مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے ان مستبد قوتوں کی گرفت سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور تباہی اور بربادی سے مصئون ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی غلط روش کی وجہ سے مستبد قوتوں کے فولادی پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اسکے بعد پھر قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو اسے ان سرکش قوتوں کے دام بلا سے رہائی مل جاتی ہے ۔ اس کے لئے بھی نجات کا لفظ آیا ہے ۔ (جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے رستگاری نصیب ہو جانا ان کی نجات تھی)۔

اب رہی مرنے کے بعد جہنم کی سزا سے نجات ۔ سو اس کے متعلق یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی بعض لغزشوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے جہنم میں رہیں گے اور اس کے بعد ، جب اس سزا کی مدت ختم ہو جائے گی یا ان گناہوں کی کثافتیں دور ہو جائینگی تو پھر جنت میں چلے جائینگے (۳/۲۴)۔ یعنی ان کے ہاں جہنم سے مفہوم یہ ہے کہ یا تو انسان اس میں ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے بھیجا جائیگا اور یا اس لئے کہ اس کے گناہ دھل جائیں اور وہ پاک و صاف ہو کر جنت میں چلا جائے ۔ اسکا نام ان کے ہاں نجات ہے ۔

یہ دونوں تصور بھی قرآن کریم کے خلاف ہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے انسان جہنم میں نہ تو ایک قیدی کی طرح ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے جاتا ہے اور نہ ہی جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں گناہوں کی کثافتیں صاف ہوتی ہیں تاکہ انسان پاک و صاف ہو کر جنت میں جائے ۔ قرآن کریم کا تصور یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمر صلاحیتوں (ذات) کی اتنی نشو و نما ہو جائے کہ وہ زندگی کی اگلی منزل (یعنی سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی) تک پہنچنے کے قابل ہو جائے تو اسے جنت کی زندگی کہتے ہیں جس میں اسکی نشو و نما مزید ترقی حاصل کرتی رہتی ہے ۔ لیکن اگر وہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے تو اسکی نشو و نما رک جاتی ہے ۔ اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں*۔ جس کی نشو و نما رک جاتی ہے وہ زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا ۔ وہ اسی مقام پر رکا رہتا ہے ۔ اس لئے کسی کے "جہنم" سے نکلنے

*واضح رہے کہ جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی ۔ اس مقام پر جس جنت اور جہنم کی زندگی کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے ۔

کا سوال هی پیدا نہیں هوتا ۔ اس اعتبار سے نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے جسکی رو سے ( یہودیوں کی طرح ) سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناهوں کی سزا بھگتنے ( یا پاک و صاف ہونے ) کے لئے کچھ وقت کے لئے جہنم میں جائیگا اور پھر وهاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائیگا ۔ ( اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے تفصیل ان امور کی جہنم اور جحیم وغیرہ عنوانات میں ملے گی )۔

نَجْوٰی کے معنی سرگوشی اور رازداری کی باتیں کرنے کے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بستی سے باہر جا کر کسی بلند مقام پر بیٹھ کر آپسمیں رازداری کی باتیں کیا کرتے تھے ۔ اور اسکیمیں بنایا کرتے تھے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نَجَاۃٌ سے ماخوذ ہے ۔ اس طرح نَجْوٰی کا مطلب ہوگا ، مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا ۔ اِنْتَجٰی کے معنی بلند مقام پر بیٹھنے کے ہیں *۔ نَجِیٌّ ۔ هم راز جس کے ساتھ سرگوشی کی جائے ($\frac{19}{52}$) ۔ اسی سے فعل تَنَاجٰی وتَنَاجٰی ۔ باهم سرگوشی کرنے کے لئے آتا ہے ۔ قرآن کریم میں نجویٰ کا لفظ راز اور مشوروں کے معنی میں کئی جگہ آیا ہے ( مثلاً ۔ $\frac{20}{62}$ ; $\frac{58}{7}$ )۔

سورہ یونس میں فرعون ۔ حضرت موسیٰؑ کی غرقابی کے سلسلہ میں ہے فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَۃً ($\frac{10}{92}$) ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ اس میں نُنَجِّیْکَ کے معنی ہیں کسی بلند جگہ پر پھینکدینا ۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ فرعون غرق ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا تھا تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آیہ عبرت بن سکے ۔ مصر کے تہ خانوں سے ، فراعنہ کی جو لاشیں ملی هیں اس میں فرعون حضرت موسیٰؑ کی لاش بھی موجود ہے (دیکھئے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا ۔ عنوان ممّی ) ۔ چونکہ یہ انکشاف حال هی کا ہے اور همارے قدیم مفسرین کو اس کا علم نہیں تھا ، اس لئے ظاهر ہے کہ وہ اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے ۔ ( یہی وجہ ہے کہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس آیت میں بَدَنٌ کے معنی زرہ کے کئے ہیں ۔ یعنی فرعون کی زرہ پانی سے باهر ، بلند جگہ پر پھینک دی گئی تھی ۔ لیکن مذکورہ صدر انکشاف نے حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا ہے کہ بَدَنٌ سے مراد فرعون کی لاش هی ہے )۔

*تاج۔

قرآن کریم نے اپنے حقائق کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں بے نقاب ہوتی جائینگی، قرآنی حقائق کی وضاحت ہوتی جائیگی (۴۱/۵۳)۔ ان ''نشانیوں'' کے بے نقاب ہونے کا ایک طریق تاریخی شواہد کا سامنے آنا بھی ہے، جیسا کہ فرعون کی لاش کے سلسلہ میں ہوا۔

## ن ح ب

اَلنَّحْبُ۔ وہ نذر (منت) جس کے واجب ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے*۔ نَحَبَ الرَّجُلُ یَنْحَبُ۔ آدمی نے نذر مانی**۔ اَلتَّنْحِیْبُ۔ لگا تار سرگرمی اور انہماک سے کام کرنا۔ اَلنَّحْبُ۔ موت۔ جوا اور قمار بازی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں شرط باندھی جاتی ہے جس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اَلنَّحْبُ۔ خطرۂ عظیم***۔ بلند آواز سے رونا***۔ ابن فارس نے بھی یہ دونوں معانی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَهٗ۔ (۳۳/۲۳)۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی نذر (واجبات) کو پورا کر دیا۔ حق کی خاطر جان دے دی۔

## ن ح ت

نَحَتَ یَنْحَتُ و یَنْحِتُ۔ کسی چیز کو چھیلنا۔ تراش کر ہموار کرنا***۔ اَلنَّحَاتَۃُ۔ بڑھئی کے لکڑی چھیلنے کو کہتے ہیں****۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُیُوْتًا (۷/۷۴)۔ تم پہاڑوں کو کاٹ اور تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔

## ن ح ر

نَحْرُ الصَّدْرِ۔ سینے کا اوپر کا حصہ۔ سینہ پر جہاں ہار پہنا جاتا ہے۔ نَحَرَ الْبَعِیْرَ یَنْحَرُہٗ نَحْرًا۔ اس نے اونٹ کے سینہ سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (اونٹوں کو اسی طرح ذبح کرتے ہیں)***۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس مادہ سے کئی الفاظ آتے ہیں۔ سینے کو بھی کہتے ہیں اور سینے کے چیر دینے کو بھی۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انْحَرْ (۱۰۸/۲)۔ اس میں وَ انْحَرْ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا

*راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔ ****لسان العرب۔

ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا ۔ (۲) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا ۔ (۳) قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرلنا ۔ (۴) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ۔ (۵) نماز میں (نحرتک) ہاتھ اٹھانا ۔ (۶) اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ کر کھڑے ہونا ۔ (۷) خواہشات کا قلع قمع کرنا ۔ (۸) دن کے ابتدائی حصہ میں (قبلہ رخ) کھڑے ہونا* ۔ لیکن تَنَحَّرَ کے معنی ہیں دسترس پیدا کرنا ۔ کسی بات پر حاوی ہوجانا ۔ اسے اچھی طرح حاصل کرلینا ۔ تَنَحَّرْتُ الشَّيْءَ عِلْمًا ۔ میں علم کے ذریعے اس معاملہ پر حاوی ہوگیا** ۔ تَنَحَّرَ الْاُمُوْرَ عِلْمًا ۔ اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا*** ۔ چنانچہ اَلنِّحْرُ ۔ وَالنِّحْرِيْرُ کے معنی ہیں ماہر ۔ عقل مند ۔ تجربہ کار ۔ ہر چیز کو سمجھنے اور دیکھنے والا اور مضبوطی سے اس پر عمل کرنے والا*** ۔ اس لئے وَانْحَرْ (۱۰۸/۲) کے معنی ہونگے ، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہوکر ، اُن پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رہو ۔

لیکن اگر اس آیت میں وَانْحَرْ سے مراد "اونٹ کا ذبح کرنا" لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے ۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا ۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈھتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کردیتی ہیں ۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال ۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے ۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہینگے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہینگے ۔ قرآن کریم نے ہیں اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں "اونٹ ذبح کرو" ۔ یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو ۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کرلی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے ۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ہے کہ عبرانی زبان میں "کوشر" حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں ۔ اَلْكَوْثَرَ (۱/۱۰۸) اسی سے معرب ہے اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱/۱۰۸) کے معنے ہونگے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا" ۔ لیکن ہم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی ۔ دیکھئے عنوان (ک ۔ ث ۔ ر) ] ۔

*تاج ۔ **اساس زمخشری بحوالہ غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ ***محیط ۔

# ن ح س

اَلنُّحَاسُ ( نون پر تینوں حرکتیں جائز ہیں ) ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ پیتل یا لوہے کو جب کوٹا جائے تو اس میں سے جو چنگاریاں اڑتی ہیں انہیں بھی کہتے ہیں ۔ نیز اس اونچے ہو جانے والے دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جس میں خفیف حرارت ہو لیکن لپٹ اور شعلہ نہ ہو*۔ راغب نے اسکے معنے ایسے شعلہ کے لکھے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔ یہیں سے نَحْسٌ ہے ، جس کے معنی یہ ہیں کہ افق آسمان نُحَاسٌ کی طرح سرخ ہو جائے ۔ اسے عرب نحوست کی نشانی سمجھتے تھے** ۔ اسی سے اَلنَّحْسُ ہر تاریک معاملہ کو کہتے تھے ۔ اور مشقت ، تکلیف ، نقصان ، ضرر اور تکان کو بھی ۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَسَتِ الْاِبِلُ فُلَانًا ۔ اونٹوں نے فلاں آدمی کو تھکا دیا ۔ اَلنَّحْسُ ۔ اُن تین راتوں کو کہتے جن کا بڑا حصہ چاند نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہوتا ہے ۔ تَنَاحَسَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی اوندھا ہوگیا ۔ تَنَحَّسَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بھوکا رہا ۔ نَحَسَهٗ نَحْسًا ۔ اس نے اس کے ساتھ بے مروتی کی ۔ جفا کی ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ سخت سردی کے دنوں کو بھی کہتے ہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سعادت کی ضد ہیں ۔ اَلنُّحَاسُ پیتل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سونا چاندی کے مقابلہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کم تر ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں نُحَاسٌ ($\frac{55}{35}$) ۔ دھوئیں یا چنگاریوں کے معنوں میں بھی آیا ہے ۔ یعنی جہنم کا عذاب ۔ سورہ قمر میں قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ان پر سخت جھکڑ آیا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ($\frac{54}{19}$) ان کی مسلسل مصیبت کے دن میں ۔ ( یَوْمِ نَحْسٍ مرکب اضافی ہے ) اسی کو دوسری جگہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ ($\frac{41}{16}$) کہا گیا ہے ۔ پرمشقت ایام ۔ ( مرکب توصیفی ) ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سعد و نحس کا مفہوم وہ نہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے ۔ ہمارے ہاں ( مثلاً ) کہتے ہیں کہ منگل کا دن منحوس ہوتا ہے ۔ یہ خالص ہندوانہ تصور ہے اور توہم پرستی پر مبنی ۔ کوئی دن یا کوئی گھڑی فی ذاتہ نہ سعید ہوتی ہے نہ منحوس۔ جسدن کسی پر اس کے کسی غلط کام کی وجہ سے مصیبت آتی ہے وہ دن اس کے لئے منحوس ہوتا ہے ( یعنی مصیبت کا دن ) اور جسدن کامیابی اور

---

*تاج ۔ **راغب ۔

شادکامی اسکے سامنے آئے وہ دن سعید ۔ لہذا سعادت اور نحوست انسان کے اپنے اعمال ہی کے نتائج کا نام ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان س ۔ ع ۔ د)

## ن ح ل

اَلنَّحْلُ ۔ شہد کی مکھیاں* ۔ (۱۶/۶۸) ۔ اَلنِّحْلَةُ اَلنَّحْلَةُ ۔ وہ عطیہ جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے دیا جائے** ۔ سورہ نساء میں ہے وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴/۴)۔ عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ، بلا بدل دے دو ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر وہ عطیہ (Gift) ہے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جاتا ہے*۔ اَلْعَطَاءُ بِلَا عِوَضٍ (لطائف اللغۃ)۔ تاج اور ابن فارس نے النِّحْلُ کے یہی معنی لکھے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ لفظ نَحْلٌ ہی سے مشتق ہے ۔ یعنی جسطرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید چیز عطا کر دیتی ہے ، اسی طرح نِحْلَةٌ وہ شیریں تحفہ ہے جو عورت کو بطیب خاطر اور بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ہے ۔ یہ ہے مہر کی حقیقت ۔ (قرآن کریم میں مہر کا لفظ نہیں آیا)۔ یعنی یہ کوئی معین رقم نہیں جو بطور معاوضہ دی جائے ۔ بلکہ تحفہ ہے جو کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مودت اور محبت کے اظہار کے لئے دیا جائے ۔ اور جس پر دونوں فریق رضامند ہو جائیں ۔ مقصود اس سے عورت کا وزن بڑھانا ، اس کے وقار میں اضافہ کرنا ہے ۔

## نَحْنُ (ضمیر)

نَحْنُ ۔ ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ تثنیہ (دو) اور جمع متکلم کیلئے آتی ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے یکساں طور پر استعمال ہوتی ہے ۔ نَحْنُ رَجُلَانِ ۔ ہم دو مرد ہیں ۔ نَحْنُ امْرَأَتَانِ ۔ ہم دو عورتیں ہیں ۔ نَحْنُ رِجَالٌ ۔ ہم سب مرد ہیں ۔ نَحْنُ نِسْوَةٌ ۔ ہم سب عورتیں ہیں ۔

سورہ بقرہ میں ہے نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲/۱۴) ۔ ”ہم تو مذاق کرتے ہیں“ ۔

## ن خ ر

نَخَرَ ۔ يَنْخُرُ ۔ آواز یا سانس کو ناک میں کھینچنا ۔ ناک سے نکلنے والی آواز نَخِيْرٌ کہلاتی ہے ۔ اَلنُّخْرَةُ خود ناک کو بھی کہتے ہیں ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

نَخْرَۃُ الْاَنْفِ ۔ ناک کے اگلے حصے اور اسکی نوک کو کہتے ہیں*۔ ناک کا شگاف ۔ نتھنا***۔ اسی سے عَظْمٌ نَخِرٌ اس بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں جو اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی ہو*۔ قرآن کریم میں عِظَامًا نَخِرَۃً (۷۹/۱۱) ۔ بوسیدہ ہڈیوں کے لئے آیا ہے ۔ نَخِرَتِ الشَّجَرَۃُ ۔ درخت میں سے آواز نکلی ۔ یہ اسوقت ہوتا ہے جب درخت بوسیدہ اور کھوکھلا ہو جائے اور اس میں ہوا کے گذرنے کے لئے سوراخ ہو جائیں ، تو ہوا کے چلنے سے اس میں سے آواز نکلے**۔

## ن خ ل

نَخَلَہٗ ۔ اسے صاف کیا ۔ پسند کر لیا*۔ نَخَلَ الدَّقِیْقَ ۔ آٹے کو چھلنی میں چھان لیا*۔ اَلْمُنْخَلُ اور اَلْمُنْخُلُ ۔ چھلنی ۔ اَلنَّخْلُ ۔ اَلنَّخِیْلُ (واحد نَخْلَۃٌ) ۔ کھجور کے درخت ۔ جو درخت کھجور کے مشابہ ہوں مثلاً ناریل وغیرہ ، ان کے لئے بھی یہی لفظ بولتے ہیں (۲/۲۶۶ ؛ ۱۹/۲۵ ؛ ۵۵/۶۸) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتخب کرنا اور پسند کرنا ہیں ۔ کھجور کے درختوں کو اَلنَّخْلُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تنے دار درختوں میں سب سے زیادہ بلند و برتر ہوتے ہیں ۔

## ن د د

نِدٌّ کے معنی ہیں کسی کی مثل اور نظیر ۔ لیکن یہ اسی مثل کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی کے جوہر و بنیاد (Basic characteristics, or Essence) میں شریک ہو ۔ اور چونکہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں انتشار و تنفر بھی پایا جاتا ہے ، مثلاً نَدَّ الْبَعِیْرُ ۔ اونٹ بدکا اور جدھر منہ اٹھا چل پڑا ۔ نَدٌّ ۔ نفرت ، مخالفت ، اور علیحدگی کو کہتے ہیں ۔ اس لئے نِدٌّ مد مقابل کو کہتے ہیں ۔ یعنی ایسا شخص جو تمہاری مخالفت کرے ۔ تم اسے ایک طرف لے جانا چاہو اور وہ تمہیں دوسری طرف کھینچے ۔ اور جسقدر تم اسے اپنی طرف لے جانے میں زور لگاؤ اسی قدر وہ تمہیں اپنی طرف لے جانے میں کوشش کرے ۔ چنانچہ اَلتَّنَادُّ کے معنی ہیں متفرق ہونا ۔ ایک دوسرے سے متوحش ہونا****۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انتشار و افتراق کے ہیں ۔ تَنْدِیْدٌ کے معنی ہیں کسی کی برائیوں کو اچھالنا اور شہرت دینا ۔ لَیْسَ لَہٗ نَادٌّ کے معنی ہیں اسکے پاس رزق نہیں ۔ یعنی کوئی بدکنے والا جانور نہیں****۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن فارس ۔ ****تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تمہارے لئے رزق پیدا کرتا ہے ۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲) ۔ سو تم خدا کے مقابلہ میں ایسی طاقتوں کو تسلیم نہ کرو جنہیں تم (بزعم خویش) سمجھتے ہو کہ اسکی مثل و نظیر ہیں ۔ یعنی خدا کی اس بنیادی خصوصیت (رزاقیت) میں شریک ہیں ۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵) ۔ یہاں اَنْدَادٌ سے مراد ہیں تمام وہ قوتیں جو خدا کے مد مقابل ٹھہرائی جاتی ہوں اور انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہوں (حُبٌّ کے یہی معنی ہیں) ۔ یا وہ جاذبیتیں جن کی طرف انسان کھنچکر چلا جاتا ہے ۔ لہذا جس قوت کے سامنے آپ اس کے خوف سے جھکیں یا نفع کی امید سے اسکی طرف کھنچیں اور اس میں قانون خداوندی کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو وہ خدا کے مقابلہ میں نِدٌّ ہو جائیگی ۔ ایسا عقیدہ ، تصور یا نظام جس میں کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو وہ اقتدار اور اختیار حاصل ہو جائے جو قوانین خداوندی کے لئے مخصوص ہے ، "اندادًا من دون اللہ" کا مظہر ہے ۔

[يَوْمَ التَّنَادِ کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ د ۔ و]

## ن د م

نَدَامَةٌ ۔ اس افسوس کو کہتے ہیں جو کسی ہاتھ سے نکل جانے والے معاملہ پر رائے بدل جانے سے پیدا ہو* ۔ نیز اپنی کوتاہی پر نفس کو برا بھلا کہنا ، یا ایسا غم جس میں انسان یہ کہے کہ جو کچھ اس سے ہو گیا وہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا** ۔ پچتانا ۔ پشیمان ہونا ۔ سورۃ یونس میں ہے وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰/۵۴) ۔ "وہ ندامت کو چھپائینگے (یا ندامت ظاہر ہو جائیگی)" ۔ نَادِمٌ ۔ جسے ندامت ہو ۔ اس کی جمع نَادِمِيْنَ ہے ۔ (۵/۳۱) ۔

اَلنَّدِيْمُ ۔ ساتھ بیٹھ کر شراب پینے والا* ۔

## ن د و (ی)

اَلنَّدٰى کے بنیادی معنی ہیں رطوبت ، نمی ، شبنم ۔ نَدَى الْاَرْضِ ۔ زمین کی نمی ۔ شَجَرٌ نَدْيَانٌ ۔ تر و تازہ درخت*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا اور یک جا ہونے (۲) رطوبت اور نمی کے ہیں ۔

---

*تاج وراغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

چونکہ جس شخص کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو وہ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور اس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے اس لئے اَلتَّنِدَاءُ کے معنی خالی آواز بلند کرنے کے بھی ہوئے ہیں۔ یعنی محض اونچی آواز ، جس میں الفاظ نہ ہوں*۔

آواز دینے کے مفہوم سے اس کے معنی ایک مجلس میں اکٹھے ہو کر باتیں کرنے کے ہو گئے۔ نَادَاہُ مُنَادَاۃً ۔ کسی کے ساتھ مجلس میں بیٹھا ۔ اَلنَّدِیُّ وَالنَّدْوَۃُ ۔ جہاں قوم جمع ہو کر بیٹھے اور باتیں کرے۔ نیز اَلنَّدْوَۃُ جماعت کو بھی کہتے ہیں ۔ دَارُ النَّدْوَۃِ ۔ مکہ میں ایک مکان تھا جس میں قریش مشورہ کے لئے جمع ہوا کرتے تھے ۔ اَلنَّادِیُ ۔ قبیلہ (جسے مدد کے لئے آواز دی جاتی ہے) ۔ یا ہم نشین ۔ اَلنَّدٰی ۔ سخاوت اور کرم کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْمُنْدِیَاتُ ۔ رسوا اور ذلیل کرنے والے کام جن سے پیشانیاں عرق آلود ہوجائیں*۔

قرآن کریم میں نِدَاءً (۲/۱۷۱) بمعنی آواز آیا ہے ۔ اور نَادٰی یُنَادِی نِدَاءً پکارنے (آواز دینے) کے معنوں میں (۱۸/۵۲ و ۱۹/۵۲) میں ۔ سورۃ مریم میں اَحْسَنُ نَدِیًّا (۱۹/۷۳) کے معنی ہیں ، باعتبار مجلس و اجتماع بہترین اور نہایت عمدہ۔ سورۃ العنکبوت میں نَادِیْکُمُ (۲۹/۲۹) کے معنی مجلس اور محفل و اجتماع ہیں ۔ سورۃ العلق میں ہے ۔ فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ (۹۶/۱۷) ۔ وہ اپنے مصاحبوں کو یا قبیلہ والوں کو بلائے۔

تَنَادٰی ۔ باہم آوازیں دینا اور ایک دوسرے کو پکارنا ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ تَنَادَوْا (۶۸/۲۱) ۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا ۔

سورۃ المؤمن میں یَوْمَ التَّنَادِ (۴۰/۳۲) آیا ہے جس کے معنی یہ کہہ کر بتا دئے گئے ہیں کہ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ (۴۰/۳۳) ۔ جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہو گے ۔ یعنی جس دن تم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکارو گے لیکن کوئی کسی دوسرے کی مدد کے لئے نہیں آئیگا ۔ سب ، دہشت اور خوف کے مارے ، منہ پھیرے، الٹے پاؤں بھاگ رہے ہونگے ۔ مَالَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ (۴۰/۳۳) ۔ (اس دن) "تمہیں خدا کی گرفت سے (مکافاتِ عمل سے) بچانے والا کوئی نہیں ہوگا" ۔ یہ ہے یوم التناد ۔ جس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو اور کوئی کسی کو لاکھ آوازیں دے ، اس کی مدد کے لئے پہنچنا تو در کنار ، وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔

# ن ذ ر

نَذْرٌ ۔ (نقصان سے بچنے کے لئے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے ۔ نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی نَذْرٌ کے معنوں میں داخل ہے* ۔ مثلاً کوئی شخص اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے کہ میرا بچہ تندرست ہو گیا تو میں یوں کروں گا ، تو یہ نَذْرٌ کہلاتی ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کے پیش آنے پر کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کرلینا جو واجب نہ ہو** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ڈرنے اور ڈرانے کے لکھے ہیں* ۔ اور یہ کہ جو کچھ واجب ہو اسے نَذْرٌ کہا جاتا ہے ۔

نَذِرَ بِالشَّیْءِ ۔ کسی چیز کو جانا اوراس سے ہوشیار اور چوکنا رہا ۔ اِنْذَارٌ کے معنی ہیں کسی کوکسی ضرر رساں یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ (Warn) کر دینا اوراس کے خوفناک نتائج سے ڈرانا ۔ لشکر سے آگے آگےجو ہراول دستہ جاتا تھاتا کہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اپنے لشکرکو آگاہ کرتا رہے اسے نَذِیْرَۃُ الْجَیْشِ کہتے تھے ۔ اَلنَّذِیْرُ ۔ آگاہ کرنے والا ۔ نیز کمان کی آواز (کیونکہ اسے سن کر شکارخطرہ سے آگاہ ہوجاتا ہے)۔ نیز بڑھاپے کو بھی نَذِیْرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ آنے والی موت سے آگاہ کر دیتا ہے* ۔

لہذا نَذِیْرٌ کے معنی ہیں غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دینے والا ۔ خواہ وہ کوئی انسان ہو یا واقعہ ۔ اس کی جمع نُذُرٌ آتی ہے ( ۵۳/۵۶ ) ۔ (بر خلاف بَشِیْرٌ کے جو صحیح روشِ زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دیتا ہے) ۔

قرآن کریم میں نَذْرٌ (نُذُوْرٌ) بمعنی واجبات کئی ایک مقام پر آیا ہے ۔ (مثلاً ( ۲۲/۲۹ و ۲/۲۷۰ ) ۔ یعنی وہ امور جو اپنے آپ پر واجب قرار دے لئے جائیں ۔ اِنْذَارٌ (تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے) کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۳۶/۱۱ )۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ اِنْذَار ( Warning ) انہی کو فائدہ دے سکتی ہے جن میں زندگی کے آثار موجود ہوں ۔ لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا ( ۳۶/۷۰ ) ۔ جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہ ہو انہیں ان نتائج سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے ( ۲/۶ ) ۔ اِنْذَارٌ اُسی کے لئے ہے جو اپنے اوپر کچھ واجب کرلے اور اسے ادا نہ کرے ۔ اُس سے کہا جا سکتا ہے کہ عدمِ ادائیگیٔ فریضہ سے کیا نقصان

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ہوگا۔ لیکن جس نے انسانی فرائض کو اپنے اوپر واجب ہی نہیں سمجھا، اُسے اُس کی روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرنا کیا نتیجہ خیز ہوسکتا ہے؟ یا مثلاً جو شخص خود کشی پر آمادہ ہو اس سے یہ کہنا کہ دریا میں نہ کودنا، ڈوب کر مر جاؤ گے، بے معنی ہے۔ دریا کی ہلاکت انگیزیوں سے انتباہ اسی کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو ہلاکت سے بچنا چاہے۔ (اسے متقی کہتے ہیں)۔

نَذِيْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے (۵۴/۵ و ۵۳/۳۳)۔ مُنْذِرٌ۔ آگاہ کرنے والا۔ اس کی جمع مُنْذِرِيْنَ ہے (۲۶/۹۲ و ۳۷/۷۲)۔ مُنْذَرٌ۔ جسے آگاہ کیا جائے۔ اس کی جمع مُنْذَرِيْنَ ہے (۳۷/۷۳)۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام کے متعلق کہا ہے کہ وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں۔ ان حضرات کا فریضہ یہ تھا کہ وہ (از روئے وحی) لوگوں کو بتائیں کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہونگے (اسے خوشخبری یا بشارت کہتے ہیں) اور ان کی خلاف ورزی کا انجام کس قدر ہلاکت آفریں ہوگا (یہ تنبیہ یا انذار کہلاتی ہے)۔ جو لوگ زندگی کی ہلاکتوں سے بچنا چاہتے (انہیں متقین کہا جاتا ہے) وہ ان کی انذار سے فائدہ اُٹھا کر، صحیح روش اختیار کر لیتے۔ جو ان ہلاکتوں کی پرواہ نہ کرتے، وہ اس انذار پر کان نہ دھرتے۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَ أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)۔ آج تبشیر و انذار کا فریضہ قرآن کریم ادا کرتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بدلائل و شواہد بتا دیا ہے کہ فلاں روشِ زندگی کا نتیجہ کیا ہوگا اور فلاں کا انجام کیا۔ اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ تم جونسی روش جی چاہے اختیار کرلو۔

## ن ز ع

نَزَعَ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھیڑ کر، نکال کر، الگ کر دینا۔ ہٹا دینا۔ نیز کھینچنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس معنی میں اِنْتَزَعَ بھی آتا ہے۔ نیز اِنْتَزَعَ لازم بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی اکھیڑنا اور اکھڑ جانا دونوں ہی ہیں۔ نَزَعَ فِی الْقَوْسِ۔ کمان کو کھینچا۔ اِنْتَزَعَ الشَّيْئَ۔ وہ کسی چیز سے رکا اور باز رہا۔

سورۃ اعراف میں ہے يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (۷/۲۷)۔ ان سے ان کا لباس کھینچ لیا یا اتروا دیا۔ سورۃ معارج میں ہے۔ نَزَّاعَةً لِلشَّوٰى

(۷۹/۱) - زور سے کھینچنے والی - کھینچکر نکال لینے والی - وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹/۱) - کھینچنے والے - ابن درید نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے النّٰازِعٰتُ اور اَلنّٰاشِطٰتُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ تارے ہیں جو ایک مقام سے نکل کر دوسرے مقام کی طرف جاتے اور ایک جگہ ڈوب کر دوسرے مقام میں طلوع ہوتے ہیں* - مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ انقلابی جماعتیں ہیں جو ان صلاحیتوں اور قوتوں کو جو نیچے دب کر رہ گئی ہوں ، کھینچ کر اوپر لاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کو پھر سے صالح بنا دیتی ہیں - (المقام المحمود - صفحہ ۱۷)

نَزْعٌ - چھین لینا - بمقابلہ اِیْتَاءٌ (دینا) (۳/۲۵) - سورۃ الطور میں جنت کی زندگی کے ضمن میں فرمایا - یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا (۵۲/۲۳) - ''وہ اس میں ایک دوسرے سے پیالہ لینگے'' - اگر اس کے عام معنی لئے جائیں تو یہ نقشہ ہے ان دوستانہ صحبتوں کا جس میں پورے خلوص و محبت کے ساتھ بے تکلفی سے چھین جھپٹ ہوتی ہے اور لطف صحبت دوبالا ہوجاتا ہے (لیکن اس میں لغویت کا شائبہ تک نہیں ہوتا - جیسا کہ اس سے اگلی آیت سے ظاہر ہے) - علاوہ ازیں ، تَنَازُعٌ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ''لو- یہ پیالہ تم پیؤ'' - وہ جواب میں کہتا ہے ''نہیں - تم پیؤ''- یہ باہمی پیش کش اور اصرار و انکار ایسا حسین تنازع ہے جس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں - یہ ہے جنتی معاشرہ میں اربابِ ذوق و محبت کی مخلصانہ محفلوں کا رنگ -

اور اگر اس سے ذرا بلند ہوکر دیکھا جائے تو یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کے معنی یہ ہونگے کہ یہ (جماعتِ مؤمنین کے افراد) ایک دوسرے سے زندگی کی مئے حیات بخش کا پیالہ لینگے- جنتی زندگی ، انفرادی زندگی نہیں جس میں ہر ایک کو نفسا نفسی پڑی ہوتی ہے - وہاں تمام افراد ایک دوسرے سے وہ سامان لیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو برو مندی عطا کرتا ہے - لیکن اگر ہر شخص خود غرض بن جائے اور ہر ایک کی نیت یہ ہو کہ دوسرے سے سب کچھ چھین کر خود ہی رکھ لے ، تو یہ تَنَازُعٌ وہ ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے (۸/۴۶) - یعنی جنتی معاشرہ میں یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہوگا ، اور ایک دوسرے کی نشو و نما کی خاطر - لیکن غلط معاشرہ میں ہر فرد کی نیت یہ ہوگی کہ میں دوسرے سے سب کچھ چھین جھپٹ لوں - اس مفہوم کے اعتبار سے اَلنَّزَائِعُ ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو اپنی صحیح سمتوں

---

*تاج -

سے ہٹ کر چلتی ہیں*** - (اور ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں) - یہاں سے تنازعہ کے معنی واضح ہیں - اسلامی معاشرہ میں یہ ٹکراؤ نہیں ہوتا (۸/۴۶) - بلکہ باہمی ہم آہنگی اور اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (۳/۱۰۲) کی زندگی ہوتی ہے -

# ن ز غ

نَزْغٌ کے اصل معنی چبھونے، گھونپنے اور طعن کرنے کے ہیں، اور بقیہ تمام معانی اسی سے ماخوذ ہیں* - چنانچہ پھر اس کے معنی آتے ہیں کسی کام میں خرابی پیدا کرنے کے لئے اُس میں گھسنا** - نَزَغَ بَیْنَھُمْ نَزْغًا - ان کے درمیان فساد ڈال دیا - یا ایک کو دوسرے کے خلاف اُبھار دیا*** - ابن فارس نے یہی اسکے بنیادی معنی لکھے ہیں - سورۃ یوسف میں ہے مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ (۱۲/۱۰۰) - بعد اس کے کہ شیطان (حسد کے جذبہ) نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا - سورۃ اعراف میں ہے - وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ (۷/۲۰۰)۔ جب (انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ) کوئی ایسی بات دل میں ڈالے جس سے فساد کا اندیشہ ہو - یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے کا جذبہ . . . نیز (۴۱/۳۶)۔ اَلْمِنْزَغَۃُ - اس لوہے کی سلاخ کو کہتے ہیں جس سے روٹی پکانے والا روٹیوں میں چھید کرتا ہے*** - اور روٹی کو اس میں اٹکا کر تنور سے باہر نکالتا ہے -

# ن ز ف

نَزْفٌ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ختم ہو جانے اور منقطع ہو جانے کے ہیں - نَزَفَ مَآءَ الْبِئْرِ - اس نے کنویں کا تمام پانی کھینچ کرنکال لیا - نَزَفَتِ الْبِئْرُ - کنواں پانی سے خالی ہوگیا - اسی سے نُزِفَ فُلَانٌ کے معنی ہوتے ہیں فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی - وہ مست اور بے ہوش ہوگیا - اَنْزَفَ الرَّجُلُ - آدمی مست اور بے ہوش ہوگیا - اس کی عقل کا چشمہ خشک ہوگیا - اَلْمِنْزَفَۃُ - ڈھیکلی - وہ چھوٹا ساڈول جو ایک لمبی لکڑی کے سرے میں باندھا جاتا ہے، پھر اس لکڑی کو درمیان سے ایک دوسری زمین میں گڑی ہوئی لکڑی سے باندھا جاتا ہے اور اس سے پانی نکالا جاتا ہے**** -

قرآن کریم میں ہے - وَ لَا ھُمْ عَنْھَا یُنْزَفُوْنَ (۳۷/۴۷) - ''شرابِ جنت'' سے وہ بد مست نہیں ہونگے - سَکْرَانٌ نَزِیْفٌ - وہ بد مست آدمی جس کی عقل بدمستی کی وجہ سے جاتی رہی ہو** -

*محیط - **راغب - ***تاج - ****تاج و محیط -

واضح رہے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں وَلَا ھُمْ عَنْھَا یُنْزَفُوْنَ آیا ہے (۳۷/۴۷) جو مجہول ہے۔ اور سورۃ واقعہ میں وَلَا یُنْزِفُوْنَ (۵۶/۱۹) آیا ہے جو معروف ہے۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ جنت کی شراب کے پیالے (یا نہریں) کبھی خشک نہیں ہوں گی۔ یا اس شراب کے خواص (لذت و سرور) میں کمی واقع نہیں ہوگی۔

زندگی جوئے روان است و روان خواہد بود
این مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

# ن ز ل

نَزَلَ۔ بلندی سے نیچے کی طرف آنا۔ چنانچہ قرآن کریم میں نُزُوْلٌ۔ عُرُوْجٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳۴/۳)۔ نُزُلٌ۔ منزل کو کہتے ہیں۔ نیز جن چیزوں سے مہمان کی تواضع کی جائے۔ اس کے معنی برکت اور عطاء کے بھی آتے ہیں (۳/۱۹۷ و ۱۸/۱۰۲)۔ نیز۔ نُزْلٌ کھیتی کے بڑھنے، پھولنے پھلنے کو کہتے ہیں۔ اَرْضٌ نَزْلَۃٌ اُس زمین کو کہتے ہیں جس میں بڑی فراوانی سے کھیتی اُگے۔ اَلنَّزَلُ بارش کو کہتے ہیں۔ نَزْلَۃٌ۔ ایک مرتبہ کے نزول کے معنوں میں آتا ہے (۵۳/۱۳)۔ نَزِیْلٌ مہمان کو کہتے ہیں*۔ مَنْزِلٌ۔ اترنے کی جگہ۔ جمع مَنَازِلُ (۳۶/۳۹)۔

اُنْزِلَ اور نُزِّلَ میں عام طور پر فرق یہ ہے کہ تَنْزِیْلٌ (نَزَّلَ) آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں، اور اِنْزَالٌ میں یہ شرط نہیں (لطائف اللغۃ)۔ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (۲۶/۹۳)۔ بادلوں سے پانی ایک دم نیچے نہیں گر پڑتا، آہستہ آہستہ بارش کی شکل میں برستا ہے۔ تَنْزِیْلٌ (۲۶/۱۹۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلتَّنْزِیْلُ کے معنی کسی چیز کو ترتیب سے رکھنے اور اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں۔

لیکن قرآن کریم میں اس کے معنی ''اوپر سے نیچے اتارنے'' ہی کے نہیں۔ اس کے معنی عطا کرنے کے بھی ہیں۔ (وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷/۲۵)۔ ہم نے لوہا عطا کیا۔ نیز مختلف چیزوں کے برآمد ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ حجر میں ہے کہ ہمارے پاس مختلف چیزوں کے خزانوں کے خزانے رکھے ہیں۔ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱)۔ لیکن ہم انہیں ایک مناسب اندازے کے مطابق برآمد کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں کائنات میں موجود نہیں ان کے نازل کرنے کے معنی یہ ہونگے

*تاج۔

کہ انسان اپنی تحقیقات اور سعی و کاوش کے ذریعے انہیں حاصل کرتا جائے ۔ لہذا ان مقامات میں اِنْزَال کے معنی ان اسباب کا بہم پہنچانا ہے جن سے انسان ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے ۔ ان چیزوں کے ذخیرے کائنات میں موجود ہیں ۔ ان کا حصول ، انسان کی محنت پر منحصر ہے ۔

قرآن کریم کے لئے تَنْزِیْل (نازل کرنے) کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ وحی ، رسول کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ (Subjective) چیز نہیں ہوتی ۔ بلکہ یہ اسے خارج سے (Objectively) ملتی ہے۔ وحی ایک خارجی حقیقت ہے ، انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ۔ اس لئے وحی کسب و ہنر سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ یہ صرف منزل من اللہ ( خدا کی طرف سے عطا کردہ ) ہوتی ہے ۔ مادی کائنات میں انسان اپنی سعی و کاوش سے چیزوں کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے ۔ اسے (Discovery) کہتے ہیں ۔ لیکن وحی میں حقیقت خود اپنے آپ کو نبی پر منکشف (Reveal) کرتی ہے ۔ اس لئے اس کے لئے اِنْزَال کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی انسان خود بلند ہوتا ہوا حقیقت کے چہرے سے پردہ کشائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود نیچے اتر کر اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے ۔ یہ چیز وحی کے ساتھ مختص ہوتی ہے ۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ رسول اللہؐ کی ذات پر ختم ہوگیا ، اس لئے اب انسانوں کے پاس عِلم کے دو ہی ذریعے رہ گئے ۔ ایک قرآن کریم کے اندر محفوظ حقائق اور دوسرے خارجی کائنات میں انسانی علم و عقل کی رو سے منکشف کردہ حقائق ۔ ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعۂ علم انسان کے پاس نہیں ۔ باطنی کشف کا دعویٰ در حقیقت وحی ہی کا دعویٰ ہے ، فرق صرف الفاظ کا ہے۔ قرآن کریم میں ”کشف و الہام“ کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس لئے اس قسم کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ انسان میں بعض قوتیں ایسی ہیں (مثلاً قوتِ خیالی یا قوت ارادی) کہ اگر خاص مشقوں کے ذریعے ان کی نشو و نما (Development) کرلی جائے تو ان میں ایسی خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں ۔ ایسے لوگ کشف و کرامات سمجھنے لگتے اور ”روحانی قوت“ کا مظاہرہ قرار دیتے ہیں ۔ حالانکہ ”روحانیت“ سے اس کا کچھ تعلق نہیں ۔ نہ ہی دین سے کوئی واسطہ ۔ اسلئے کہ جو انسان بھی چاہے وہ ان مشقوں کے ذریعے ایسی قوت حاصل کرسکتا ہے ، خواہ وہ مشرک ، کافر اور دہریہ بھی کیوں نہ ہو ۔ دین کا مقصود اس قسم کی قوتیں پیدا کرنا نہیں ، آدمی کو انسان بنانا ہے ۔

مُنَزِّل ۔ اوپر سے نیچے اتارنے والا ۔ نازل کرنے والا ۔ عطا کرنے والا (۵/۱۱۵) ۔ نیز مُنْزِل (۲۹/۲۴)۔ مُنَزَّل ۔ اتارا ہوا (۶/۱۱۵)۔ نیز مُنْزَل

اتارا ہوا (۳/۱۲۴) ۔ یہ ، ظرف مکان (جگہ) یا زمان (وقت) ۔ اور مصدر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ رَبِّ أَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (۲۳/۲۹) ۔ ''اے میرے رب مجھے برکت والا اتارنا اتارئیو'' ۔ سورۃ یوسف میں مُنْزِلٌ بمعنی مہمان نواز آیا ہے ۔ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ (۱۲/۵۹) ۔ ''اور میں بہت اچھا مہمان نواز ہوں'' ۔

تَنَزُّلٌ ۔ آہستہ آہستہ اترنا ۔ اسی سے تَنَزَّلُ (۹۷/۴) میں ہے ۔

## ن س أ

نَسْأٌ ۔ جھڑک دینا ۔ ہانکنا ۔ پیچھے ہٹا دینا ۔ نَسَأَ الشَّيْئَ ۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا ۔ مؤخر کر دینا ۔ اَنْسَأَهٗ ۔ اُسے حوض سے ہٹا دیا ۔ پیچھے کر دیا ۔ نَسَأْتُهُ الْبَيْعَ ۔ میں نے بیع میں اس سے ادھار کا معاملہ کیا اور اسطرح رقم کے لین دین کو مؤخر کر دیا ۔ اَلنَّسِيْئَةُ ۔ تاخیر ۔ پیچھے کرنا * ۔ اسی جہت سے ادھار کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ اس میں قیمت کی ادائیگی موخر کر دی جاتی ہے ۔ بَاعَهٗ بِنَسِيْئَةٍ ۔ اس کے ساتھ ادھار کا سودا کیا ۔ (یہ اس قسم کے سودے کو کہتے ہیں جس میں قیمت یا چیز بعد میں دی جائے) ۔ اَلْمِنْسَاَةُ ۔ لاٹھی ، جس سے جانوروں کو پیچھے ہٹایا جاتا ہے (۳۴/۱۴) ۔ ابن فارس نے بھی یہ تمام معانی دئے ہیں ۔

سورۂ توبہ میں ہے اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ (۹/۳۷) ۔ ''یقیناً نسئی کفر میں ایک اضافہ ہے'' ۔ اَلنَّسِيْٓءُ ۔ عربی معاشرہ کی ایک خاص چیز تھی ۔ ویسے تو قرآن کریم نے یہ کہکر اسکی تشریح کر دی ہے کہ يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا (۹/۳۷) ۔ ''ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں ۔ ایک سال اُسے حرام کر دیتے ہیں'' ۔ لیکن اس کی تفصیل کا سمجھنا ضروری ہے ۔ عربوں میں قمری مہینے رائج تھے ۔ رَبِيْعٌ ۔ جُمَادَى ۔ رَمَضَانُ ۔ وغیرہ مہینوں کے نام ہی بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق موسموں سے تھا ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر سال وہی مہینہ اُسی موسم میں صرف اُسی صورت میں آسکتا ہے جب سال شمسی ہو ۔ قمری ہونے کی صورت میں ایک ہی مہینہ مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے ۔ عرب اسے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ (دیگر مہینوں کے علاوہ) حج کی تقریب ایک ہی موسم میں ہو ۔ اس کے لئے (یہودیوں کے اتباع میں) کرتے یہ تھے کہ ہر تیسرے سال ایک مہینہ خالی چھوڑ دیتے تھے [زیادہ صحیح الفاظ میں آٹھ سال میں تین مہینے ۔

*تاج ۔

کیونکہ قمری سال شمسی سال سے قریب گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے] اور اسطرح اپنے مہینوں کو پھر موسموں کے مطابق کر لیتے تھے ۔ یہ مہینہ (جسے خالی چھوڑتے تھے) بالعموم ذوالحجہ کے بعد ہوتا تھا ۔ اس ''آگے پیچھے کرنے'' کے عمل کو وہ نَسِیْیٌ کہتے تھے ۔ یعنی سال کو ایک مہینہ پیچھے ہٹا لینا ۔

نیز ان کے ہاں سال میں چار مہینے (رجب ۔ ذی قعدہ ۔ ذوالحجہ اور محرم) واجب الاحترام مہینے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و قتال منع تھا ۔ کیلنڈر کا یہ اہتمام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں نَسَأَۃٌ کہتے تھے ۔ یہ نَسَأَۃٌ کبھی تو ان محترم مہینوں میں تغیر و تبدل کردیتے ۔ مثلاً حج کے بعد محرم کے متعلق کہدیتے کہ اس سال اسکی بجائے ربیع الاول کا مہینہ محترم ہوگا ۔ وقس علی ھذا ۔ اور کبھی اس تیسرے سال کے خالی مہینے کو آگے پیچھے کر دیتے ۔ اس سے معاشرہ کے نظام میں گڑ بڑ ہو جاتی اور جن لوگوں کو یہ پہلے بتا دیتے کہ اس سال یوں کیا جائیگا وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا لیتے ۔ اس کو بھی نَسِیْءٌ کہتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کی نَسِیْءٌ کو ختم کر دیا ۔ ایک طرف اس نے اعلان کر دیا کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (۹/۳۶) ۔ '' قوانین خداوندی کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے '' ۔ اس لئے ہر تیسرے سال ایک مہینے کا خالی چھوڑ دینا بے معنی بات ہے ۔ چنانچہ اس اعلان (۱۰ ھ) کے بعد عربی کیلنڈر میں سال کے بارہ مہینے قرار پا گئے ۔ اور مہینے قمری رہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ قمری سال کے مہینوں کے نام تو وہی ہیں، لیکن وہ اب التزاماً اُن موسموں میں نہیں آتے جن کی نسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے ۔ (مثلاً رَمَضَانٌ ۔ رَمْضٌ سے ہے جسکے معنی شدت کی گرمی ہیں ۔ لیکن اب رمضان گرمی میں بھی آتا ہے اور سردی میں بھی) ۔

اگر یہ کیلنڈر قمری کی جگہ شمسی ہو تو پھر ہر مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں آتا رہے ۔ اور سال کے بارہ مہینے بھی پورے ہو جاتے ہیں ۔ یعنی جس مدت میں زمین سورج کے گرد اپنا ایک دور ختم کرتی ہے اسکے بارہ حصے ہو جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے شمسی اور قمری دونوں میں سے جونسا کیلنڈر جی چاہے اختیار کر لیا جاسکتا ہے ۔ (دیکھئے ۶/۹۷ ; ۱۰/۵ ; ۱۷/۱۲) ۔

اس نَسِیْءٌ کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے، قرآن کریم نے اس نَسِیْءٌ کو بھی ختم کر دیا جس کی رو سے وہ قابل احترام مہینوں میں تقدم و تاخر کر دیا کرتے تھے ۔ اسے قرآن کریم نے زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ (۹/۳۷) قرار دیدیا ۔ اسطرح معاشرہ محکم بنیادوں پر استوار ہو گیا ۔

قرآن کریم کا یہ اصولی قانون اب بھی موجود ہے کہ اگر کہیں جنگ چھڑ جائے تو وہ مسلسل نہ چلتی رہے بلکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ فلاں فلاں وقت کے لئے جنگ کو روک دینا ہوگا۔ اس التواء اور قطع تسلسل کے بڑے فائدے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں ہوسکتا ہے کہ اس سے وہ جنگ ختم ہی ہو جائے۔ اس التواء کے عرصہ کا احترام تمام اقوام کے لئے ضروری ہوگا اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ التواء کے وقت کو مقدم یا موخر کر سکے۔ اس لئے کہ یہ نَسِیْئی ہوگی جسے قرآن کریم نے کفر، یعنی معاهدات کے عملی انکار، سے تعبیر کیا ہے۔

# ن س ب

اَلنَّسَبُ۔ اَلنِّسْبَةُ۔ قرابتداری جو خصوصیت کے ساتھ آباو اجداد میں ہو۔ باپ یا ماں کی طرف سے قرابتداری۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں۔ پھر، دو ایسی چیزوں کے لئے جو کسی اعتبار سے بھی باہم مشابہت اور تعلق رکھتی ہوں ان کے اس تعلق کے اظہار کے لئے بھی النِّسْبَةُ بولدیتے ہیں۔ اَلنَّيْسَبُ۔ چیونٹیاں، جبکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی ہوں۔ چیونٹیوں کا راستہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے اتصال ہیں۔ نَسَبٌ۔ خاندانی اتصال کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں نَسَبًا۔ بمعنی قرابتداری (۲۵/۵۴) میں آیا ہے۔ اور (اسکی جمع) اَنْسَابٌ (۲۳/۱۰۱) میں۔

# ن س خ

نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اسکی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اسکے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اسکی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّيْحُ آثَارَ الدِّيَارِ۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔ (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگر گوں کر دیا)۔ نَسَخَ الْكِتَابَ۔ ایک کتاب کو نقل کرکے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے اَلنُّسْخَةُ۔ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ (۴۵/۲۹)

*تاج و راغب۔ **تاج۔ محیط و راغب۔

'' ہم لکھوا لیتے تھے'' ۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۲/۵۲) میں آیا ہے ۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ ۔ '' اللہ مٹا دیتا ہے'' ۔

لہذا نَسْخٌ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا ۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آرہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم ۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اسکی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے ۔ اور اسکا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے ۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض '' ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں ۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دئے ہیں ۔ اسکے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے ۔ (مثلاً آیۂ رجم ۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت) ۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ :-

(۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے ۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن انکا حکم موجود ہے ۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے ۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے ۔ اور وہ آیت یہ ہے ۔

> مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۔ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲/۱۰۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے —

> ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے ۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے ۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا ۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا ۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے ۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اُسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی ۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے ۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا ۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی ۔ حتکہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک اِن کی تعداد صرف پانچ ہے ۔

باقی رہا ”فراموش کرا دینے“ کا سوال ۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے ۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں ۔ یہ مراد ہے اَوْ نُنْسِهَا سے ۔ اسکی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے ۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ ..... (۸۷/۶-۷) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ ہم تجھے پڑھائینگے سو تو نہ بھولیگا ، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے ۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا ، قرآن کریم اور رسول اللہ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اُس حکم کو منسوخ کرکے اُسکی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے ۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے ۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اسکی ناسخ ۔

اور رسول اللہ کے متعلق یہ تصور کہ حضور خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے ۔ یاللعجب !

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا ۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن ۔ س ۔ ی دیکھئے جہاں اسکی تشریح کر دی گئی ہے ۔

اب دیکھئے اس آیت (مَانَنْسَخْ ........) کا صحیح مفہوم ۔ پیچھے سے سلسلہ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دئے تھے ، اور وہ احکام تورات وغیرہ میں موجود ہیں ۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی ؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے ۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلہ رشد و ہدایت حضرت نوح کے زمانے سے مسلسل چلا آرہا ہے ۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے ۔ اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے ۔ بعد میں ، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آجاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا ۔ اسطرح یہ جدید وحی اُس سابقہ وحی کی قائمقام (ناسخ) بن جاتی ۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آرہا ہے ۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ تورات کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ نے آکر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اسکی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے ۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دئے جاتے تھے ۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے ۔ تاآنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی ۔ تو وہ "روکے ہوئے" احکام و قوانین اُس وقت نازل کر دئے جاتے ۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کار فرما رہا ہے ۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد ، اُسکی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی ۔ بعض کو فراموش کر دیتی ۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر

و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی ) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا ۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اسطرح چلا آرہا ہے ۔ اب وہ دور آگیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کرلیگا ۔ لہذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کرکے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دئے جائیں ۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہورہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہونگے ۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے ۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے ، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے ، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا ۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا ۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کردی گئی ہے ۔ (ان کی مثل احکام دیدئے گئے ہیں) ۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے ۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے ۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں ۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّ إِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ( ۲/۱۳۷ ) ۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پاسکیں گے ۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے ۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا کا ۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں ۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں ۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا ۔ آیَتٌ کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں ۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیَاتُ اللّٰہِ کہا ہے ۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا ۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) ۔ جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کریگا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا ۔ اور اس سے آگے ہے ۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا . . . (۲/۳۹) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرینگے اور ان سے انکار کریں گے . . . یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اُسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ لہذا مَا نَنْسَخْ مِنْ آیَۃٍ میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے ۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے ۔ وَ اِذَا بَدَّلْنَا آیَۃً مَّکَانَ آیَۃٍ ۔ (۱۶/۱۰۱)۔ "اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں" ۔

اس کے بعد لفظ نُنْسِهَا ہے ۔ یہ لفظ نَسِیَ سے ہے ۔ نَسِیَ کے معنے کسی چیز کو ترک کر دینا ، یا فراموش کر دینا ، آتے ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ س ۔ ی) ۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتبِ آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا ۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (۲۲/۵۲) ۔ یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کردیتے تھے ۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کردیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت ۔

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں ۔ اس اعتبار سے آیت نُنْسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے ، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُهَيْمِنٌ ہے (۵/۴۸) ۔ یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہوگئے ہیں ۔ اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے ، ان سب کی تکمیل ہوگئی ہے ۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا (۶/۱۱۶) ۔ اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)۔ نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں رد و بدل کر سکے گا ۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۵/۹) ۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا ۔ تو اس کا جواب یہ کہہکر دیدیا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲/۱۰۶) ۔ خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں ۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دیدیا جائے ۔ یہ سب کچھ اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اُسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے ۔

یہ ہے ناسخ ومنسوخ کا صحیح مفہوم ۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں ۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے ۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے ۔ جب حالات بدل جائیں تو اسکی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے ۔ مثلاً صلٰوۃ کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے ۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (۵/۶) ۔ ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا ) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائیگا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا ۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہونگے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس ، محتاج ، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہونگے ۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہونگے ۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہونگے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں ۔

یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں ۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا ، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہوسکے ۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں ۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (۲/۱۰۶) ۔ یا سورة النحل کی آیت اِذَا بَدَّلْنَا آیَةً مَّکَانَ آیَةٍ (۱۶/۱۰۱) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آجانا ۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کسطرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں ۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں ، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر ، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو ۔ اس غیر متبدل صحیفہ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا ۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید ۔

## ن س ر

اَلنَّسْرُ ۔ گدھ کو کہتے ہیں ۔ لیکن عربوں میں مختلف قسم کے گدھوں کے لئے الگ الگ نام ہیں ۔ اس گدھ کی صفت میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ یہ بڑی تیز نظر رکھتا اور بلند پرواز ہوتا ہے ۔ نیز نَسْرٌ قبیلہ ذی الکلاع کا ایک بت تھا جو سرزمین حمیر میں تھا * ۔ قرآن کریم میں اس بت کا نام قوم حضرت نوح ؑ کے ذکر میں آیا ہے (۷۱/۲۳) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اچک لینے اور چھین لینے کے ہیں ۔ اور اَلنَّسْرُ ۔ چند ستاروں کے جھمکے کو نیز گدھ کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں بہرحال یہ لفظ قوم حضرت نوح ؑ کے بت کے لئے آیا ہے ۔

## ن س ف

نَسَفَ الْبِنَاءَ یَنْسِفُہٗ ۔ اس نے عمارت کو جڑ سے اکھیڑ دیا ۔ اَلْمِنْسَفَةُ ۔ وہ اوزار جس سے عمارت کو اکھاڑا جاتا ہے ۔ نَسَفَ الطَّعَامَ ۔

---

* تاج ۔

اس نے غلے کو پھٹکا ۔ اَلْمِنْسَفُ ۔ چھاج ۔ نَسَفَتِ الرِّیْحُ الشَّیْءَ ۔ ھوا نے اس چیز کو اڑا دیا ۔ اکھیڑ کر منتشر کر دیا ۔ نَسَفَ الْبَعِیْرُ الْاَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِہٖ ۔ اونٹ نے اپنے پاؤں کے اگلے سرے سے مٹی کو پھینکا اور اڑایا*** ۔ اَلنُّسَافَۃُ ۔ پھٹکنے سے جو کچھ اُڑے ۔ اَلْمِنْسَفَۃُ ۔ چھلنی کو بھی کہتے ھیں ۔ اور نَسَفَ الشَّیْءَ کسی چیز کے چھاننے کو* ۔ اَلنَّسِیْفُ ۔ وہ نشان جو ایڑھ لگانے سے اونٹ کے پہلو پر (بال اڑنے سے) پیدا ھو جاتا ھے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کشف یعنی کھولنا اور ظاھر کرنا لکھے ھیں ۔

سورہ طٰہٰ میں ھے ۔ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا (۲۰/۹۷) ۔ ھم اسے دریا میں بہا دینگے ۔ اسکے اجزا منتشر کرکے دریا برد کردینگے ۔ ذرا آگے چل کر ھے ۔ یَنْسِفُھَا رَبِّیْ نَسْفًا (۲۰/۱۰۵) ۔ تیرا رب انھیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھدیگا ۔

# ن س ک

نَسَکَ الثَّوْبَ ۔ اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کر لیا ۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اس مادہ کے اصلی معنی دھونے اور صاف کرنے کے ھیں ۔ باقی تمام معانی اسی اصول پر متفرع ھیں** ۔ اَرْضٌ نَاسِکَۃٌ ۔ سرسبز و شاداب زمین جس پر نئی نئی بارش ھوئی ھو* ۔

اس بنیادی معنی کی رو سے اس سے مراد کسی معاملہ کو درست اور ٹھیک کر لینا ھوتا ھے ۔ نَسَکَ السَّبْخَۃَ کے معنے ھیں اس نے زمین شور کو درست کیا ۔ نَسَکَ اِلٰی طَرِیْقَۃٍ جَمِیْلَۃٍ ۔ اس نے اچھا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر اس پر مداومت کی* ۔

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں مَنْسَکٌ ھر اس مقام کو کہتے ھیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ عادی ھو چکے ھوں ۔ خواہ یہ خیر میں ھو یا شر میں ۔ اس کے بعد امور و مراسم حج کو مَنَاسِکُ کہنے لگے ۔ اور نُسُکٌ یا نَسِیْکَۃٌ ۔ ذبیحہ کو یا خون کو* ۔

اسکے بعد یہ لفظ ھر اس بات کے لئے بولا جانے لگا جو خدا کی طرف سے واجب ھوئی ھو ۔ لہذا مَنَاسِکُ کے معنی واجبات خداوندی کے طور طریقے ھو گئے** ۔ ابن قتیبہ نے کہا ھے کہ اس کے معنی ھر اس چیز کے ھیں جس

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے*۔ قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں آیا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ (۲/۲۰۰)۔ جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو۔ اس سے ذرا پہلے ہے فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (۲/۱۹۶)۔ اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہونگے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں نُسُکٌ سے مراد ذبیحے ہونگے*۔ ابن فارس نے بھی اس کے معنی تقرب حاصل کرنے اور ذبیحہ کے لکھے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لئے جائیں۔ اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔

سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۶/۱۶۳)۔ ان سے کہدو کہ میری صلٰوۃ اور میرے نُسُکٌ۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب خدا کے عالم گیر نظام ربوبیت کے لئے وقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلٰوۃ سے مراد جملہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے اور نُسُکٌ سے مراد زندگی کا ہر طور طریقہ **۔

سورہ حج میں ایک جامع آیت ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (۲۲/۶۷)۔ ”ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ سو یہ لوگ تم سے امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں۔ تو انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتا رہ“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تو اصل قانون ہے جو ہمیشہ غیر مبدل رہا ہے۔ اور مَنَاسِکٌ اس کی وہ جزئیات و فروعات (طور طریقے) ہیں جو زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق اس امر کو نافذ کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ مَنَاسِکٌ تو مختلف رہے ہیں، لیکن امر متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر اس امر کی طرف تھی جسے اہل مذاہب نے چھوڑ کر صرف مَنَاسِکٌ کو دین بنا لیا تھا۔ اصل دین کی یہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُسْتَقِيْمٍ (۲۲/۶۷)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس اصل کو تسلیم کر لے تو پھر اُسے اس نظام (دین) کی جزئیات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ کیونکہ جب دین، اجتماعی نظام کا نام ٹھہرا تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد اس اجتماعی نظام کا رکن ہو لیکن اس

---

* ابن قتیبہ (القرطین - ج/۱ صفحہ ۱۲۵)۔ ** شاہ عبدالقادر - شاہ رفیع الدین اور مولانا ابولکلام آزاد نے اپنے تراجم میں مناسک کا ترجمہ عبادت کے طور طریقے یا ارکان حج کیا ہے۔ مؤخرالذکر نے نسکی کا ترجمہ ”میرا حج“ کیا ہے۔

کی جزئیات میں اختلاف کرے۔ اس سے نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ باین ہمہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہو سکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کئے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کیطرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔

# ن س ل

اَلنَّسْلُ ۔ کسی چیز کا الگ ہوجانا ۔ جدا ہو جانا ۔ نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِيْرِ ۔ اونٹ سے بال جھڑ کر الگ ہوگئے۔ نَسَلَ الْقَمِيْصُ عَنِ الْاِنْسَانِ ۔ قمیص انسان سے الگ ہو گئی*۔ اَلنُّسَالَةُ ۔ وہ اون جو گر پڑے ۔ یا پرندے کا پر جو جھڑ جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا آسانی سے نکل جانا اور نکالنا۔

نَسَلَ ۔ يَنْسِلُ ۔ تیز رفتار ہوا ۔ دوڑا ۔ اَنْسَلَ الْقَوْمَ وہ قوم سے آگے بڑھ گیا ۔ ذِئْبٌ نَسُوْلٌ ۔ تیز دوڑنے والا بھیڑیا*** ۔ اَلنَّسَلَانُ ۔ تیز رفتار ۔ اَلنَّسَلُ ۔ وہ دودھ جو تھن کے سوراخ سے خود بخود ٹپکنے لگ جائے**۔

اولاد کو نَسْلٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے نکلتی ہے ۔ یا اس لئے کہ آباء و اجداد چلے جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھ جاتی ہے ۔

قرآن کریم میں يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ( $\frac{۲}{۲۰۵}$ ) آیا ہے ۔ یہاں نَسْلٌ کے معنی ذریت ۔ مخلوق ۔ اولاد ۔ انسانی آبادی ہیں ۔ یعنی نسلِ انسانی۔ لہذا ، قرآن کریم کی رو سے کھیتی اور نسلِ انسانی کا (بغیر حق کے) تباہ کرنا سنگین جرم ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَ هُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ ( $\frac{۲۱}{۹۶}$ )۔ وہ ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑینگے ۔ طوفان کی طرح موجیں مارتے ہوئے اُمنڈ پڑینگے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے ۔ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ( $\frac{۳۶}{۵۱}$ ) ۔ اپنے رب کی طرف تیزی سے نکل دوڑینگے ۔

# ن س و

اَلنِّسْوَةُ ۔ اَلنِّسَاءُ ۔ اَلنِّسْوَانُ ۔ یہ سب الفاظ اَلْمَرْاَةُ کی غیرلفظی جمع ہیں۔ یعنی اَلْمَرْاَةُ کے معنی ہیں ایک عورت اور اَلنِّسَاءُ

*راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

(وغیرہ) کے معنی ھیں بہت سی عورتیں ۔ اَلْمَرْاَۃُ کی جمع ۔ اور اَلنِّسَاءُ وَ النِّسْوَۃُ و النِّسْوَانُ کا واحد ان کے مادوں سے نہیں آتا* ۔

قرآن کریم میں نِسَاءٌ کا لفظ اضافت کے ساتھ عام عورتوں کے علاوہ بیویوں کے لئے بھی آیا ھے مثلاً الٰی نِسَائِکُمْ (۲/۱۸۷)۔ ''تمہاری بیویاں''۔

مجازی معنوں میں یہ لفظ قوم کے اس طبقے کے لئے استعمال ھوا ھے جو جوھر مردانگی سے عاری ھو ۔ (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) اور (ب ۔ ن ۔ و) ۔

# ن س ی

نِسْیَانٌ کے اصلی معنی ترک کردینے اور چھوڑ دینے کے ھیں ۔ راغب نے کہا ھے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ھوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے بھی نِسْیَانٌ کہتے ھیں ۔ یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا ۔ چنانچہ وَ لَقَدْ عَہِدْنَا اِلٰیٓ اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا ۔ (۲۰/۱۱۵) ۔ ''اور یقیناً ھم نے پہلے آدم کو حکم دیا تھا لیکن اس نے اسے ترک کردیا ۔ اور ھم نے اس میں عزم نہ پایا'' ۔ اس میں نَسِیَ کے معنی ترک کر دینے کے ھیں، کیونکہ بھول جانے پر مواخذہ نہیں ھوسکتا (نیز یاد رکھنے کے لئے عزم کی ضرورت نہیں ھوتی) ۔ اسی طرح نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ (۹/٦۷) کے معنی ھیں انہوں نے قوانین خداوندی کو چھوڑ دیا تو خدا نے ان کی حفاظت کو چھوڑ دیا** ۔ ھمارے ھاں بھی یہ کہتے ھیں کہ میں نے تمہیں کتنی باتوں کی تاکید کی لیکن تم نے ان سب کو بھلا دیا ۔ یہاں بھلا دیا، سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمہارے حافظہ سے محو ھو گئیں ۔ اس سے مراد یہ ھے کہ تم نے ان پر عمل نہیں کیا ۔ یا کچھ عرصہ تک عمل کرکے انہیں چھوڑ دیا ۔ نیز اس کے معنے کسی چیز کو علیٰ حالہ رھنے دینے کے بھی ھیں۔ اس کی تائید میں صاحب غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) نے حضرت ابن عباس رض کا ایک قول بھی نقل کیا ھے ۔

سورۃ بقرہ میں سابقہ انبیاء کرام ؑ کے سلسلہ وحی کے متعلق ھے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا (۲/۱۰٦) ۔ ھم جس سابقہ حکم کو منسوخ کرتے ھیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حکم دیدیتے ھیں اور جسے علیٰ حالہ چھوڑ دیتے ھیں تو اس جیسا حکم

*تاج ۔ **ابن قتیبہ القرطبی ج/۱ صفحہ ۱۹۸

دوسرے نبی کی وحی میں دے دیتے ہیں ۔ (تفصیل ن ۔ س ۔ خ کے عنوان میں دیکھئے) اسی طرح سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ (۸۷/۶) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس وحی کو اس طرح محفوظ رکھیں گے کہ تو اس میں سے کسی بات کو بھی چھوڑ نہیں سکے گا ۔ اس میں سے کچھ بھی چھوٹنے نہیں پائے گا ۔ سب ایک جگہ جمع ہو جائے گا ۔ اس کی حفاظت کی شہادت دوسری جگہ موجود ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (۱۷/۸۶) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تجھے بذریعہ وحی دیا گیا ہے اس میں سے کچھ لے جائیں (لیکن ہماری مشیت ایسی نہیں) ۔ اسی سے (۸۷/۶) ۔ کے بعد اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس میں سے اُسی صورت میں کچھ ترک ہوسکتا تھا کہ خدا کی مشیت ایسی ہوتی ۔ لیکن خدا کی مشیت یہ تھی ہی نہیں (۱۷/۸۶) ۔ اس لئے اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں ہوا *۔

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ اس کی نفی کر دیتا ہے ۔ کیونکہ ''استثناء بالمشیت'' اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے ۔ (یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَاشَآءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو جس سے مراد خدا کی مشیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا) ۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ۔ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱/۱۰۸) ۔ یعنی غیر مقطوع ۔ اور استثناء میں نکتہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ہیں خدا کی مشیت سے ایسے ہیں ۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں ہیں ۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا ۔ (المنار جلد اول صفحہ ۱۹ - ۴۱۶ - زیر نَنْسَخْ وَ نُنْسِهَا) ۔

کسی چیز کی حفاظت کو ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا ۔ اسے حقیر و غیر اہم سمجھا گیا ۔ اس لئے اَلنِّسْيُ کے معنی ہیں ایسی چیز جس سے بے اعتنائی برتی جائے ۔ اس کی جمع اَنْسَاءٌ ہے ۔ چنانچہ جب عربوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ کہا کرتے تھے تَتَبَّعُوْا اَنْسَاءَكُمْ ۔ اپنی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو جنہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ، تلاش کرلو* ۔

*تاج ۔

اس عدم اهمیت کی بناء پر اس کے معنے بھول جانے کے ہوگئے۔ اَنْسَاہُ اِیَّاہُ اس نے اس کو بھلا دیا ۔ نَسَّاءٌ ۔ بہت بھول جانے والا* ۔ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ( ۱۹/۲۳ ) ۔ بھولی بسری ۔

ترک کر دینے کے معنوں میں قرآن کریم کی آیات اوپر درج کی جا چکی ہیں ۔ ان کے علاوہ ( ۲۰/۱۲۶ اور ۲۳/۱۲ ) میں بھی یہی مفہوم ہے ۔ یعنی ناقابل التفات سمجھ کر چھوڑ دینا ۔ ذِکریٰ کے مقابلہ میں اِنْسَاءٌ ( ۶/۶۸ ) میں آیا ہے ۔ یعنی بھلا دینا ۔ بلا ارادہ بھول جانا خطا نہیں ہوتی ( ۲/۲۸۶ ) ۔

## ن ش أ

نَشَأَ يَنْشَأُ ۔ نَشْأَةً ۔ زندہ ہونا ، نیا ہونا ، رُو نُما ہونا ، بلند ہونا ، بڑھنا ، بتدریج ترقی کرنا ، نشو و نما پانا ۔ نَشَأَتِ السَّحَابَةُ نَشْأً ۔ بادل اُٹھا ۔ اَلنَّاشِیُ ۔ لڑکی یا لڑکا جو بچپن کی حد سے گزر کر جوانی میں قدم رکھ رہا ہو ، یا رکھنے کے قریب ہو ۔ اَلنَّاشِئَۃُ ۔ ہر وہ ساعت جس میں آدمی رات کے وقت کھڑا رہے ۔ یعنی سوئے نہیں ۔ سونے کے بعد اٹھنے کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز ہر واقعہ جو رات کے وقت سرزد یا رو نما ہو ۔ تَنَشَّأَ فُلاَنٌ لِحَاجَتِهٖ ، فلاں آدمی اپنے کام کے لئے اٹھا اور چل پڑا ۔ اَلْمُنْشَأُ ۔ بلند نشان یا جھنڈا ۔ اَلْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ ( ۵۵/۲۴ ) ۔ بلند بادبانوں والی کشتیاں ۔ اَلْاِنْشَاءُ ۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اس کی تربیت کرنا** ۔ اَلنَّشْءُ ۔ نسل*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں ۔

سورۃ انعام میں ہے ۔ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ( ۶/۹۹ ) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ''نفس واحد'' سے پیدا کیا ۔ یا آگے بڑھایا ۔ (اس کی تفصیل میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملے گی) ۔ سورۃ واقعہ میں ہے اِنَّا اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۔ ( ۵۶/۳۵ ) ۔ ہم نے انہیں ایک خاص انداز سے نئی پیدائش دی ۔ یا ہم نے ان کی خاص تربیت کی ۔ نہایت عمدگی سے پروان چڑھایا ۔ اس سے ذرا آگے ہے وَ نُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ( ۵۶/۶۱ ) ۔ تمہیں اس انداز سے ایک نئی پیدائش دیں جو تمہارے علم میں بھی نہیں ۔ ضمناً مَا لَا تَعْلَمُوْنَ سے ظاہر ہے کہ جہاں تک اس زندگی میں انسانی علم کی سطح کا تعلق ہے اس کی رو سے ہم جان نہیں سکتے کہ دوسری زندگی کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوگی ۔ اسی کو دیگر مقامات میں خلق جدید ، ایک نئی تخلیق سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ ( ۱۴/۱۹ و ۱۷/۹۸ و ۳۲/۱۰ ) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

سورۃ واقعہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (۵۶/۷۲)۔ کیا تم اس کے درخت کو اگاتے اور نشو و نما دیتے ہو، یا ہم دیتے ہیں۔

سورۃ زخرف میں ہے مَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ (۴۳/۱۸) جس کی پرورش و تربیت زیورات میں ہوئی ہو۔ یا جس کی تربیت عورتوں کی طرح ہوئی ہو۔ سورۃ رعد میں ہے۔ وَ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲)۔ وہی بھاری بھاری بادلوں کو (سمندر کی سطح سے فضا میں) بلند کرتا ہے۔ سورۃ رحمٰن میں جَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵/۲۴) آیا ہے۔ یعنی بلند بادبانوں والی کشتیاں۔ سورۃ مزمل میں نَاشِئَةَ الَّيْلِ آیا ہے (۷۳/۶)۔ یعنی رات کا اٹھنا۔ اِنْشَاءٌ نشو و نما دینا۔ بتدریج آگے بڑھانا۔ اور پروان چڑھانا خدا کی صفت ربوبیت کا نتیجہ ہے۔ کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے مطابق، اُس کے قانون کی رُو سے نشو و نما پاتی اور بتدریج اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی کچھ انسان کو اپنی دنیا میں کرنا ہوگا۔ یعنی اپنی اور اپنے ساتھ ہر فرد انسانی کی نشو و نما۔ اس کی صلاحیتوں کی برومندی اور انہیں تکمیل تک پہنچانا۔ یہی اسلام کا مقصود ہے۔

## ن ش ر

اَلنَّشْرُ۔ ہوا۔ خوشبودار ہوا۔ مہک۔ دراصل اس میں پھیلنے کا پہلو غالب ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھولدینے اور اس کے شاخ در شاخ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ اَلتَّنْشِيْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ پھیلا دینا۔ نَشَرَ الْخَشَبَةَ۔ اس نے لکڑی کو چیر دیا۔ اَلْمِنْشَارُ۔ آرے کو کہتے ہیں اور اَلنُّشَارَةُ اس برادے کو جو لکڑی چیرنے سے گرتا ہے۔ اَلنَّشْرُ۔ خبر کو پھیلا دینا۔ یا پتوں کا پھیلنا۔ درختوں کا پتے لے آنا۔ نَشَرَتِ الْاَرْضُ نُشُوْرًا۔ موسم بہار آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگ آئے۔ اَلنَّشْرُ۔ اس خشک گھاس کو کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش پڑنے سے دوبارہ سبز ہو جائے۔ اور اَلنَّشِيْرُ۔ کاٹ کر جمع کی ہوئی کھیت کی پیداوار جسے گاھا نہ گیا ہو۔ اَنْشَرَ الْاَرْضَ۔ اس نے پانی دیکر زمین کو حیات نو عطا کر دی۔ اسی سے اَلنُّشُوْرُ۔ حیات تازہ کو کہتے ہیں*۔

*تاج و محیط و راغب۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے - سورہ بنی اسرائیل میں کِتَابًا . . . مَنْشُوْرًا (۱۷/۱۳) آیا ہے - کھلی ہوئی کتاب - سورہ طور میں فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۳) آیا ہے - پھیلے ہوئے صحیفہ میں - سورہ قمر میں ہے - جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (۵۴/۷) - بچھی ہوئی یا چھا جانے والی یا بکھری ہوئی ٹڈیاں - سورہ احزاب میں ہے فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (۳۳/۵۳) - جب کھانا کھا چکو تو پھر متفرق ہو جاؤ - سورہ مرسلٰت میں ہے - وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۷۷/۳) - دور دور تک پھیلانے والی قوتیں - سورہ فرقان میں ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے نیند کو آرام کا باعث بنایا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۲۵/۴۷) - اور دن کو نُشُوْرٌ - اس کے معنی چلنے پھرنے اور متفرق ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں اور نیند کے بعد حیات تازہ کے بھی - اسی سورۃ میں غیرخدائی معبودوں کی بے بسی کے متعلق ہے - لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵/۳) - وہ موت و حیات اور موت کے بعد حیات نو کی قدرت نہیں رکھتے - یہ حیات نو (مثالاً) اسی طرح ملتی ہے جس طرح بارش کے چھینٹے سے زمین کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ اٹھتا اور اس کے آغوش میں خوابیدہ سبزہ لہلہا اٹھتا ہے - چنانچہ سورہ فاطر میں زمین کی اسی حالت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا - كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵/۹) - اسی طرح سے تمہاری حیات تازہ کی مثال ہے - حیات تازہ کی یہ مثال کس قدر بلیغ اور بصیرت افروز ہے - یعنی اُس شے کے اندر زندگی کے ممکنات تو موجود ہوتے ہیں لیکن اپنی خوابیدہ شکل میں - اس نئے طریق (Process) سے اسکی خوابیدگی کو بیداری سے بدل دیا جاتا ہے - (مردہ قوموں کو حیات تازہ ملنے کی بھی یہی صورت ہے) - موت کے بعد حیات سے انکار کرنے والوں کا قول ہے کہ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۴۴/۳۵) - ہمیں حیات تازہ نہیں مل سکتی - ہم مر کر نہیں جی سکتے - کہا کہ یہ غلط ہے - خدا وہ ہے - اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰/۲۲) جو موت کے بعد انسان کو اپنے قانون مشیت کے مطابق حیات تازہ عطا کرتا ہے -

مردہ، جامد ہوتا ہے - زندہ بڑھتا اور پھیلتا ہے - زندگی کی علامت کشاد اور وسعت ، بڑھنا اور پھیلنا (اَلنَّشْرُ) ہے - جس میں وسعت اور کشاد نہیں وہ زندگی سے محروم ہے - جو قوم اپنی جگہ پر جم کر بیٹھتی ہے اور حرکت کرکے آگے نہیں بڑھتی وہ مردہ ہے -

## ن ش ز

اَلنَّشْزُ - وَالنَّشَزُ - بلند اور اونچی جگہ - نَشَزَ - وہ اونچی جگہ پر چڑھ گیا (اور محفوظ ہو گیا) - نَشَزَ الرَّجُلُ - آدمی بیٹھے سے کھڑا ہو گیا -

نَشَزَ بِالْقَوْمِ فِي الْخُصُومَةِ ۔ وہ قوم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نَشَزَ کہلاتا ہے۔ اسی سے نُشُوزٌ کے معنی ہیں میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا ، نافرمانی کرنے لگنا ، متنفر ہونا ، جھگڑنا ، بدسلوکی کرنا، ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا ۔ عورت کا مرد کے مقابل میں (۴/۳۴) ۔ اور مرد کا عورت کے مقابلہ میں (۴/۱۲۸) ۔ سورۂ مجادلہ میں یہ لفظ مجلس سے اٹھ کھڑے ہونے کے لئے آیا ہے (۵۸/۱۱)۔ سورۂ بقرہ میں ہڈیوں کو اٹھانے ، بلند کرنے اور ابھارنے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۲۵۹)۔

# ن ش ط

نَشَطَ مِنَ الْمَكَانِ ۔ وہ اس جگہ سے نکل گیا ۔ اَلنَّاشِطُ ۔ اُس جنگلی بیل کو کہتے ہیں جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف چلا جائے ۔ اس سے اَنْشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنی ہیں اس نے گرہ کو کھول دیا**۔ اَنْشَطَ الْبَعِيْرَ مِنْ عِقَالِهِ ۔ اس نے اونٹ کو اسکی رسی سے کھول کر آزاد کر دیا*** ۔ نَشْطٌ ۔ ایسی گرہ باندھنے کو کہتے ہیں جو آسانی سے کھل جاتی ہو**** ۔ اسی سے نَشِطَ ۔ يَنْشَطُ ۔ نَشَاطًا کے معنی ہیں کسی کام کے لئے انسان کا مستعد اور خوش دل ہونا ۔ راغب ہونا ۔ اُس کام سے خوش ہونا ۔ دلچسپی لینا ۔ دل کی گرہوں کا کھل جانا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھومنے اور حرکت کرنے کے ہیں ۔

قرآن کریم میں اَلنّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۷۹/۲) آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں وہ سیارے جو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آتے جاتے رہتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں ۔ کیونکہ تَنَشَّطَتِ النَّاقَةُ فِيْ سَيْرِهَا کے معنی ہیں اونٹنی اپنی رفتار میں تیز رہی**۔ نیز اِنْتَشَطَ الْحَبْلَ کے معنی ہیں اس نے رسی کو اس حد تک کھینچا کہ وہ کھل گئی ۔ نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ ۔ اس نے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچا***۔ (چرخی کے بغیر کھینچنے کے لئے بولا جاتا ہے )

اس اعتبار سے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا میں ستاروں کی باہمی کشش کی طرف بھی اشارہ ہے ۔ یعنی تیز رفتاری سے ادھر اُدھر جانے والے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کشش کو بھی قائم رکھنے والے ۔ ان کی گرہیں کھلی ہوئی بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ

*تاج و ابن فارس ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****راغب ۔

بندھے ہوئے بھی ہیں - تیز رفتاری اور کشادگی بھی ہے اور نظم و ضبط کی پابندی بھی - دیکھئے ایک لفظ نَشْطٌ* میں ان سیارگانِ فلک کی خصوصیات کی پوری دنیا کس طرب و نشاط سے جھلمل جھلمل کر رہی ہے -

مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے مراد یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں، یہ انقلابی جماعت انہیں ہٹا دیتی ہے - اس کا مشن یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے راستے میں حائل ہوں انہیں ہٹا دے* -

# ن ص ب

اَلنَّصْبُ - کسی چیز کو کھڑا کرکے رکھنا - ابھار کر رکھنا ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ہموار اور سیدھا کھڑا کر دینے کے ہیں - نَصَبَ الشَّجَرَةَ - درخت زمین میں لگا دیا*** - اَلنَّصْبُ گاڑا ہوا جھنڈا - اَلنُّصُبُ (وَالنَّصِیْبَةُ) - ہر وہ چیز جسے نصب کر دیا جائے اور اس طرح وہ نشان اور علامت بن جائے - اسکی جمع اَلْاَنْصَابُ ہے - ان پتھروں کو بھی جو کعبہ کے گرد نصب کئے گئے تھے اور جن پر جانور ذبح کئے جاتے تھے اَلْاَنْصَابُ کہتے تھے**** - اَلنَّصِیْبُ - پتھر جو کسی چیز پر ابھار کر رکھ دئے جائیں - اس سے اسکے معنی متعینہ (قائم کردہ) حصہ کے ہو گئے** - اَلنِّصَابُ - ہر چیز کا اصل اور مرجع*** - جَعَلْتُهٗ نُصْبَ عَیْنِیْ - میں نے اسے اپنی نگاہ کے سامنے قائم کر لیا کہ نہ اسے بھول سکتا ہوں نہ اس سے غافل رہ سکتا ہوں**** - یعنی اسے نصب العین بنا لیا -

نَصِبَ یَنْصَبُ - تھک جانا اور عاجز و درماندہ رہ جانا**** - (غالباً اس لئے کہ تھک جانے والا ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے) - اَلنَّصَبُ - مشقت - تھکن - کوفت - عَیْشٌ نَاصِبٌ - ایسی زندگی جسمیں مشقت ہو - اَلنَّصْبُ وَالنُّصْبُ وَالنَّصَبُ - بیماری - مضرت - مشقت - ابتلا و آزمائش**** - قرآن کریم میں ہے - لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ ($\frac{15}{48}$) - جنت میں انہیں مشقت، تکان یا کسی قسم کی تکالیف چھونیکی نہیں - نَصِیْبٌ بمعنی حصہ ($\frac{4}{7}$ ; $\frac{2}{202}$) میں آیا ہے - سورۂ نساء میں نَصِیْبٌ اور کِفْلٌ مرادف آئے ہیں ($\frac{4}{85}$) - سورہ مائدہ میں ہے وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ ($\frac{5}{3}$) - اسکے معنی وہ پتھر یا استھان ہیں جن پر غیر اللہ کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں - سورۂ

---

*المقام المحمود صفحہ ۸۱ **راغب - ***محیط - ****تاج -

معارج میں ہے کاَنَّھُمْ اِلیٰ نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۷۰/۴۳)۔ گویا وہ اس قسم کے استھانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ سورہ غاشیۃ میں ہے عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ (۸۸/۳) وہ لوگ جو محنت و مشقت کرکے تھک جائیں۔ محنت اور مشقت ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ محنت صحیح راستے پر کی جائے تو اس کام کا نتیجہ حسب منشا مرتب ہو جاتا ہے۔ اس محنت سے انسان میں تکان پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر وہی محنت غلط طریق پر کی جائے تو اس کا صحیح نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اسطرح وہ محنت انسان کو بری طرح تھکا دیتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ (۱۸/۱۰۵)۔ ان کے اعمال رائگاں گئے۔ انہوں نے صحیح نتیجہ پیدا نہ کیا۔ یہ ہیں عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ (۸۸/۳)۔ وہ لوگ جنہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق کام نہ کیا اس لئے ان کے حصے میں تکان اور ماندگی کے علاوہ کچھ نہ آیا۔

سورہ صٓ میں ہے کہ حضرت ایوب[ع] نے خدا کو پکارا کہ اَنِّی مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ (۳۸/۴۱) مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے جس کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف ہے۔ سورہ فاطر میں نَصَبٌ اور لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ یعنی جسمانی مشقت اور نفسیاتی تکان۔ سورہ کہف میں ہے کہ حضرت موسیٰ[ع] نے اپنے ساتھی سے کہا۔ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا ھٰذَا نَصَبًا (۱۸/۶۲)۔ ہمیں اس سفر سے تکان ہو گئی ہے۔ سورۂ انشراح میں ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴/۷)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو مخالفتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں تو تمہارے پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے تم مزید جد و جہد شروع کرو۔ نَصِبَ۔ یَنْصَبُ فِی الْاَمْرِ کے معنی جدو جہد کرنا ہیں*۔ عام طور پر جب مخالفت ختم ہو جائے تو پروگرام مکمل ہو جاتا ہے، لیکن اقامت نظام خداوندی کے پروگرام کا دوسرا حصہ مخالفت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مخالفت کا ختم ہونا گویا حصہ لآ ہے۔ اس کے بعد حصہ اِلاَّ (یعنی مثبت پروگرام) شروع ہوتا ہے۔ یوں اس جماعت کی ساری زندگی جد و جہد میں گذرتی ہے۔

## ن ص ت

نَصَتَ الرَّجُلُ یَنْصِتُ وَاَنْصَتَ (نَصَتَ کے مقابلہ میں اَنْصَتَ زیادہ فصیح ہے)۔ خاموش ہو جانا۔ چپ رہنا۔ کسی کی بات سننے کے لئے خاموش ہو جانا**۔ وَاَنْصِتُوْا (۷/۲۰۴)۔ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔

---

*محیط۔ **تاج و محیط۔

# ن ص ح

نَصَحَ - شہد صاف کرنے اور کپڑا سینے کو کہتے ہیں - پہلے معنوں میں نَصَحَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں چیز خالص ہوگئی - اَلنَّاصِحُ - شہد خالص - اور دوسرے معنوں میں نَصَحَ الْخَیَّاطُ الثَّوْبَ - درزی نے کپڑے کو سیا ، یا عمدگی سے سیا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا اور انہیں درست کرنا ہوتے ہیں - نیز النُّصْحُ والنَّصِیْحَۃُ ضد ہے فریب اور دھوکا دینے کی - اَلنَّاصِحُ واَلنَّصَّاحُ - درزی کو کہتے ہیں - النِّصَاحُ - دھاگہ - اَلْمِنْصَحَۃُ - سوئی - نَصْحٌ - رفو کرنا * - لہٰذا نَصِیْحَۃٌ کے معنی ہوئے کسی کے چاکِ گریباں کا نہایت خلوص کے ساتھ رفو کرنا - کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو دل کی پوری صفائی کے ساتھ سی دینا - کسی کا ساز گار اور خیر خواہ ہونا * - رسول اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ وَاَنْصَحُ لَکُمْ ( $\frac{٧}{٦٢}$ ) - میں تمہاری چارہ سازی اور سازگاری کے لئے آیا ہوں - میں نہایت خلوص سے تمہارے پیرہن انسانیت کی رفو گری کی کوشش کر رہا ہوں - تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَصُوْحًا ( $\frac{٦٦}{٨}$ ) - تم خدا کی راہ کی طرف اسطرح واپس آؤ کہ اس سے ہٹ کر پھر کسی اور راستے کو اختیار نہ کرو - اپنے آپ کو اس راستے کے ساتھ نہایت اخلاص کے ساتھ متمسک کر لو - اس سے پیوست ہو جاؤ -

# ن ص ر

نَصَرَ الْغَیْثُ الْاَرْضَ - بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کردیا - اَرْضٌ مَنْصُوْرَۃٌ - وہ زمین جہاں بارش ہو چکی ہو - اَلنَّوَاصِرُ ( نَاصِرٌ یا نَاصِرَۃٌ کی جمع) وہ ندی نالے جو کسی وادی میں دور سے آئیں - ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ نَاصِرٌ اور نَاصِرَۃٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دورو دراز جگہ سے آئے اور سیلاب کو آگے بڑھتے میں مدد پہنچائے * - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ نَصْرٌ کے معنے رزق پہنچانے کے ہوتے ہیں ** - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے خیر لانا اور خیر دینا ، بتائے ہیں - نیز النَّصْرُ کے معنے عطیہ و بخشش لکھے ہیں -

لہٰذا اس کے بنیادی معنی زمین کی وہ سیرابی ہے جس سے وہ سرسبز و شاداب ہو جائے - قرآن کریم نے اس جماعت کو جو اس کے قوانین کے مطابق زندگی

---

*تاج و محیط - **القرطین ج/۲ صفحہ ۲۹ -

بسر کرتی ہے مُفْلِحُوْنَ کہا ہے (۵/۲) - یعنی وہ لوگ جن کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں - جن کی فصلیں کامیاب ہو جائیں - (دیکھئے ف - ل - ح)- اس لئے خدا کا قانون وہ بارش ہے جس سے ان کی سعی و عمل کی کھیتی ثمر بار ہوتی ہے- اسی کو نصرت خداوندی کہتے ہیں - انسان کی وہ کوشش جو قانونِ خداوندی کے مطابق نہ ہو، اس کسان کی محنت کی طرح ہے جس کی زمین پانی سے محروم رہ جائے - انہی کو قرآن کریم نے اَخْسَرِیْنَ اَعْمَالاً اور ضَلَّ سَعْیُھُمْ (۱۸/۱۰۳-۱۰۴) کہا ہے - یعنی جن کی کوششیں رائیگاں چلی گئیں - اور ان کے کاروبار نے انہیں سخت نقصان پہنچایا - سورۃ آلِ عمران میں نَصَرَ بمقابلہ خَذَلَ آیا ہے - خَذَلَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ چھوڑ دینا - اس لئے نَصَرَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ دینا -

چونکہ پانی، کھیتی کے اُگنے میں مدد دیتا ہے اسی لئے نَصْرٌ کے معنی اعانت اور مدد کرنا ہیں - محیط نے معونت اور نصرت میں فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ نُصْرَت دفع مضرت کے لئے خاص ہے، اور معونت عام ہے - اِسْتِنْصَارٌ - مدد طلب کرنا - اِسْتَنْصَرَہٗ عَلٰی فُلَانٍ اس سے فلاں کے خلاف مدد مانگی - اِنْتَصَرَ - وہ ظالم کے ظلم سے محفوظ رہا - اس نے انصاف حاصل کرلیا - اس نے انتقام لے لیا* - سورۃ انبیاء میں ہے وَ انْصُرُوْا آلِھَتَکُمْ (۲۱/۶۸) - اپنے معبودوں کا بول بالا کرو-

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خدا کی نصرت، ان ثمرات کو کہتے ہیں جو اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں - لہذا خدا کی نصرت (یا تائید غیبی) یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی - خدا کا ارشاد ہے یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (۴۷/۷) - اے ایمان والو- اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کریگا- خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام کو دنیا میں قائم کرو- اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو - اگر تم نے یہ کر دیا تو اس نظام اور قانون کی برکات تمہارے شامل حال ہو جائینگی - اوراس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ (۴۷/۷) - وہ تمہارے پاؤں جما دے گا- تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا - اس کے برعکس، جو لوگ اس قانون کے مطابق چلنے سے انکار کریں گے - اَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ (۴۷/۸) - ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جائینگے -

---

*تاج و محیط - **القرطبین - ج/۲ صفحہ ۲۹ -

سورۃ ھود میں ھے مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ (۱۱/۶۳) ۔ اس کے معنی ھیں مجھے خدا کے عذاب سے کون بچا سکتا ھے ۔ یا خدا کے خلاف میری کون مدد کرسکتا ھے ۔ مفہوم دونوں کا ایک ھی ھے ۔ یعنی اگر میں قانون خداوندی کے خلاف چلوں تو میری اس غلط روش کے تباہ کن نتائج سے مجھے کون بچا سکتا ھے ۔ سورۃ شوریٰ میں ھے وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲/۳۹) ۔ جب ان پر کوئی زیادتی کرتا ھے تو وہ اپنی حفاظت کرتے ھیں ۔ سورۃ محمد میں ھے وَ لَوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَانْتَصَرَ مِنْھُمْ (۴۷/۴) ۔ اس کے معنے ظالم سے بدلہ لینے کے ھیں ۔ سورۃ قمر میں ھے اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۵۴/۱۰) ۔ ''میں مغلوب ھوں سو تو میرا بدلہ لے'' ۔

اَلْاَنْصَارُ ۔ (۹/۱۰۰) قرآن کریم میں یہ لفظ مہاجرین کے مقابلہ میں آیا ھے ۔ اس سے مراد (مدینہ کے) وہ مومنین ھیں جنھوں نے مہاجرین کی مدد کی اور اس طرح نظامِ خداوندی وھاں متمکن ھوا ۔ ویسے اَنْصَارُ اللّٰہِ (۶۱/۱۴) کے معنی ھیں ، دین خداوندی کی مدد کرنے والے ۔

# نَصاریٰ

نَصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین بخلاف ھُوْد (۲/۱۱۱)۔ واحد نَصْرانِیٌّ ھے (۳/۶۶) ۔ یَھُوْدِیٌّ کے بالمقابل ۔ نَصْرانٌ اور نَصْرانِیٌّ دونوں کی جمع نَصاریٰ ھے ۔

# ن ص ف

نِصْفٌ ۔ نَصْفٌ ۔ نُصْفٌ ۔ کسی چیز کی دو شقوں میں سے ایک شق یا اس کے دو (برابر) اجزاء میں سے ایک جزو ۔ یعنی آدھا*۔ قرآن کریم میں ھے فَلَھَا النِّصْفُ (۴/۱۱)۔ اس (مؤنث) کے لئے نصف (آدھا) ھے ۔ اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ اسے کہتے ھیں کہ جسقدر فائدہ کسی سے حاصل کرے اتنا فائدہ اسے پہنچائے بھی ۔ جسقدر کسی سے اجرت لے اسی قدر اس کا کام بھی کرے ۔ کسی سے حقوق مانگے تو اس کے واجبات ادا کرے** ۔ قرآن کریم میں عَدْل اور قِسْط کے الفاظ آئے ھیں ۔ انصاف کا لفظ نہیں آیا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ کے معنی ھیں آدھے پر راضی ھو جانا ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

# ن ص و

اَلنَّاصِيَةُ - سر کا اگلا حصہ - یا سر کے اگلے حصے کی وہ آخری حد جہاں بال اُگے ہوئے ہوتے ہیں* - (لیکن دیگر لغات میں سر کے اگلے حصہ کی قید نہیں ہے) - پیشانی کے بال - (جمع اَلنَّوَاصِي) مجازاً یہ لفظ عزت و شرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے* - فُلَانٌ نَاصِيَةُ قَوْمِہٖ وہ اپنی قوم کا سردار ہے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بہتر چیز کو انتخاب کرنے یا کسی چیز میں بلندی اور شان و اہمیت ہونے کے ہیں - أَخَذَ بِنَاصِيَتِہٖ - پیشانی کے بال پکڑنا - کسی کو بے بس کر کے قبضے میں رکھنا - سورۃ ہود میں ہے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا (۱۱/۵۶) - یعنی ہر ذی حیات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے - ہر ایک پر اس کا قانون حاوی ہے - کوئی اس کے قانون کی حد سے باہر نہیں - سب اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں -

سورۃ رحمٰن میں ہے فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ (۵۵/۴۱) - وہ پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائینگے - ان پر پوری گرفت ہوگی -

# ن ض ج

نَضِيجَ الثَّمَرُ - پھل اچھی طرح پک گیا - هُوَ نَضِيجُ الرَّأْيِ - وہ پختہ اور محکم رائے والا ہے* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو آخری حد تک پکانا بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد ازاں یہ استعارۃً ہر چیز کے انتہائی پختہ ہو جانے کے لئے بولا جاتا ہے - یعنی در اصل یہ لفظ آگ وغیرہ کی تپش سے جلانے اور پکانے کے لئے بولا جاتا ہے - أَنْضَجَ الطَّاهِي اللَّحْمَ کے معنے ہیں پکانے والے نے گوشت کو اتنا پکایا کہ وہ گل گیا اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ ہوگئے* -

سورۃ نساء میں ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ (۴/۵۶) - یہاں نَضِجَ کے معنی پک کر پختگی تک پہنچنا نہیں - اس کے معنی گل کر ریزہ ریزہ ہوجانا ہیں - یعنی ان کی قوت اور صلابت ختم ہوجائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج - ل - د) -

---

*تاج - **راغب -

# ن ض خ

نَضَخَہٗ ۔ یَنْضَخُہٗ ۔ اس پر چھڑکا ۔ نَضَخَ الْمَاءُ ۔ پانی کا جوش مار کر ابلنا ۔ پانی کا چشمہ سے ابل کر بہنا ۔ عَیْنٌ نَضَّاخَۃٌ ۔ جوش مار کر ابلنے والا چشمہ* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے ۔ کہ اس کے معنی کثیر پانی والا چشمہ ہیں ۔

قرآن کریم نے ''جنتی باغات'' کے متعلق کہا ہے کہ ان میں عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵/۶۶) ہیں ۔ جوش مار کر ابلنے والے چشمے ۔ وہ قوتیں جو فوارہ کی طرح اپنے زور دروں سے بلندیوں کی طرف لے جائیں ۔

# ن ض د

نَضَدَ مَتَاعَہٗ یَنْضِدُہٗ ۔ اپنے سامان کو اوپر تلے رکھنا ۔ بعض چیزوں کو بعض پر ترتیب سے رکھنا ۔ اس طرح ترتیب سے رکھا ہوا سامان نَضِیْدٌ و مَنْضُوْدٌ کہلائیگا** ۔ یعنی، تہ بہ تہ (۵۰/۱۰ ; ۵۶/۲۹) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چند چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نظم و ترتیب کے سے ملا کر رکھنے کے ہوتے ہیں، خواہ انہیں کھڑا رکھا جائے یا چوڑائی میں رکھا جائے ۔

اَلْاَنْضَادُ مِنَ الْجِبَالِ ۔ پہاڑوں کی وہ چٹانیں یا پتھر جو ایک دوسرے کے اوپر تلے ہوں ۔ اَلْاَنْضَادُ مِنَ السَّحَابِ ۔ وہ بادل جو تہ بہ تہ ایک دوسرے کے اوپر ہوں** ۔ سورہ ہود میں ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَۃً مِنْ سِجِّیْلٍ مَّنْضُوْدٍ (۱۱/۸۲) ہم نے ان پر پے درپے اور مسلسل پتھروں کی بارش کی ۔ یا ایسے پتھر برسائے جن کی مختلف تہیں (Layers) تھیں ۔

# ن ض ر

اَلنَّضْرَۃُ ۔ خوش حالی و آسودگی ۔ روزی ۔ تونگری ۔ حسن ۔ دراصل النَّضَارَۃُ کے معنی چہرہ کا حسن اس کی آب و تاب اور تروتازگی ہے ۔ اَلنَّاضِرُ گہرے سبز رنگ والے کو کہتے ہیں ۔ اَلنُّضَارُ ۔ سونے وغیرہ کا خالص جوہر ۔ قَدْ اَنْضَرَ الشَّجَرُ ۔ درخت کے پتے سرسبز ہوئے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی حسن و جمال اور خالص ہونے کے ہیں ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وُجُوْہٌ یَوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ (۷۵/۲۲) - اس دن کچھ چہرے ترو تازہ ، ہشاش بشاش ہونگے - یعنی وَلَقّٰہُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا (۷۶/۱۱) - انہیں شادابی اور مسرت حاصل ہوگی - تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْہِہِمْ نَضْرَۃَ النَّعِیْمِ (۸۳/۲۴) - " تو ان کے چہروں پر نعمتوں کی شادابی دیکھیگا " - یہ ان کی پہچان کی علامت ہوگی - یہ ہے جنتی زندگی کی کیفیت -

## ن ط ح

نَطَحَ یَنْطِحُ - اس نے سینگ مارا - اَلنَّطِیْحَۃُ - وہ جانور جو کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے* - قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۵/۳) - اَلنَّوَاطِحُ - شدائد و مصائب* -

## ن ط ف

اَلنُّطْفَۃُ - صاف پانی ، کم ہو یا زیادہ - ازہری نے کہا ہے کہ عرب تھوڑے سے پانی کو بھی نُطْفَۃٌ کہتے ہیں اور زیادہ پانی کو بھی ، لیکن یہ لفظ تھوڑے پانی کے لئے خاص ہے - اَلنُّطْفَۃُ - دریا - سمندر - آدمی کا مادۂ منویہ - نَطَفَ الْمَاءُ - پانی بہ گیا - تھوڑا تھوڑا کرکے ٹپک گیا** - ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنوں میں نمی اور تری بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد میں استعارۃً اَلنَّطَفُ لتھڑ جانے کو کہتے ہیں اور بیشتر یہ مذموم طور پر بولا جاتا ہے - شَیْءٌ نَطِیْفٌ - عیب دار چیز -

قرآن کریم میں انسانی خلقت کے ایک مرحلہ کے متعلق متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اسے نُطْفَۃٌ سے پیدا کیا (۱۶/۴) - یعنی اس سے جنین کی پیدائش ہوتی ہے -

## ن ط ق

نَطْقٌ - آواز دار حروف کے ساتھ بولنا جس سے معنی سمجھ میں آتے ہوں - حیوانات کے بولنے کو نُطْقٌ نہیں بلکہ صَوْتٌ کہتے ہیں - اَنْطَقَہُ اللّٰہُ - خدا نے اسے بلوایا*** - صاحب محیط نے کہا ہے کہ نُطْقٌ کا لفظ انسان کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے - ویسے کسی بات کے واضح کر دینے کو بھی کہتے ہیں - جیسے نَطَقَ الْکِتَابُ کے معنی ہیں کتاب نے بیان کر دیا اور واضح کر دیا**** - اَلنَّاطِقَۃُ کوکھ کو کہتے ہیں اور اَلنِّطَاقُ اس پٹکے ( یا لہنگے ازار وغیرہ ) کو جو کمر کے ساتھ باندھ لیا جائے*** - اس

*تاج و محیط و ابن فارس - **تاج و محیط و راغب - ***تاج - ****محیط -

اعتبار سے راغب نے کہا ہے کہ نِطَاقٌ وہ لفظ ہے جو معنی کو اپنے گھیرے میں لے لینے کی وجہ سے نِطَاقٌ کیطرح ہو***۔ ابن فارس نے بھی اس کے بھی دو بنیادی معنی لکھے ہیں۔ یعنی (۱) کلام یا کلام کے مشابہ کوئی چیز۔ اور (۲) ایک قسم کا لباس۔ یعنی النِّطَاق۔ ازار۔

قرآن کریم میں ہے اِنْ کَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۲۱/۶۳)۔ اگر وہ بولتے ہیں تو۔ سورہ جاثیہ میں ہے ھٰذَا کِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۴۵/۲۹) یہ ہماری کتاب (تمہارا اعمالنامہ) ہے جو تمہارے خلاف ہر بات کو حق کے ساتھ بتا دیتی (یا واضح کر دیتی) ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ کُلَّ شَيْءٍ (۴۱/۲۱)۔ ہمیں اسی خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نُطْقٌ سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل و حرکت اسکی شہادت دیتی ہے کہ .....

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان کو مَنْطِقُ الطَّيْرِ (۲۷/۱۶) سکھائی گئی تھی۔ اس کے معنی ہیں قبیلہ طیر کی بولی۔ (یا بطور استعارہ گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط)۔ (دیکھئے عنوان ط۔ ی۔ ر)۔ اگر اس سے مفہوم ''پرندوں کی بولی'' لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ علم جس سے انسان، پرندوں کی نقل و حرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ چیز، پرندوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔

## ن ظ ر

نَظَرَ۔ يَنْظُرُ۔ آنکھ سے دیکھنا۔ کسی چیز میں غور کرنا۔ اندازہ کرنا اور دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر اس کی بابت قیاس کرنا۔ چنانچہ اَلنِّظَارُ فراست کو کہتے ہیں۔ توجہ دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُنْظُرْنِيْ۔ میری طرف توجہ دو۔ میری طرف التفات کرو*۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غور کرنا اور معائنہ کرنا ہیں۔

نیز اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ نَظَرْتُهُ وَ انْتَظَرْتُهُ۔ میں اس کی آمد کا منتظر رہا۔ اسی سے مہلت دینے کے معنوں میں اَنْظَرَهُ

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کو مہلت دیدی۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ (۱۵/۳۶)۔ ''اس (ابلیس) نے کہا۔ میرے رب تو مجھے یوم البعث تک مہلت دے دے۔ (اللہ تعالیٰ نے) کہا کہ تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی ہے''۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَيْسَرَةٍ (۲/۲۸۰)۔ ''اسے فراخی تک مہلت دیدینا چاہئے''۔

تَنَاظَرَ کے معنے ہیں آمنے سامنے ہونا۔ اَلنَّظِيْرُ۔ مثل اور مشابہ۔ اَلنَّظْرُ کے بھی یہی معنی آتے ہیں*۔

اَلنَّظْرَةُ کے معنی ہیں عیب اور بدھیئتی۔ اَلْمَنْظُوْرُ۔ عیب دار۔ معیوب*۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں جہاں کہا گیا ہے فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸)۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قوم ستاروں کی پرستش کرتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی ماہیت پر غور و فکر کیا اور انہیں بتایا کہ ان میں وہ کیا کیا کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے وہ معبود بن سکنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ (مثلاً یہ کہ وہ خود مجبور ہیں۔ ان کا طلوع و غروب بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ وہ آفِلِيْنَ ڈوب جانے والے ہیں وغیرہ وغیرہ)۔ اور اس کے بعد کہا اِنِّيْ سَقِيْمٌ (۳۷/۸۹)۔ میں اس قسم کے معبودوں سے بیزار ہوں۔ میں ان کی پرستش نہیں کرسکتا۔

نَظَرَ لَهُمْ۔ کے معنی ہیں ان کی وجہ سے درد مند ہوا اور ان کی مدد کی۔ اور نَظَرَ بَيْنَهُمْ کے معنی ہیں ان کے درمیان فیصلہ کردیا*۔

اگرچہ نَظَرَ کے معنی غور کرنے کے بھی ہیں لیکن چونکہ اس کے اولین معنی صرف دیکھنے کے ہیں اس لئے قرآن کریم نے نَظَرَ اور بَصَرَ میں فرق کرکے بتا دیا۔ سورۂ اعراف میں ہے وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷/۱۹۸)۔ تو دیکھے گا کہ وہ صرف تیری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں (لیکن جو کچھ تو کہتا ہے اس پر) چشم بصیرت سے غور نہیں کر رہے ہوتے۔ اس طرح کے ''دیکھنے والوں'' کو قرآن کریم اَلْعُمْىُ کہتا ہے۔ یعنی اندھے (۱۰/۴۳)۔ وہ جن کی ''دل کی آنکھیں'' اندھی ہوجاتی ہیں (۲۲/۴۶)۔

## ن ع ج

اَلنَّعَجُ۔ موٹا ہونا۔ نَعِجَتِ الْاِبِلُ۔ اونٹ فربہ ہوئے۔ اَلنَّاعِجَةُ نرم اور ہموار زمین جہاں پیداوار بہت اچھی ہوتی ہو۔ اَلنَّعْجَةُ۔ مادہ بھیڑ۔

*تاج و راغب۔

ھرنی ۔ نیل گائے یا پہاڑی بکری* ۔ (جمع نِعَاج*) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (واحد اور جمع) ( ۳۸/۲۳ ، ۲۴ ) میں آیا ھے۔

# ن ع س

اَلنُّعَاسُ ۔ نیند کی گرانی سے حواس میں جو سکون اور خاموشی سی پیدا ھونے لگتی ھے* ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ھے کہ نَوْمٌ تو نیند کی وہ حالت ھے جسمیں انسان کے حواس قطعاً معطل ھو جاتے ھیں اور نُعَاسٌ اس کی ابتدائی حالت کو کہتے ھیں ۔ بعض نے کہا ھے کہ سِنَةٌ ۔ سر میں نیند کی گرانی کو کہتے ھیں ۔ نُعَاسٌ ۔ آنکھ میں ھوتی ھے اور نَوْمٌ دل میں** ۔ راغب نے نُعَاسٌ کو نَوْمٌ قَلِيْلٌ کہا ھے ۔ ھلکی سی نیند ۔ اور لکھا ھے کہ قرآن کریم کی آیت ( ۸/۱۱ ) میں اس سے مراد سکون و اطمینان ھے***۔ قرآن کریم میں ھے اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً (۸/۱۱) جب خدا نے امن و سکون کےلئے تم پر نُعَاسٌ طاری کردی ۔ (نیز ۳/۱۵۳ ) ۔ اس سے مراد سکون و اطمینان ھے نہ کہ اونگھ۔

# ن ع ق

نَعَقَ الرَّاعِي بِغَنَمِهٖ ۔ يَنْعِقُ ۔ نُعَاقاً ۔ چرواھے کا بھیڑ بکریوں کو ( ھانکنے کے لئے ) جھڑکنا اور آواز دینا ****۔

سورہ بقرہ میں ان لوگوں کا ذکر ھے جو اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کئے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ھیں ۔ انہیں بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دی ھے جن کی کیفیت یہ ھوتی ھے کہ وہ چرواھے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ھیں ، اپنی سمجھ بوجھ سے کچھ نہیں کرتیں ۔ چرواھے کی یہ آواز بھی محض " آواز " ھوتی ھے جسکے معنی کچھ نہیں ھوتے ۔ اندھی تقلید کرنے والے بھی الفاظ کے مفہوم کو نہیں سمجھتے ۔ ان کے متعلق جو کچھ انہیں بتا دیا جاتا ھے ( کہ یہ کہا جائے تو اسکا مطلب یہ ھوگا اور وہ کہا جائے تو وہ ) اسکے مطابق کرتے چلے جاتے ھیں ۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً (۲/۱۷۱)۔ " حقائق سے انکار کرنے والوں کی مثال ایسے شخص کی سی ھے جو ایسے آواز دے رھا ھو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا ۔ " ( یعنی صُمٌّ ۔ بُكْمٌ عُمْيٌ ۔ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ بہرے ۔ گونگے ۔ اندھے ۔ جو عقل سے کام

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط و ابن فارس ۔

نہیں لیتے )۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ہمارے مروجہ مذہب کی کیسی عمدہ تصویر کھینچی ہے ۔ عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور انکے پیشوا چرواہے جنہوں نے اپنے آباء سے چند الفاظ سن رکھے ہیں جنہیں وہ بلا سمجھے بوجھے دہراتے رہتے ہیں ۔ اور عوام ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں ۔

## ن ع ل

نَعْل* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نشیبی ہونے اور نچلا حصہ ہونے کے ہیں ۔ اَلنَّعْلُ ۔ جوتا ۔ ہر وہ چیز جس سے پاؤں کا زمین پر لگنے سے بچاؤ کیا جائے* ۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ سے کہا گیا کہ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (۱۲/۲۰) ۔ اپنے دونوں جوتے اتار دو ۔ (ذرا اطمینان سے بیٹھو۔ اور سکون سے بات سنو) ۔ ( تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ع )

## ن ع م

نَعِمَ بِهٖ عَيْنًا ۔ اس نے کسی چیز یا منظر کو ایسی کیفیت لئے ہوئے پایا جس سے اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوا ۔ دراصل تَنْعِيْمَة* ایک پودا ہوتا ہے جسکے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اسکی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا ۔ ثَوْبٌ نَاعِمٌ* ۔ اُس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو بہت نرم اور آرام دہ ہو ۔ اور نُعَامٰی ۔ جنوبی ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی خوشگوار اور تمام ہواؤں سے زیادہ مرطوب ہوتی ہے ۔ ان معانی کے اعتبار سے اَلنَّاعِمَةُ ۔ اَلْمُنَاعِمَةُ والمُنَعَّمَةُ ۔ آسودگی اور خوشگوار زندگی گذارنے والی خوش خوراک عورت کو کہتے ہیں** ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہے ۔ اَلنَّعَامَةُ ۔ بلند عمارت جو کسی پہاڑ پر چھجے کیطرح ہو ۔ کنوئیں پر جمائی ہوئی ابھری ہوئی چٹان ۔ اونچا نشان یا جھنڈا جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے** ۔ اِبْنُ النَّعَامَةِ ۔ وہ پانی پلانے والا جو کنوئیں پر کھڑا رہتا ہے** ۔

قوم کی اجتماعیت اور باہمی اتفاق کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے** ۔ کہتے ہیں شَالَتْ نَعَامَتُهُمْ ۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا ۔ اَلنِّعْمَةُ ۔ وہ حالت جس میں انسان لذت محسوس کرتا ہے*** ۔ نیز مسرت ۔ مال و دولت آسودگی و خوش حالی اور احسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے* ۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

ان معانی سے واضح ہے کہ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور اذیت و تکلیف سے دور ہو جانا نِعْمَتْ ہے۔ چنانچہ سورہ نحل میں دنیاوی زندگی کے مختلف ساز و سامان کے تذکرہ کے بعد کہا ہے کَذَالِکَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْکُمْ (۱۶/۸۱)۔ اس سے نِعْمَتْ کے معنی واضح ہیں۔ سورۂ لقمٰن میں اس سامان کو نِعْمَتْ اللہِ کہا گیا ہے جو کشیتوں کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کیا جاتا ہے (۳۱/۳۱)۔ سورہ آلِ عمران میں میدان جنگ کی فتوحات اور مال غنیمت کو بھی نِعْمَتْ کہا گیا ہے (۳/۱۷۳)۔ سورۂ نحل میں نِعْمَتْ کے مقابل ضَرَّ لا کر اسکے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے (۱۶/۵۳)۔ یعنی زندگی کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دور رہنا۔

سورۃ دخان میں زندگی کی تمام آسودگیوں اور خوش حالیوں کو نَعْمَةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۴۴/۲۷)۔ سورۃ غاشیہ میں نَاعِمَةٌ کے مقابلہ میں خَاشِعَةٌ اور نَاصِبَةٌ (تھکے ماندے۔ افسردہ و غمگین۔ ذلیل و خوار) لا کر، زندگی کی تر و تازگی اور شادابی و شگفتگی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے (۸۸/۲-۸)۔

بلندی اور رہنمائی (ہدایت خداوندی) کے مفہوم کی وضاحت کے لئے سورۃ ابراہیم میں نِعْمَةٌ اللہِ کے مقابلہ میں کُفْرٌ کا لفظ آیا ہے (۱۴/۲۸)۔ اس مقام پر کفر کے معنے زندگی کی خوشگواریوں کی ناقدر شناسی بھی ہوسکتے ہیں۔

نَاعِمَةٌ (۸۸/۸)۔ تر و تازہ خوشگواریاں لئے ہوئے۔ نَعْمَةٍ (۴۴/۲۷) آسودگی۔ نِعْمَةٌ (۲۶/۲۲) فضل و کرم۔ احسان۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ آتی ہے۔ کائنات کی ہر شے جسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے نِعْمَةٌ ہے (۱۴/۳۴-۳۴)۔ نیز اقوام عالم پر فضیلت مل جانا بھی نعمت ہے (۲/۴۷)۔

طبعی آسائشوں کے علاوہ ذہنی صلاحیتوں کے عمدہ ہونے کے لئے بھی نِعْمَةٌ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۵۲/۲۹ و ۶۸/۲)۔ اور جسمانی صفائی اور تندرستی کے لئے بھی (۵/۶)۔

قرآن کریم نے اس قوم کو جو زندگی کے بہترین اور بلند ترین مقام پر ہو، مُنْعَمٌ عَلَیْهِ سے تعبیر کیا ہے۔ اور انہی کے راستے پر چلنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں (۱/۶)۔ نِعْمَةٌ کے ان تمام معانی کو پیش نظر رکھنے سے جو اوپر لکھے جا چکے ہیں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی قوم کن خصوصیات کی حامل اور کس مقام پر سرفراز ہوگی۔ انہی لوگوں کو قرآن کریم

مؤمن کہتا ہے - لہذا ، جنہیں یہ کچھ حاصل نہیں یا جو اس کے حصول کی جد و جہد نہیں کرتے - سمجھ لیجئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن نہیں -
نِعْمَ کے معنے ہیں ''بہت ہی اچھا ہے'' - نِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ (۵۱/۴۸) - بہت ہی اچھے ہیں ہم سامانِ زندگی کے بہم پہنچانے والے - نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (۴/۵۸) بہت ہی اچھی بات ہے جسکی تمہیں نصیحت کر رہا ہے - (یہ در اصل نِعْمَ + مَا ہے - یہ مَا موصولہ ہے) -
نَعْمٌ و نَعَمٌ جمع اَنْعَامٌ کے عام معنی مال مویشی کے ہیں - عرب عام طور پر یہ لفظ اونٹ ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے - بعض نے ان میں بھیڑ اور دنبہ کو بھی شامل کیا ہے - لیکن بعض نے اسے صرف اونٹوں کےلئے مخصوص قرار دیا ہے* - قرآن کریم نے اونٹ - گائے - بھیڑ اور بکری - چاروں کو اس میں شامل کیا ہے (۶/۱۴۳-۱۴۴ و ۳۹/۶) -
قرآن کریم میں ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۵/۱ ; ۲۲/۳۰-۲۸) - تمہارے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال کئے گئے ہیں ، بجز ان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہے - یہ الگ حکم اسی سورت میں دو آیات آگے چل کر ہے جس میں مردار - خون - خنزیر - کے گوشت کو اور ہر اس چیز کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام قرار دیا گیا ہے (۵/۳) -
جیسا (کہ ب - ہ - م) کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے ، بَهِيْمَةٌ کے معنے ہیں وہ جو بول نہ سکے - اس اعتبار سے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے معنی ہونگے ، مویشی ، جو بول نہیں سکتے - انگریزی میں جیسے (Dumb Cattle) کہا جاتا ہے - یعنی یہ لفظ (بَهِيْمَةٌ) اَنْعَامٌ کی صفت ہے - اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اَنْعَامٌ میں سے جو بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہیں وہ حلال ہیں - باقی نہیں - اَنْعَامٌ تو سب کے سب بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہوتے ہیں - جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ، قرآن کریم نے اونٹ ، گائے ، بھیڑ اور بکری کو انعام میں شامل کیا ہے - لیکن (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) بهيمة الانعام میں تمام وہ حیوان شامل ہیں جو چرتے چگتے ہیں -
سورۃ فاطر میں اَنْعَامٌ کو انسان اور دَوَابٌّ سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵/۲۸) - اگرچہ دَوَابٌّ میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د - ب - ب) - لیکن یہاں دواب کے معنے پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے - لہذا ، اَنْعَامٌ سے مراد چارپائے ہونگے -

*تاج -

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ نباتات میں سے تم خود بھی کھاؤ اوراپنے اَنْعَام کو بھی کھلاؤ۔ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ (٢٠/٥٤ نیز ١٠/٢٤ ; ٣٢/٢٧ ; ٧٩/٣٣ ; ٨٠/٣٢)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَنْعَام چرنے ، چگنے والے جانور ہیں - جنہیں تم چرا کر لاتے ہو - (١٦/٦) -

سورۃ نحل میں ہے کہ تم اَنْعَام کا دودھ پیتے ہو (١٦/٦٦) - سورۃ المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے ہو - ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور سواری بھی کرتے ہو (٢٣/٢١) - ان کی اُون سے کپڑے بناتے ہو (١٦/٥) - ان کی کھالوں کے خیمے بناتے ہو (١٦/٨٠) - ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو (١٦/٧)۔ ان میں حَمُوْلَۃً بھی ہیں اور فَرْشًا بھی (٦/١٤٣) - یعنی جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے کام آئیں - (دیکھئے عنوان ح - م - ل) - اور جو ان کاموں کے لئے چھوٹے ، یعنی زمین گیر ہوں (دیکھئے عنوان ف - ر - ش) - (٤٣/١٣) میں اَنْعَام کے متعلق ہے کہ تم ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو - سورۃ یٰسٓ میں ان تمام فوائد کو اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ - وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (٣٦/٧٢-٧٣)۔ ان میں سے ان کے لئے سواری کا کام دینے والے ہیں - اور وہ بھی جنہیں یہ کھاتے ہیں - اور ان کے لئے ان میں (اور) بہت سی فائدہ کی چیزیں ہیں اور (پینے کا) دودھ بھی- اسی طرح سورۃ مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ - وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (٤٠/٧٩-٨٠) - اس میں بھی چوپایوں کے کھانے ، ان سے سواری کا کام لینے ، بوجھ لادنے اور دیگر فوائد کا ذکر ہے -

سورۃ نحل میں ان مویشیوں کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں وہ لوگ (عرب) صبح و شام چرایا کرتے تھے (١٦/٦) - اور بوجھ اٹھانے والوں کا ذکر الگ ہے (١٦/٧) - اور خَیْلٌ (گھوڑے) بِغَالٌ (خچر) اور حَمِیْرٌ (گدھے) کے متعلق ہے لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (١٦/٨) - وہ تمہارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور باعث زینت بھی ہیں - اسی طرح سورۃ آل عمران میں اَلْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ (٣/١٤) الگ الگ آیا ہے - یعنی پلے ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی - سورۃ مومن میں ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (٤٠/٧٩) - اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چارپائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو - اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو -

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اَلْاَنْعَامُ سے مراد چرنے چگنے والے مویشی ہیں ۔ ان کا دودھ پیا جاتا ہے ۔ سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا ہے ۔ ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں ۔ کھالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں ۔ نیز یہ وجہ زینت بھی ہوتے ہیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے ۔ (یعنی اس زمانہ کے عرب اَلْاَنْعَامُ سے یہ کام لیا کرتے تھے) ۔ اَلْاَنْعَامُ میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، سب کھانے کے لئے حلال ہیں ۔ خنزیر، چرنے چگنے والا حیوان ہے اس لئے بھیمۃ الانعام میں شامل ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ح ۔ ر ۔ م)۔

# نَعَمْ (حرف)

نَعَمْ ۔ ہاں ۔ قَالُوْا نَعَمْ ($\frac{7}{44}$) ۔ انہوں نے کہا ۔ ہاں (ایسا ہی ہوا ہے) ۔ یہ حرف ایجاب ہے ۔

[نِعْمَ اور نَعِمَّا عنوان، ن ۔ ع ۔ م میں دیکھئے] ۔

# ن غ ض

نَغَضَ الشَّیْءُ یَنْغُضُہٗ ۔ کسی چیز کو متحرک کیا ۔ نَغَضَ الشَّیْءُ ۔ کوئی چیز متحرک و مضطرب ہوئی ۔ (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے) ۔ نَغَضَ رَاْسَہٗ ۔ اس نے اپنے سر کو حرکت دی ۔ اخفش نے کہا ہے کہ تھرتھراہٹ کے ساتھ ہلنے کو نَغْضٌ کہتے ہیں ۔ نَغْضٌ شتر مرغ کو کہتے ہیں کیونکہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا سر بہت ہلتا ہے* ۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے ۔ اَنْغَضَ رَاْسَہٗ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کی بات سن کر اس سے انکار کرتے ہوئے اپنا سر ہلا دے ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تعجب سے یا کسی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے سر ہلانے کو کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْکَ رُءُوْسَھُمْ ($\frac{17}{51}$) ۔ یہ تیری بات کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو تیرے سامنے ہلا دینگے ۔ تعجب کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلا دینگے ۔

# ن ف ث

نَفَثَ ۔ یَنْفُثُ ۔ پھونک مارنا ۔ اسطرح آہستہ سے پھونک مارنا کہ اسکے ساتھ لعاب دھن باہر نہ نکلے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ، منہ

---

*تاج و راغب ۔

وغیرہ سے کسی معمولی سی چیز کے ، ھلکی سی آواز کے ساتھ نکلنے کے لئے بولا جاتا ھے ۔ اگر اس سے کچھ زیادہ ھو جائے تو اسے تَفْل* کہینگے۔ اسی سے نَفَثَ الشَّیْءَ فِی الْقَلْبِ کسی بات کو ھولے سے کسی کے دل میں ڈال دینے کو بھی کہتے ھیں ۔ کسی کے کان میں کچھ پھونک دینا ۔ اِمْرَأَۃٌ نَفَّاثَۃٌ* ۔ جادوگرنی کو کہتے ھیں جو گرھوں میں پھونکیں مار مار کر تعویذ گنڈے تیار کرتی ھے**۔ نَفْثٌ* ۔ پھونک مارنا ۔ جادو کرنا ۔ دل میں کوئی بات ڈالنا**۔

قرآن کریم میں مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) آیا ھے ۔ عُقَد* کے معنی ھیں پختہ گرھیں ۔ لہذا نَفّٰثٰت* کے معنی ھوئے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی سے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیں ۔ جو محکم ارادوں میں پھونک مار دیں ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ھے کہ اس سے مراد وہ قومیں یا جماعتیں ھیں جو اپنے جھوٹے پراپیگنڈہ سے انسانوں کی فطری ترقی کو روک دیتی ھیں ۔ انھوں نے یہ بھی کہا ھے کہ اس قسم کے عمل کو جس سے دوسرا کمزور پڑ جائے ، عرب سحر یا جادو کہتے تھے***۔

## ن ف ح

نَفْح* کے بنیادی معنی کسی چیز کے چل پڑنے یا اٹھانے کے ھیں ۔ (ابن فارس) ۔ نَفَحَ الطِّیْبُ یَنْفَحُ ۔ خوشبو پھیلی ۔ نَفَحَتِ الرِّیْحُ ۔ ھوا چلی ۔ رِیْحٌ نَفُوْحٌ* ۔ تیز چلنے والی ھوا ۔ نَفْح* ۔ ھر ٹھنڈی ھوا کو کہتے ھیں ۔ اور لَفْح* گرم ھوا کو۔

اَلنَّفْحَۃُ مِنَ الرِّیْحِ ۔ ھوا کا جھونکا۔ نَفْحَۃُ الدَّمِ ۔ خون جو پہلی بار یکبارگی تیزی سے نکل پڑے*۔ قرآن کریم میں نَفْحَۃٌ* مِنَ الْعَذَابِ (۲۱/۴۶) آیا ھے ۔ یعنی عذاب خداوندی کی ایک لپٹ ۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ۔ عذاب کی جھلک ۔

## ن ف خ

نَفَخَ ۔ یَنْفُخُ ۔ منہ سے ھوا نکالنا ۔ پھونک مارنا ۔ جیسے نَفَخَ فِی النَّارِ ۔ اس نے آگ میں پھونک ماری****۔ سورہ کہف میں ھے اُنْفُخُوْا (۱۸/۹۶) ۔ اسے دھونکو۔

*تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ ***المقام المحمود صفحہ ۲۱۲
****تاج و محیط ۔

إِنْتَفَخَ الشَّيْءُ- چیز پھول گئی* - اِنْتَفَخَ النَّهَارُ - دن چڑھ گیا** - اَلنِّفْخَاءُ مِنَ الْاَرْضِ - بلند زمین - اَلنُّفَّاخَةُ - وہ پتھر جو پانی کی سطح سے اونچے ہوں - نیز بلبلے* - ابن فارس نے اس مادہ کے معنی پھولنے اور بلند ہونے کے لکھے ہیں -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں متعدد مقامات پر نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ($\frac{32}{9}$) یا نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ($\frac{15}{29}$) کے الفاظ آئے ہیں - جیسا کہ رُوْح کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے، رُوْح سے مراد الوہیاتی توانائی (اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوت - انسانی ذات یا Personality ) ہے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ملی ہے - اس لئے نَفْخِ رُوْح سے مراد ہوا کی طرح کچھ پھونکنا نہیں بلکہ انسانی قوتوں اور توانائیوں کا عطا کرنا ہے جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں - یہی وہ چیز ہے جسکی طرف سورہ آل عمران میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں حضرت عیسٰی ؑ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ہو جائیگی - جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ہوجائینگی - اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ - فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ($\frac{3}{48}$) - میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے - میں تم میں ایسی روح پھونکونگا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ہو جائینگی - اقبال کے الفاظ میں -

اگر یک قطرہ خون داری اگر مشت پرے داری
بیامن باتو آموزم طریق شاہبازی را

قرآن کریم میں نَفْخِ صُوْر کا بھی ذکر کئی جگہ آیا ہے - جیسا کہ (ص - و - ر) کے عنوان میں لکھا جاچکا ہے، اس کے معنی وہ نرسنگھا (بگل) بھی ہیں جسے اعلان جنگ کے لئے بجایا جاتا تھا - اور یہ لفظ صورت (Form) کی جمع بھی ہے - اول الذکر مفہوم کے اعتبار سے نَفْخِ صُوْر کے معنی ہونگے حق و باطل کے درمیان اعلان جنگ - اور ثانی الذکر مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی ہونگے حیات تازہ عطا کرنا - نئی توانائیاں بخشنا، جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں ($\frac{69}{13}$) - ( دیکھئے عنوان ص - و - ر ) -

---

*تاج و محیط - **راغب -

# ن ف د

نَفِدَ الشَّيْءُ يَنْفَدُ نَفَادًا ۔ چیز کا فنا ہو جانا ۔ جاتے رہنا ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں فاءکلمہ نون ہو اور عین کلمہ فاء۔ تو ان الفاظ کے معنی جاتے رہنے اور نکل جانے کے ہونگے**۔ (مثلاً نَفِدَ ۔ نَفَذَ ۔ نَفَرَ۔ نَفَشَ ۔ نَفَضَ نَفَقَ وغیرہ)۔

اَنْفَدَ الْقَوْمُ ۔ لوگوں کا توشہ اور مال ختم ہو گیا * ۔ قرآن کریم میں ہے مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (۱٦/۹٦) ۔ جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے ۔ اسی بَاقٍ کی تفسیر دوسری جگہ مَالَهٗ مِنْ نَفَادٍ (۳۸/۵۴) سے کر دی یعنی جو ختم ہی نہ ہو۔

# ن ف ذ

اَلنَّفَاذُ ۔ کسی چیز کے آر پار ہوجانا ۔ جیسے تیر کا نشانے میں ایک طرف سے گھس کر اس کے دوسری طرف سے باہر نکل جانا (خواہ وہ ذرا سا بھی باہر کیوں نہ نکل جائے) ۔ طَعْنَةٌ نَافِذَةٌ ۔ نیزے کی ایسی مار کو کہتے ہیں جو آر پار ہو جائے***۔

اَنْفَذَ الْقَوْمَ کے معنے ہیں وہ (پیچھے سے چل کر اس گروہ میں شامل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا) انہیں پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل گیا ۔ اَلنَّافِذَةُ ۔ کمرے کا سوراخ یا روشندان جس سے روشنی اندر آتی ہو۔ نَفَذَ الشَّيْءَ ۔ اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز میں سے گزر جانا ہیں ۔

قرآن کریم میں ایک عظیم آیت ہے جس سے انسانی ارتقاء کے ممکنات پر روشنی پڑتی ہے ۔ سورۃ رحمٰن میں ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۔ اے گروہ جن و انس ا (یعنی وہ انسان جو شہروں کے رہنے والے ہوں یا صحرا نشین)۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۔ اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ آسمان و زمین (یعنی اس مادی کائنات) کے کناروں کو چیر کر آگے نکل جاؤ ، تو نکل جاؤ ۔ لیکن یہ

---

*تاج و راغب ۔ **فعل ۔ تینوں حرفوں سے ملکر بنا ہے ۔ اس میں پہلا حرف فا کلمہ، دوسرا ع کلمہ ۔ اور تیسرا ل کلمہ ہے ۔ ’’فا کلمہ ن ہو‘‘ کے معنی ہیں پہلا حرف ن ہو ۔ اور ’’ع کلمہ فا‘‘ کے معنی ہیں دوسرا حرف فا (ف) ہو جیسے لفظ ۔

*** تاج و راغب و محیط ۔

یاد رکھو کہ ۔ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵/۳۳)۔ تم سُلْطَانٌ۔ (قدرت و غلبہ) کے بغیر نہیں نکل سکو گے ۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے حدود سے باہر چلا جائے۔ لیکن اس کے لئے اسے ایک خاص قوت کی ضرورت ہوگی جو مادی موانعات پر غالب آسکے ۔ یہ قوت وحی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے (اس لئے قرآن کریم نے خود وحی کو سُلْطَانٌ کہا ہے ۔ دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ ط) ۔ یعنی وحی کے اتباع سے انسانی ذات میں ایسی نشو و نما آسکتی ہے کہ وہ مادی چاردیواری سے آگے نکل کر زندگی کے دیگر مراحل طے کرنے اور حیاتِ جاوید حاصل کرنے کے قابل ہو جائے ۔ حیوانی سطح پر زندگی محض آب و گل کی طبعی زندگی ہوتی ہے لیکن انسانی سطح ( یعنی مومن کی سطح ) پر اس میں حیات جاوید کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی کا نام وہ سُلْطَانٌ ہے جس سے زندگی آب و گل کی چاردیواری سے نکل کر آگے جاسکتی ہے ۔ یاد رکھئے۔ مادی کائنات سے باہر نکلنے سے مراد انسان کے جسم کی پرواز نہیں ۔ اس سے مراد اس کی ذات (Personality) کا ارتقاء ہے ۔ جسمانی پرواز سے انسان جتنا اونچا جی چاہے اڑ جائے ، وہ بہر حال مادی کائنات کی چاردیواری کے اندر ہی رہے گا۔ مادی کائنات سے آگے نکل جانا انسانی ذات ہی کے لئے ممکن ہے ۔ یعنی موت کے بعد حیات جاوداں حاصل کرنا ۔ اس زندگی میں انسان کے لئے مادی کائنات کے حدود سے باہر نکل جانا ناممکن ہے ۔ یہ چیز مرنے کے بعد ، اگلی زندگی ہی میں حاصل ہو سکتی ہے ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ''روحانی قوت'' سے مادی کائنات کے حدود سے باہر چلے جاتے ہیں ، وہ محض اپنے خیالات کی رو سے ایسا سمجھتے ہیں ۔ اپنے تخیل میں آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اس کے لئے کسی قوت (سلطان) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم کی رو سے انسان مادی کائنات سے باہر مرنے کے بعد ہی جاسکتا ہے۔ اُسی زندگی میں پہنچکر اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو سکتی ہے ۔

## ن ف ر

اَلنَّفْرُ ۔ بے قرار ہونا اور اپنی جگہ سے اٹھ جانا ، ہٹ جانا* ۔ جدا ہو جانا** ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی الگ ہو جانا اور دور ہوجانا بتائے ہیں ۔ کسی چیز سے بے رخی برتنا اور اس سے الگ ہونا ۔ نَفَرَ اِلَى الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف تیزی سے جانا** ۔ نَفَرَتِ الدَّابَّةُ و

*راغب ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

اِسْتَنْفَرَتْ ۔ جانور کا کسی سے گھبرانا اور دور چلے جانا ۔ نَفَّرْتُهٗ ۔ اِسْتَنْفَرْتُهٗ ۔ میں نے اسے متوحش کر دیا اور بھگا دیا ۔ مُسْتَنْفِرٌ ۔ متوحش ہو کر بھاگ جانے والا * ۔ قرآن مجید میں ہے حُمُرٌ مُسْتَنْفِرَةٌ (۷۴/۵۰) ۔ بدکنے والے گدھے ۔ اِنْفِرُوْا لِلْاَمْرِ ۔ وہ اس معاملہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے * (۹/۴۱) ۔ اَلنَّفَرُ (۱۸/۳۴) ۔ وہ جتھا یا گروہ جو کسی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو ۔ نَفِیْرٌ بھی اسی معنی میں ہے ** (۱۷/۶) ۔ نُفُوْرٌ ۔ گھبرا کر بھاگنا ۔ نفرت کرنا (۲۵/۶۰) ۔ اَلْمُنَافَرَةُ ۔ مفاخرت (اس لئے کہ لوگ اَيُّنَا اَعَزُّ نَفَرًا کہا کرتے تھے)* ۔

# ن ف س

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَفْسٌ کے بہت سے معنی ہیں ۔ منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے ۔ نیز وہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس کی قوت) پیدا ہوتی ہے ۔ عقل ۔ علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے*** ۔ اور عَيْنُ الشَّيْءِ کے معنوں میں بھی ۔ جیسے جَاءَنِي الْمَلِكُ بِنَفْسِهٖ ۔ بادشاہ میرے پاس بنفس نفیس آیا ۔ نیز عظمت اور بڑائی ، ہمت ، غیرت ، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی ۔ نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں *** ۔ اسکے علاوہ خون کے معنوں میں بھی ۔ چنانچہ نِفَاسٌ اُس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے *** ۔ خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ نَفَسٌ ۔ سانس کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں ۔ نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں ۔ ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ اور طویل چیز کو بھی ۔ نَفِيْسٌ مال کثیر کو کہتے ہیں اور شَيْءٌ نَفِيْسٌ وہ عمدہ چیز جسکی طرف انسان لپک کر جائے ۔ تَنَفَّسَ کے معنے ہیں سانس لینا ۔ نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا واضح اور روشن ہو جانا (۸۱/۱۸) ۔ نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں (۸۳/۲۶) *** ۔

نیز اس کے معنی عِنْدِيْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں ۔ تاج العروس نے اسکی مثال کے لئے سورہ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب)

*تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج و ابن فارس ۔ ***تاج و لسان العرب ۔

جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (پاس) ہے میں اسے نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں۔ مثلاً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۳/۲۸)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانون مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے*۔

اَنْفُسٌ کے معنی بھائی بند بھی ہیں (۲/۸۴) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۴۴)۔ اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (Yourself) یا (Himself) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس "شے" کے لئے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human Personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I-am -ness) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصورات حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (Physical life) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخرالامر مرجاتا ہے۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ عصر حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریہ حیات (Materialistic Concept of life) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر "مغربی تہذیب" کہا جاتا ہے وہ اسی نظریہ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کرینگے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے

*تاج و لسان العرب۔

انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا ۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے ، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم نہیں ہی کرتا ۔ ( دیکھئے مثلاً ۲۹/۶۱-۶۳ ؛ ۲۳/۸۳-۸۸ ؛ ۳۱/۲۵ ؛ ۳۹/۳۸ ؛ ۴۳/۹) ۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبیعی زندگی کا نام ہے ۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے ۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے ، یا زیادہ سے زیادہ ، جسے معاشرہ ( سوسائٹی ) اچھا کہدے ۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے ، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے ۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا ۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے ، اور بس ۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے ۔ سورہ الجاثیہ میں ہے ۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ ۔ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے ۔ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے ، اسکی صحیح راستے کی طرف ، بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے ۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھکر نصیحت حاصل نہیں کرتے ۔ یہ وہ لوگ ہیں وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ ہم ( قوانین طبیعی کے مطابق ) مرتے ہیں اور جیتے ہیں ۔ اور مرور زمانہ ( وقت ) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے ۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) انہیں حقیقت حال کا کچھ علم نہیں ہوتا ۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیکر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں ۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے ۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) ۔

جو لوگ ( بلند سطح زندگی سے ) انکار کرتے ھیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زیست سے فائدے اٹھاتے ( اور پھر مر جاتے ) ھیں ۔

اس کے برعکس ، دوسرا تصور زندگی یہ ھے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں ۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور '' شے '' بھی ھے جسے اس کی ذات ، یا نَفْس کہتے ھیں ۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ھوتی ۔ نہ ھی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ھو جاتا ھے ۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رھتا ھے ۔ اگر اسکی مناسب نشو و نما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ھوتی ھے اور مرنے کے بعد ، وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ھو جاتا ھے ۔ انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین کی رو سے ھوتی ھے جو خدا کیطرف سے ، حضرات انبیاء کرام ؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ھیں ( اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ھیں ) ۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر '' ایمان '' اور خدا ، وحی ، نبوت اور آخرت پر ایمان کسطرح لازم و ملزوم ھیں ۔

'' انسانی ذات کیا ھے '' ۔ یہ نہ بتایا جا سکتا ھے نہ سمجھا جا سکتا ھے ۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں ۔ انسانی ذات کا مظاھرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ھوتا ھے ۔ اس لئے ھم یوں کہہ سکتے ھیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی '' شے '' ھے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ھے ۔ اختیار و ارادہ ( بصورت مطلق اور کُلّی طور پر ) خدا کو حاصل ھے اور اس کا عطا کردہ ، ( محدود شکل میں ) انسان کو حاصل ھے ۔ اس کے سوا ، کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ۔ اسی لئے اسے خدا نے '' روحنا '' کہہ کر پکارا ھے ۔ یعنی الوھیاتی توانائی (Divine energy) ( دیکھئے عنوان ر ۔ و ۔ ح ) ۔ اگر انسان ، قوانین خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں ( حد بشریت کے اندر ) صفاتِ خداوندی منعکس ھوتی جاتی ھیں ۔ اسی کو اسکی ذات کا نشو و نما کہتے ھیں ۔ واضح رھے کہ انسانی ذات ، ذات خداوندی کا جزو نہیں ۔ ذات ( وہ خدا کی ھو یا انسان کی ) ایک غیر منقسم وحدت ( Indivisible whole ) ھوتی ھے جس کے حصے بخرے ھو نہیں سکتے ۔

چونکہ انسان کے ھر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ھوتی ھے ، اس لئے اس کے ھر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ھوتا ھے ۔ حتکہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (۴۰/۱۹) ۔ یہی اس کا '' اعمالنامہ '' ھے جو اسکی گردن میں لٹکا رھتا ھے ۔ (۱۷/۱۳) ۔ اسی کو وہ ظہور

نتائج کے وقت پڑھیگا ۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۴/۱۷) ۔ ”تو آج اپنی کتاب پڑھ ۔ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے“ ۔ (نیز ۲۵/۱۳۰۱۵) ۔ اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (Individuality) ثبت ہوتی ہے (۶/۹۵ ؛ ۱۹/۵۹) ۔ یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا ۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) ۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے ۔ (۶/۱۰۵ ؛ ۱۰/۱۰۸ ؛ ۱۷/۷ ؛ ۱۷/۱۵ ؛ ۲۷/۹۲ ؛ ۲۹/۹ ؛ ۳۰/۴۴ ؛ ۳۱/۱۲ ؛ ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۴۱ ؛ ۴۱/۴۶ ؛ ۴۵/۱۵ ۔ نیز ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۷ ؛ ۵۳/۳۸) ۔ جب اتباع قوانین خداوندی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں ۔ لیکن جس ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے ۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے ۔ [ دیکھئے عنوانات (ج ۔ ن ۔ ن) ؛ (ج ۔ ح ۔ م) ؛ (جهنم) ] ۔ یوں تو انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بنکر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے ۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے ۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشو و نما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیں ۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۔ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ (۹۲/۱۸) ۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) اپنی نشو و نما کے لئے دیتا ہے ۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو ”دیتا ہے“ ۔ مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ (۹۲/۶) ”جو دیتا ہے اور (اسطرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے“ ۔ (نیز دیکھئے (۵۹/۹ ؛ ۶۴/۱۶)) ۔

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد، یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر ۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے ۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher Values) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے، تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اسکی نشو و نما ہوتی ہے) ۔ اور

جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو ، پست مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے ۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں ۔ ایغو ، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات ، انسانی سطحِ زندگی پر ۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں ''ھویٰ'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے ۔ (اس مادہ میں ''پستی'' کا مفہوم ہوتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ھ ۔ و ۔ ی) ۔ اور جب عقل ( Intellect ) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے ۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل ، انسانی ذات کے تابعِ فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے ۔ (اقبال اول الذکر عقل کو ، عقلِ خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں ، یا خرد ''ادب خوردہ دل'' کہہکر پکارتا ہے) ۔

جب ایغو ، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر ، پست مفاد کیطرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے ۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے ، عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ ( ۱۲/۵۳ ) ۔ یقیناً نفس ، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے ۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا ۔ بالکل نہیں ۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے ۔ چنانچہ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ( ۱۲/۵۳ ) ۔ بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو ۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے ''انسانی ذات'' سے تعبیر کیا ہے ۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساس ندامت بیدار ہو جاتا ہے ۔ یہ درحقیقت ، ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے ۔ اسے قرآن کریم نے نفس لوّامہ کہا ہے (۷۵/۲) ۔ یعنی ''ملامت کرنے والا نفس'' ۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کرسکے ۔ خیر و شر کی تمیز صرف وحی کی رُو سے ہو سکتی ہے ۔ نفس لوامہ اُسی بات پر ملامت کریگا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو ، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت ممدوح ہو ۔ [تفصیل اس اجمال کی (ل ۔ ھ ۔ م) اور (ف ۔ ط ۔ ر) کے عنوانات میں ملیگی] ۔

جب انسان ، خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے ، تو ابغو اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے ۔ ذات، پست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے ۔ ( ۳۹/۲۹ ) ۔ اسے قرآنِ کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے ( ۸۹/۲۷ ) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے ( ۸۹/۲۹ ) ۔ اسے ، عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا ۔ اس کے برعکس ( Disintegrated Personality ) ہوگی ۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ( ۹۱/۸-۹ ) سے تعبیر کیا ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ہ ۔ م)۔ اور ذات کی نشو و نما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے ( ۹۱/۱۰ ) ۔

چونکہ انسانی ذات ، امکانی شکل ( Realiseable Form ) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے ، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم ، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے ۔ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ( ۱۷/۷۰ )۔ ”ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے“ ۔ ذات کی تکریم کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے ۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا ، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کردینا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے اطاعت یا محکومی ، صرف قوانین خداوندی کی ہوسکتی ہے ۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ب ۔ د) ۔ یہ اطاعت ، کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا ۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے ۔ (اطاعت کے معنے ہی بطیب خاطر ، برضا و رغبت ، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ( ۲/۲۸۶ ) سے یہی مراد ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد ، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا ۔ [دیکھئے عنوان ک ۔ ل ۔ ف] ۔ قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی ۔ خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشو و نما کبھی نہیں ہوسکتی ۔ جنت کے لئے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ( ۸۹/۲۹ ) پہلی شرط ہے ۔

سورۃ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۴۲/۳۹) ''اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے - پھر جن پر موت کا حکم ہوجاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیجدیتا ہے'' - سوال یہ ہے کہ اس آیت میں ''نفس'' سے کیامطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے ، لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا - جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے ، بجزشعور (Consciousness) کے - (حتکہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) - اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں ''نفس'' سے مراد اسکی شعوری حالت ہے - یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں انسان کا شعورباقی نہیں رہتا - سونے والا جب جاگ اٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر رو بہ عمل ہوجاتا ہے ، لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے - موت کے بعد ، شعور کے رو بہ عمل ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں - اس زندگی میں شعور ( یا نفس ) کس طور پر رو بہ عمل ہوتا ہے ، ہم اپنےشعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے - اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے رو بہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے - اور وہ ہے ہمارا مادی جسم - ہم اس وقت ، جسم کے توسط کے بغیر ، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کرسکتے - قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا - نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا - اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے - لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے - اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے -

## ن ف ش

نَفَشٌ - اون یا روئی وغیرہ کو انگلیوں سے پراگندہ کرنا - ( لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے) - بعض نے کہا ہے کہ نَفَشٌ - ہر اس چیز کے منتشر ہو جانے کو کہتے ہیں جسکا منتشر ہو جانا مشکل نہ ہو - جیسے روئی - اون وغیرہ* - قرآن کریم میں اَلْعِہْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱/۵) آیا ہے - یعنی

*تاج و راغب و محیط -

دھنی ہوئی (منتشر شدہ) رنگین اون ۔ (ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ہونا لکھے ہیں ۔

ابن السکیت نے کہا ہے کہ نَفْشٌ کے معنی ہیں رات کے وقت بکریوں یا اونٹوں کا چرواہے کے علم کے بغیر ادھر اُدھر منتشر ہو کر چرنا ۔ (نَفْشٌ میں رات کے وقت ایسا ہونے کی تخصیص ہے ۔ ھَمْلٌ میں رات یا دن کی تخصیص نہیں ہوتی ) ۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ نَفَشَتْ فِیْہِ غَنَمُ الْقَوْمِ (۲۱/۷۸) جب لوگوں کی بکریاں اس میں رات کے وقت چرتے ہوئے منتشر ہو گئیں ۔

## ن ف ع

اَلنَّفْعُ ۔ ضُرٌّ و ضَرٌّ ( نقصان ) کی ضد ہے ۔ لیکن درحقیقت نَفْعٌ اس ذریعے کو کہتے ہیں جس سے کسی خوشگواری ( خیر ) تک پہنچا جائے ۔ چنانچہ اَلنَّفْعَۃُ ۔ لاٹھی کو کہتے ہیں**۔ چرواہوں کی لاٹھی جسطرح ''خیر'' تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہے وہ ظاہر ہے ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ضرر کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۱۰۲) ۔ اور اِثْمٌ کے مقابلہ میں (۲/۲۱۹) بھی ۔ لہذا ضَرَرٌ کی طرح نَفْعٌ بھی خارجی اور داخلی دونوں حالتوں کی خوشگواری کے لئے آئے گا ۔ (مَنَافِعُ ( واحد مَنْفَعَۃٌ ) ۔ فوائد ۔ کام کی چیزیں ۔ (۲/۲۱۹) ۔

## ن ف ق

نَفَقٌ ۔ اس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے داخل ہونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ہوں ۔ (جس سرنگ میں نکلنے کا راستہ نہ ہو اسے سَرَبٌ کہتے ہیں ) ۔ اَلنَّافِقَۃُ ۔ و اَلنَّافِقَاءُ ۔ جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ہیں جس پر وہ مٹی کی باریک سی پپڑی بچھا کر اسے بند رکھتا ہے اور اسے اس وقت سر مار کر کھول لیتا ہے جب اس کا کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے ۔ نَیْفَقٌ اس نیفہ کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے کھلے ہوں ۔ ( بعض کا خیال ہے کہ یہ نیفہ سے معرب ہے ) ۔ اسی لئے مُنَافِقٌ اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی نظام ( یا سوسائیٹی ) میں داخل ہونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے ۔ نَفَقَتِ السُّوْقُ ۔ بازار گرم ہوا ، اوراس کے سامان کی مانگ ہوئی ۔ ( یعنی جو اشیاء کی درآمد اور برآمد کے لئے ہر وقت

*تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج ۔

کھلا رہے ۔ ہر وقت مال آتا رہے اور اس کا نکاس ہوتا رہے ۔) لہذا اِنْفَاق* کے معنی ہیں اپنی دولت کو کھلا رکھنا ۔ عام کر دینا ۔ باقی نہ رکھنا ۔ ختم کر دینا *۔ قرآن کریم نے اس کے مقابل میں اِمْسَاک* (روک رکھنے) کا لفظ لا کر اس کے معانی کو واضح کر دیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔

چونکہ روپے کو کھلا رکھنے کا نتیجہ سرمایہ کی نفی (ختم ہو جانا) یا کمی ہوتا ہے ، اس لئے نَفَاق* کے معنی کسی چیز کے کم ہو جانے یا ختم ہو جانے کے بھی لئے جانے لگے*۔ یہاں تک کہ ان معانی کو بنیادی معنی کی سی اہمیت حاصل ہو گئی ۔ چنانچہ اَنْفَقَتِ الْاِبِلُ* اُسوقت کہتے ہیں جب موٹاپے کی وجہ سے اونٹوں کی اون جھڑ جائے ۔ یعنی منتشر اور پراگندہ ہو کر ضائع ہو جائے*۔

قرآن کریم میں اِنْفَاق* کے بنیادی معنی اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھنا ہیں ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت (ربوبیت عامہ کے لئے) کھلا رکھیں ۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب ۔ یعنی فاضلہ دولت (Surplus money) جو سرمایہ داری کی بنیاد ہے ، سب کی سب ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہونی چاہئے ۔ یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی ۔

یہ قرآنی نظام کا بنیادی نقطہ ہے ۔ مومن کی ہمیانی کے دونوں سرے کھلے رہتے ہیں اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے ۔ اس میں ہر فرد اپنی محنت کا ماحصل ڈالتا جاتا ہے اور نظام ربوبیت اسے نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے صرف کرتا جاتا ہے ۔ چونکہ اس نظام میں ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے اس لئے کسی فرد کو کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ رہتا ہے ۔ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے ۔

بناء بریں ان مقامات میں اِنْفَاق* کے معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا رکھنا زیادہ مناسب ہیں ۔ ''کھلا رکھنے'' کا مطلب ہوگا نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں رکھنا ۔ نَفَقَة* (۹/۱۲۱) ۔ ہر وہ چیز جسے اسطرح کھلا رکھا جائے ۔ بعض مقامات میں اس کے معنی خرچ کرنے کے بھی آئینگے ۔

---

*تاج و ابن فارس ۔

نَافَقَ - منافق ہونا (۳/۱۶۶) - معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں - ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہو جاتے ہیں - یہ مومن ہیں - دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں - انہیں کافر کہئے - تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لئے جماعت مومنین کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں - منافع میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہوا، تو یا جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے ، اور یا اس میں بد دلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے - یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق - اسی لئے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے (۴/۱۴۵) - قرآن کریم نے (سورہ فاتحہ کے بعد) سب سے پہلے انہی تینوں جماعتوں (مومن - کافر - منافق) کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے - اس کے بعد ، سارے قرآن کریم میں ان تین جماعتوں کا ذکر ہے - یہ جماعتیں زمانہ نزول قرآن تک محدود نہ تھیں - یہ ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہینگی - ان کی خصوصیات اسقدر طول طویل ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں -

## ن ف ل

اَلنَّفْلُ - ہر وہ عمل جو (واجب) سے زیادہ ہو - اَلنَّفَلُ - مالِ غنیمت - ہبہ - عطیہ - دونوں کی جمع اَنْفَالٌ آتی ہے - نَفْلٌ کے معنوں میں نَافِلَۃٌ بھی آتا ہے - قرآن کریم میں ہے - وَ مِنَ اللَّیْلِ فَتَہَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ (۱۷/۷۹) - تو رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کو) لے کر اٹھ - یہ تیرے لئے "نفل" کے طور پر ہے - اَلنَّافِلَۃُ - پوتا - کیونکہ بیٹا تو اصل ہوتا ہے اور پوتا اس پر زائد ہوتا ہے (۲۱/۷۲) -

اَنْفَالٌ (۸/۱) - بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے مالِ غنیمت کے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مالِ غنیمت سے الگ (اور خاص) ہوتی ہے - عام طور پر اس کے معنے مالِ غنیمت یا ہبہ یا عطیہ کے لئے جاتے ہیں* - لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسے جنگ کے ساتھ مختص کر دینے کی ضرورت نہیں - اس سے مراد مملکت کی وہ تمام آمدنی ہو سکتی ہے جو متعین کردہ واجبات کے علاوہ ہو -

اَلنَّوْفَلُ - دریا - سمندر - عطیہ - بہت عطا کرنے والا آدمی** -

---

*تاج - **محیط -

نَفَلَ فُلاَناً ۔ فلاں کو عطیہ کے طور پر کچھ دیا جس کے معاوضے کا وہ خواہاں نہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عطیہ اور عطا کرنا ہیں ۔

# ن ف ی

نَفَیٰ ۔ یَنْفِیْ ۔ نَفْیًا ۔ ایک طرف کردینا ۔ نکال دینا ۔ الگ کردینا ۔ دور کردینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دینے یا دور کردینے کے ہیں ۔ اَلنَّفِیُّ ۔ وہ اُبال جو ہانڈی باہر پھینک دے ۔ وہ کنکریاں وغیرہ جو جانوروں کے ٹھوکر لگنے سے ادھر ادھر اُڑتی ہیں ۔ وہ مٹی جسے ہوا درختوں کی جڑوں میں لا کر پھینک دیتی ہے ۔ بڑے لشکر سے جو حصہ کٹ کر الگ ہو جائے اور ایک طرف کو رہ جائے ۔ نَفَیٰ شَعْرُ فُلاَنٍ ۔ فلاں آدمی کے بال پریشان اور پراگندہ ہوگئے ۔ یا گرگئے ۔ نَفَی السَّیْلُ الْغُثَاءَ ۔ سیلاب کوڑا کرکٹ بہا کر لے گیا ۔ اسی سے نَفَیٰ کے معنی انکار کردینے کے آتے ہیں ۔ نَفَی الْاَبُ الْاِبْنَ ۔ باپ نے بیٹے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا* ۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کے متعلق جو نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں اور نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں کہا گیا ہے کہ انہیں قتل کر دو ۔ یا سولی چڑھا دو ۔ یا ''قطع ید و رجل'' کردو ۔ (دیکھو عنوان ق ۔ ط ۔ ع) ۔ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ( ۵/۳۳ ) ۔ نَفْیٌ کے ان معانی کے لحاظ سے جو اوپر درج کئے گئے ہیں اس کے معنی ہونگے ملک سے الگ کردینا ۔ جلاوطن کردینا ۔ صاحب محیط نے نَفَیٰ فُلاَناً کے معنی فلاں کو قید کردیا بھی لکھے ہیں* ۔ لیکن مندرجہ بالا آیت میں مِنَ الْاَرْضِ کے اضافہ سے ظاہر ہے کہ اس کے معنے ملک بدر کردینے کے ہونگے یا یہ کہ اسے آزادی اور دیگر مراعات سے محروم کردیا جائے ۔ (اس طرح زمین سے الگ کردینے کا مفہوم ہوگا اسے باقی آبادی سے الگ کردینا) ۔

# ن ق ب

نَقْبٌ ۔ (دیوار میں) سوراخ کرنے کو کہتے ہیں ۔ اور خود سوراخ کو بھی* ۔ سورۃ کہف میں ہے وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَہٗ نَقْبًا ( ۱۸/۹۷ ) ۔ وہ اس دیوار میں سوراخ نہیں کرسکتے تھے ۔ تَنَقَّبَ عَنِ الشَّیْئِ کے معنی

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ہیں کسی چیز کی تلاش میں بہت زیادہ کوشش کرنا - مارے مارے پھرنا**-
سورۃ قٓ میں ہے - فَنَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ (۵۰/۳۶) - انہوں نے شہروں کو
چھان مارا کہ کوئی پناہ کی جگہ مل جائے - ابن فارس نے کہا ہے کہ نَقَّبَ
کے معنی ہیں نُقُوْبٌ (پہاڑوں کے تنگ راستوں یا دروں) میں چلنا - اَلنَّقِیْبُ
بانسری (کیونکہ اس میں چھید ہوتے ہیں) - اَلنَّقِیْبُ کے معنی ہیں قوم
کا نگران - ضامن - سردار - لوگوں کے احوال معلوم کرنے والا - چھان بین کرنے
والا* - بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا
(۵/۱۲) - ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردئے -

اَلنَّقْبَةُ - سوراخ - چہرے کو بھی کہتے ہیں - غالباً اسی لئے کہ اس میں
کئی سوراخ ہیں - اور اَلنِّقَابُ - اس کپڑے کو جس سے عورت اپنے چہرے کو
چھپاتی ہے - اَلنِّقَابُ کے متعلق ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ معنی خلاف
قیاس ہیں - اَلْمَنْقَبَةُ - قابل فخر بات - بلند کارنامہ - خوبی - اچھی خصلت* -

# ن ق ذ

نَقَذَهٗ و اَنْقَذَهٗ و اسْتَنْقَذَهٗ - اسے چھڑانا، چھٹکارا دلانا ، نجات
دلانا - نَقَذَ الرَّجُلُ - آدمی نے نجات پائی اور سلامت رہا*** - راغب نے
لکھا ہے کہ یہ کسی سخت مشکل اور مصیبت و تباہی سے رہائی حاصل ہونے
پر بولا جاتا ہے**** - لغزش کھانے اور پھسل کر گرنے والے کو بطور دعا نَقْذًا
لَكَ کہا جاتا ہے ، یعنی خدا تجھے سلامت رکھے - اَلنَّقِیْذَةُ اُس
گھوڑے کو کہتے ہیں جسے دشمن کے قبضہ سے چھڑا لیا جائے*** - قرآن کریم
میں ہے - فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا (۳/۱۰۲) ''اس نے تمہیں اس سے بچا لیا'' - نیز
(۳۶/۲۳ و ۳۹/۱۹) - سورۃ حج میں ہے لَا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (۲۲/۷۳) - ''وہ اسے
چھڑا نہیں سکتے'' -

# ن ق ر

نَقَرَهٗ نَقْرًا - اس کو مِنْقَار (سل راھنے کے آلہ) سے مارا -
اَلنَّقْرُ - چکی یا سل کو راھنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی
ہیں کسی چیز کو ٹھوکنا جس سے اس میں گڑھے پڑجائیں - پھر اس کے
معنوں میں وسعت ہوگئی - اَلْمِنْقَارُ - اس آلے کو کہتے ہیں جس سے سل وغیرہ
راھتے ہیں - نیز چونچ کو - چونکہ اس سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اس

*تاج - **محیط - ***تاج و محیط - ****راغب -

لئے آواز کے معنوں میں بھی یہ مادہ استعمال ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسی آواز جو زبان کو تالو سے چمٹا کر نکالی جائے اور اس سے گھوڑے کو ہانکا جائے۔ یا چٹکی کی آواز۔ اَلنَّقِیْرُ۔ سیٹی جیسی آواز*۔ لسان العرب میں ہے کہ نَاقُوْرٌ بگل کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴/۸)۔ جب سرکش قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے گا۔

اَلنُّقَارَۃُ۔ وہ ذرا سی چیز جسے پرندہ ایک مرتبہ اپنی چونچ میں اٹھالے*۔ اس سے اَلنَّقِیْرُ اس چھوٹے سے نقطہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے*۔ اس سے مراد ہوتی ہے بہت تھوڑی اور حقیر سی شے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ لَا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا (۴/۵۳)۔ ''لوگوں کو اتنا بھی نہیں دینگے جتنی اُڑد کے دانے پر سفیدی''۔

## ن ق ص

اَلنَّقْصُ۔ حصہ میں کمی ہونا۔ ابن القطاع نے لکھا ہے کہ نَقْصٌ کے معنی ہیں کسی چیز کے مکمل ہوجانے کے بعد اس میں سے کچھ جاتے رہنا۔ اور اَلنُّقْصَانُ اُس مقدار کو کہتے ہیں جو اس شے میں سے جاتی رہے۔ اَلنَّقِیْصَۃُ کے معنی عیب ہیں*۔ تَنَاقَصَ الشَّیْیُٔ۔ چیز آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی**۔ نَقَصَ۔ یَنْقُصُ۔ کم کیا۔ کم ہوا۔ (لازم اور متعدی دونوں کے لئے آتا ہے)۔

قرآن کریم میں ہے نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ (۲/۱۵۵)۔ مال میں کمی آجانا۔ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں اس جماعت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں اموال کا نقصان بھی ہے۔ لیکن اس نظام کے قیام کے بعد انہیں ہر طرح کی فراوانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی نظام کا نتیجہ لوگوں کے لئے رزق کی کمی ہو تو وہ نظام فرعونی ہے اور رزق کی کمی خدا کا عذاب، جیسا کہ (۷/۱۳۰) سے واضح ہے۔ کسی نظام کے قیام میں مشکلات اور مصائب کا سامنے آنا اور بات ہے اور اس کے نتائج کا نقصان دہ اور ضرر رساں ہونا اور بات۔ قرآنی نظام کے نتائج نہایت خوش گوار ہوتے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں مخالفین کی طرف سے پیش کردہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ان میں نقصِ مال بھی شامل ہے۔

## ن ق ض

نَقْضٌ* کے معنے ہیں ڈھا دینا۔ توڑ دینا۔ کھول دینا۔ عہد کرکے اسے توڑ دینا*۔ اَلنِّقْضُ۔ مسمار شدہ عمارت یا اس کا ملبہ۔ نیز وہ اونٹ جو

*تاج۔ **محیط۔

مسلسل چلنے سے لاغر ہو گیا ہو ۔ اَلنَّقِیْضُ ۔ آدمی کے جوڑوں کی آواز* ۔ اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴/۳) ۔ وہ بوجھ (ذمہ داری) جس نے تمہاری کمر توڑ دی تھی ۔ تَنَاقُضٌ ۔ توافق کی ضد ہے ۔ ایک دوسرے کی مخالفت ۔ یعنی جس میں ایک بات دوسری بات کو توڑ رہی ہو ۔

قرآن کریم میں نَقْضٌ کا لفظ عہد شکنی کے لئے عام طور پر آیا ہے (۲/۲۷ و ۱۶/۹۱) ۔ نیز نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۱۶/۹۲) کے معنی ہیں سوت کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے ۔ یا اس کے بل کھول دئے ۔

# ن ق ع

اَلنَّقْعُ ۔ عمدہ خالص مٹی والی زمین جس میں پانی اکٹھا ہو جائے ۔ کسی جگہ اکٹھا ہو جانے والا پانی ۔ اوپر اٹھنے والا غبار* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی سیال چیز کا اپنی جگہ ٹھہر جانا اور (۲) ایک قسم کی آواز ۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں ۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ۔ یعنی فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۱۰۰/۴) ۔ وہاں اسکے معنی گرد و غبار اڑانے ہی کے ہیں ۔ یعنی مجاہدین کے وہ گھوڑے جو گرد و غبار اڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں ۔

# ن ق م

اَلنَّقَمُ ۔ وسطِ طریق ۔ راستے کا درمیانی حصہ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دینا اور اسے معیوب بتانا ۔ اس اعتبار سے اِنْتِقَامٌ کے معنی ہونگے بری بات کو برا کہنا اور برائی کرنے والے کو برائی کا بدلہ دینا ۔ اَلنِّقْمَةُ ۔ جرم کی سزا دینا** ۔ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو ذُوانْتِقَامٍ (۳/۴) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج برآمد کرتے ہیں اور مجرموں کو سزا ملتی ہے ۔ ہمارے ہاں انتقام کا لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس لئے جب یہ لفظ اللہ کے لئے بولا جائے تو اس کا وہ مفہوم نہیں لینا چاہئے جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں ۔ اس کا مفہوم مکافات عمل ہے ۔ سورہ اعراف میں قوم فرعون کے متعلق ہے فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۷/۱۳۶) ۔ ہم نے انہیں ان کی غلط روش زندگی کا بدلہ دیا ۔ اسی طرح سورہ سجدہ میں ہے ۔ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲/۲۲) ۔ ہم مجرمین کو ان کے اعمال کا بدلہ

---

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

دیتے ہیں ۔ نَقَمَ کے معنی ہیں کسی بات کو ناپسند کرنا ۔ برا سمجھنا ۔ اعتراض کرنا (۵/۵۹) ۔ سورہ بروج میں ہے وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوا بِاللّٰهِ . . . . (۸۵/۸) ۔ اور یہ (کفار) ان (مومنین) کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہیں کہ یہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ، یعنی وہ ان کے ایمان لے آنے کو معیوب سمجھتے ہیں ۔

# ن ک ب

نَكَبَ عَنْهُ يَنْكُبُ و نَكِبَ يَنْكَبُ ۔ ہٹ جانا ۔ صحیح رخ پر نہ رہنا ۔ طَرِيْقٌ يَنْكُوْبٌ ۔ منزل مقصود سے ہٹا ہوا راستہ ۔ اَلنَّكْبَاءُ ۔ ہر وہ ہوا جو اپنے صحیح رخ سے ہٹ کر چلے*۔ (نیز ابن فارس)۔ قرآن کریم میں ہے عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ۔ وہ صحیح راستے سے ہٹے ہوئے ہیں ۔ اعراض برتتے ہیں ۔ اَلْمَنْكِبُ ۔ ہر چیز کا کنارہ نیز کندھا (کاندھا) ۔ مَنَاكِبُ الْاَرْضِ ۔ زمین کے اطراف و جوانب *۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا (۶۷/۱۵) ۔ اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو ۔ بعض نے اس کے معنی پہاڑوں کے بھی کئے ہیں ۔ کیونکہ اَلْاَنْكَبُ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا ایک کندھا دوسرے سے اونچا ہو**۔

# ن ک ث

اَلنِّكْثُ ۔ پرانے کمبل یا دیگر اونی کپڑے وغیرہ جن کی بنائی کو کھول دیا جائے تاکہ انہیں دوبارہ بنا جاسکے ۔ نَكَثَ الْعَهْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَكَثَ الْحَبْلَ ۔ رسی کو کھول دیا ۔ اَلنَّكِيْثَةُ ۔ وعدہ خلافی ۔ نیز رسی کے لڑ یا بٹ کو کہتے ہیں*** ۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں (ابن فارس)۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۷/۱۳۵) ۔ وہ عہد توڑ دیتے ہیں ۔ اَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) ۔ ادھیڑی ہوئی اون وغیرہ کے ٹکڑے ۔

# ن ک ح

نِكَاحٌ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں**۔ لیکن اس طرح ملانا جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں نَكَحَ النُّعَاسُ ۔ نیند اس کی آنکھوں میں گھل گئی ۔ یا جس طرح بارش کے قطرے

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں ۔ نَکَحَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ ۔ بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہو گیا ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب بارش کا پانی زمین کی بالائی خشک سطح سے نیچے گزر کر زمین کی نمی تک جا پہنچے** ۔

ان مثالوں کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن کریم نے مرد و عورت کی عائلی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں نِکَاحٌ سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے میاں بیوی کا ایسا تعلق جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے ۔ ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے ۔ جس طرح بارش زمین میں جذب ہو جاتی ہے ۔ ایسا تعلق ( اور وہ عمر بھر کے لئے) اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ( اور قائم رہ سکتا ) ہے جب میاں بیوی میں فکر و نظر کی کامل آہنگی اور ذوق اور مزاج ، خیالات و تصورات اور نظریات و معتقدات کی یک جہتی ہو ۔ یہ نکاح کی بنیادی شرط اور خصوصیت ہوگی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'') ۔

ظاہر ہے کہ ایسے تعلق کے لئے باہمی رضامندی اولین اور بنیادی شرط ہوگی ۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ اس میں تراضی ما بین ضروری ہے ۔ ( ۴/۲۴ و ۲/۲۳۲ ) ۔ اور رضامندی اسی وقت ہوسکتی ہے جب لڑکی اور لڑکا خود فیصلہ کرنے کے قابل (یعنی بالغ) ہو چکے ہوں ۔ چنانچہ قرآن کریم نے بلوغت کے لئے ترکیب ہی بَلَغُوا النِّكَاحَ ( ۴/۶ ) کی استعمال کی ہے ۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہہ کر کر دی ہے ۔ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ( ۶/۱۵۳ و ۱۷/۳۴ ) اور اَشُدَّهٗ کے معنی دوسری جگہ یہ کہہ کر بیان کر دئے کہ وہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ہے ( ۲۲/۵ ) ۔ لہذا نہ نابالغ کے نکاح کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی ، خود ان کی رضامندی تصور کی جا سکتی ہے ۔

راغب نے کہا ہے کہ نِكَاحٌ کا لفظ عَقْدٌ کے لئے آتا ہے ۔ جماع کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے* ۔ قرآن کریم نے عُقْدَةُ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵) بھی کہا ہے ۔ یعنی نکاح کی گرہ ۔

سورۃ نور میں لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ( ۲۴/۳۳ ) آیا ہے ۔ جس کے معنے شادی کا انتظام ہیں ؛ یا نکاح کا سامان ۔ اس کے معنے رشتہ بھی ہوسکتے ہیں اور وہ اخراجات بھی جو ایک میاں بیوی کے لئے گھریلو زندگی میں ضروری ہوتے ہیں ۔ نیز بیوی کا مہر ۔ (باقی رہا نکاح کی تقریب پر خرچ اخراجات تو یہ محض

*محیط ۔ **تاج ۔

معاشرتی رسم ہے) - قرآن کریم کی رو سے ، بالغ (صاحب عقل و ہوش) لڑکے اور لڑکی کا یہ معاہدہ کہ وہ ان تمام حقوق و فرائض کے ساتھ جو اس باب میں خدا نے عائد کئے ہیں ، ازدواجی زندگی بسر کرینگے ، نکاح کہلائیگا - اس کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے نہ رسم - رسوم و تقاریب معاشرتی چیزیں ہیں - البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی شہادت بھی ہو اور اسے کہیں منضبط (درج) بھی کر لیا جائے -

## ن ک د

نَکِدَ عَیْشُہٗ - اس کی زندگی تنگ اور سخت ہوگئی - نَکِدَتِ الْبِئْرُ - کنویں کا پانی کم ہو گیا - اَلنُّکْدُ - وہ اونٹنیاں جن کے بچے زندہ نہ رہیں* - یا جن کا دودھ بہ مشقت دوھا جاسکے** - اس کے بنیادی معنوں میں کمی اور مشقت دونوں ہیں - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز کا اس کے طالب کےلئے بدقت نکلنا بتائے ہیں- نیز نَاقَۃٌ نَکْدَاءُ کے معنے وہ اونٹنی ہیں جس کے دودھ نہ ہو- اَرَضُوْنَ نِکَادٌ - بہت کم پیداوار والی زمینیں* - قرآن کریم میں ہے - وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا ( ۷/۵۸ ) - خراب زمین سے بہت تھوڑی پیداوار ہوتی ہے - یعنی جس پر محنت زیادہ کرنی پڑے اور حاصل کم ہو**-

## ن ک ر

اَلنُّکْرُ - اَلنَّکْرُ - بہت زیادہ چالاکی - عقل کی فریب کاری - رَجُلٌ نَکِرٌ - بہت چالاک اور طرار آدمی - اَلْمُنَاکَرَۃُ - ایک دوسرے کو فریب دینا* - قرآن کریم میں ہے - اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ - ( ۲۹/۴۵ ) - یقیناً صلٰوۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے - اس کے عام معنی ہوں گے ہر وہ بات جو حد سے تجاوز کر جائے اور ناپسندیدہ حرکت - لیکن فَحْشَآءُ کے معنی بخل بھی ہیں ( دیکھئے عنوان ف - ح - ش ) - اور مُنْکَرٌ کے معنی ہیں عقل خود بین کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ یہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے - دوسرے اپنی فکر آپ کریں - ان معانی کی وضاحت ( ۷۰/۲۵-۲۲ ) سے ہو جاتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کو اگر تنہا (اس کی عقل اور مرضی پر) چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے

*تاج - **راغب -

تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ روک لیتا ہے ۔ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ( ۷۰ / ۲۲-۲۵ ) ۔ "لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی ۔ یعنی ان لوگوں کی جو نظام صلٰوۃ کے ہمیشہ پابند رہتے ہیں اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے" ۔

نَکُرَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ دشوار ہو گیا ۔ اَلنَّکْرَاءُ ۔ مصیبت اور سختی ۔ نَکْرَاءُ الدَّھْرِ ۔ زمانہ کی سختی اور مصیبت* ۔ سورۃ کہف میں عَذَابًا نُّکْرًا آیا ہے ( ۱۸ / ۸۷ ) ۔ یعنی سخت عذاب جیسے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا ۔ اسی طرح سورۃ قمر میں شَیْءٍ نُّکُرٍ آیا ہے ( ۵۴ / ۶ ) ۔ سخت مصیبت انگیز بات ۔

نُّکْرٌ ۔ ایسی بات جو خوش آیند نہ ہو ۔ جسے دل قبول نہ کرے ۔ جو طبیعت پر ناگوار گزرے (ابن فارس) ۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ فَرَحٌ (خوشی) کے مقابلہ میں آیا ہے ( ۱۳ / ۳۶ ) ۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّکْرًا ( ۱۸ / ۷۴ ) ۔ تو نے یہ بڑی ہی ناخوش آیند بات کی ہے ۔ اَلنُّکُرُ ۔ بہت زیادہ ناخوش آیند ( ۳۱ / ۱۹ ) ۔ اَلنَّکِیْرُ ۔ انکار* ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے مَا لَکُمْ مِّنْ نَّکِیْرٍ ( ۴۲ / ۴۷ ) ۔ "تم سے انکار نہیں ہو سکے گا" ۔ نیز حق بات سے انکار کرنے کی سزا (یعنی تباہی اور بربادی) ۔ نَکِیْرٌ کے معنے یہ بھی ہیں کہ جو کچھ برا لگے اسے بدل دیا جائے* ۔ فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ ( ۲۲ / ۴۴ ) ۔ سو میری سزا کیسی تھی؟ ان کی بد اعمالیوں پر میرا رد عمل کیسا ہوا؟

اَلنَّکِرَۃُ ۔ کسی چیز کو نہ پہچاننا ۔ اَلْاِنْکَارُ ۔ در حقیقت عِرْفَانٌ کی ضد ہے ۔ یعنی نہ پہچاننا ۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں ہے ۔ فَعَرَفَھُمْ وَ ھُمْ لَہٗ مُنْکِرُوْنَ ( ۱۲ / ۵۸ ) ۔ یوسف نے انہیں (بھائیوں کو) پہچان لیا لیکن وہ اسے نہیں پہچان رہے تھے ۔ سورۃ ہود میں ہے ۔ نَکِرَھُمْ ( ۱۱ / ۷۰ ) ۔ اس نے انہیں اجنبی سمجھا ۔ ان پر اظہار تعجب کیا ۔ اسی طرح سورۃ حجر میں قَوْمٌ مُّنْکَرُوْنَ ( ۱۵ / ۶۲ ) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ یعنی اجنبی لوگ ۔

نَکَّرَ ۔ کسی چیز کو اس طرح بدل دینا کہ وہ پہچانی نہ جا سکے** ۔ ( ۲۷ / ۴۱ ) ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ نیز ابن قتیبہ ۔ القرطین ج/۲ صفحہ ۵۸ ۔

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اکثر مقامات میں آیا ہے - ( مثلاً ۳/۱۰۴ ) - ان الفاظ ( مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ ) کا صحیح مفہوم (ع - ر - ف) کےعنوان میں بتایا جاچکاہے- مختصراً یوں سمجھئے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لئے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین و قوانین اور قواعد و ضوابط مرتب کرتا ہے - جو باتیں اسطرح سے قابل قبول ٹھہرائی جاتی ھیں انہیں معروف کہا جاتا ہے - یعنی (Recognised by the Society) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے - قرآن کریم کی ان ھر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود ، معقول و نامعقول ، مقبول و نامقبول ، پسندیدہ اور غیرپسندیدہ امور آجاتے ھیں - اوراس تقسیم و تفریق کا معیار ھوتا ہے قرآن کریم کا غیر متبدل ضابطہ - یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعْرُوْفٌ وہ ھیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ھیں - اور مُنْکَرٌ وہ ھیں جن سے اس کی ''فطرت'' ابا (یا نفرت) کرے - تو یہ تصور غیر قرآنی ہے - انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کرسکے - اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ھوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ھوتی ہے) تو اس کےلئے وحی کی ضرورت ھی نہ تھی - ( دیکھئے عنوانات ف - ط - ر اور ل - ھ - م ) مَعْرُوْفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے- اور مُنْکَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا دے - جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ، ان میں مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج سب آجاتے ھیں - وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کرکے نہیں دیں - اس نے عام اصول دے دئے ھیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے -

لہذا مَعْرُوْفٌ وہ جسے قرآنی معاشرہ (Recognise) کرے - اور مُنْکَرٌ وہ جسے وہ (Recognise) نہ کرے - چنانچہ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ مَعْرُوْفٌ میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائیگی ( ٦٠/١٢ ) تو اس کے معنے یہی ھیں کہ ھر اُس بات میں اطاعت کی جائیگی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے - اورقرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول و قوانین و احکام کے مطابق ھوں - جو بات قرآن کریم کے خلاف ھوگی وہ معروف نہیں بلکہ منکر ھوگی - یہی معروف و منکر کا اٹل معیار ہے -

# ن ک س

نَکَسَ یَنْکُسُ - کسی چیز کو الٹ دینا - اوندھا کر دینا - اِنْتَکَسَ فُلَانٌ - فلاں اپنے سر کے بل گر پڑا - اَلْمُنْتَکِسُ - وہ گھوڑا جو چلتے وقت کمزوری سے سر اورگردن جھکا کر چلے - وہ گھوڑا جو دوڑ میں دوسرے گھوڑوں کے ساتھ چل نہ سکے - اَلنِّکْسُ - وہ جسکا سر جھکا ہوا ہو*-

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراھیمؑ نے اپنی قوم کے سربرآوردہ افراد کو دلائل و براھین سے سمجھا دیا کہ بت پرستی کس طرح وجہ تذلیل انسانیت ہے - اور وہ ان دلائل سے اپنے دل میں قائل بھی ھو گئے - لیکن پھر ان کی مفاد پرستیاں اور عزت نفس ان کے سامنے آگئی اور وہ اپنی بات کی طرف لوٹ گئے- اسے قرآن کریم نے ثُمَّ نُکِسُوْا عَلٰی رُءُوْسِهِمْ (۲۱/۶۵) سے تعبیر کیا ہے - یعنی وہ فکر و نظر کی ان بلندیوں تک پہنچ جانے کے بعد پھر اوندھے گر گئے - پھر انہی پستیوں میں آگرے جہاں وہ پہلے تھے -

سورہ السجدہ میں مجرمین کے متعلق ہے نَاکِسُوْا رُءُوْسِهِمْ (۳۲/۱۲) ذلت سے اپنے سر جھکائے ھوئے- سورہ یٰسٓ میں ہے - وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَکِّسْهُ فِی الْخَلْقِ (۳۶/۶۸) - جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ (قویٰ وغیرہ کے لحاظ سے جوانی کی) بلندیوں سے پھر پستیوں کی طرف آجاتا ہے - جن باتوں کا پہلے علم ھوتا ہے انہیں بھی بھول جاتا ہے (۱۶/۷۰ ؛ ۲۲/۵) - یہ بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ کے مضمحل ھو جانے کا عام بیان ہے -

# ن ک ص

نَکَصَ عَنِ الْاَمْرِ - کسی کام سے ھچکچانا - اور پیچھے ھٹ جانا - نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ - لوٹ گیا - پلٹ گیا - کہا گیا ہے کہ یہ لفظ خیر اور بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے خاص ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ لوٹ جانے کے معنوں میں آتا ہے**- نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ - (۸/۴۸) - اُلٹے پاؤں پھر جانے کے معنوں میں آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ڈر اور بزدلی کی وجہ سے پیچھے ھٹنے کا مفہوم ہے اور ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا استعمال بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے ھوتا ہے-

# ن ک ف

نَکَفَ کے بنیادی معنی کسی چیز کو الگ کر دینے ، کاٹ دینے اور ایکطرف کر دینے کے ھوتے ھیں***- ابن فارس نے بھی اسکی تائید کی ہے -

* تاج و راغب و محیط- **تاج و محیط- ***راغب -

نَكَفْتَ الدَّمْعَ - انگلی سے آنسوؤں کا رخسار پر سے الگ کر دینا (پونچھ دینا) * - اسی سے اِسْتَنْكَفَ کے معنی ہیں رک جانا - کسی کام سے عار آنا - اسے برا محسوس کرنا اور خود کو اس سے بالاتر سمجھنا ** - رَجُلٌ نِكْفٌ وہ آدمی جس سے نفرت کی جائے** -

قرآن کریم میں ہے لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ ($\frac{4}{172}$) - مسیح (کہ جسے ، تم اے نصاریٰ ، خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو) اسے اس سے قطعاً عار و انقباض نہیں کہ وہ خدا کا عبد ہو - لہذا یہ مدعی سست اور گواہ چست کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ تو خدا کا عبد بننے میں فخر محسوس کرے اور تم اسے خدا بنا لو -

# ن ک ل

اَلنِّكْلُ - مضبوط بھاری سخت بیڑی (جمع اَنْكَالٌ) - ایک سخت قسم کی لگام یا لگام کا لوہا - اس سے نَكَّلَهُ کے معنی ہیں کسی کو اس روش سے روک دینا جس پر وہ چل رہا ہو - نَكَلَ عَنْهُ - اس سے الٹے پاؤں لوٹ جانا - نَكَّلَ بِهٖ کے معنی ہیں اسے جرم کی عبرت انگیز سزادی ، کیونکہ سزا سے خود مجرم آیندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے رک جاتا ہے اور دوسرے بھی اسی سے عبرت پکڑتے ہیں*** -

قرآن کریم میں مخالفین قریش کے متعلق ہے - اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا ($\frac{73}{12}$) - ہمارے پاس ان کے لئے سخت بیڑیاں ہیں - ظاہر ہے کہ یہ بیڑیاں وہ ہیں جو جنگ بدر و حنین وغیرہ میں انہیں پہنائی گئیں - یا وہ تمام تدبیریں جن سے یہ لوگ اس مخالفت سے روکے گئے[1] - سورہ النّٰزِعٰت میں ہے - فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ($\frac{79}{25}$) - خدا نے سزا دے کر فرعون کو "آخرۃ و اولیٰ" کے لئے عبرت بنا دیا - (یہاں اخذ کے وہی معنی ہونگے جو اتَّخَذَ کے ہیں) -

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے نَكَالٌ میں ہر وہ تدبیر شامل ہوگی جس سے کسی کو اسکی غلط روش سے روک دیا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے - چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ یہودیوں میں سے جن لوگوں نے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں ایسی ذلت آمیز سزا دی گئی کہ وہ دوسروں کے لئے نَكَالًا بن گئی ($\frac{2}{66}$) - یعنی موجب عبرت - اسی طرح چوری (سرقہ) کی سزا کے متعلق ہے نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ ($\frac{5}{38}$) - یہ خدا کی تجویز کردہ ایسی سزا ہے جس سے وہ مجرم آئندہ ارتکاب جرم سے رک جائے - یہ اس قسم کے جرائم کے لئے روک کا کام دیگی - یعنی مقصد اس جرم کی روک تھام ، انسداد ہے ،

*راغب - **تاج - ***تاج و ابن فارس -

[1] (مسلسل پڑھئے) یہ بیڑیاں ہر اس دشمن کو پہنائی جائینگی جو حق کی مخالفت کریگا - آخرت میں یہ بیڑیاں اس کے ارتقاء کے راستے میں حائل ہونگی - اسی کو جہنم کہا جاتا ہے -

جس طریق سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جائے ۔ ارتکاب جرم کے بعد عبرتناک سزا بھی انسداد جرم کا ایک طریق ہوتا ہے ۔ اور مناسب حالات میں (احساس ندامت رکھنے والے) مجرم کو معاف کرکے اسکی اصلاح کر دینا بھی ایک طریقہ ۔ (۳۴-۳۹/۵) میں یہ دونوں باتیں آگئی ہیں ۔

## ن م ر ق

اَلنُّمْرُقُ ۔ اَلنُّمْرُقَةُ ۔ گدّا ۔ تکیہ ۔ وہ نمدہ وغیرہ جسے سوار کجاوہ کے نیچے اونٹنی کے پشت پر بچھاتا ہے*۔ قرآن کریم میں نَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ (۸۸/۱۵) آیا ہے یعنی صف میں بچھے ہوئے گدّے یا تکیے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں قاف زیادہ ہے ۔ اسکی اصل نَمِرَةٌ ہے جس کے معنی دھاری دار کمبل کے ہیں ۔ (غالباً وہ گدہ اس قسم کے کمبلوں کا بنتا ہوگا) ۔

## ن م ل

اَلنَّمْلُ ۔ نَمْلَةٌ کی جمع ہے ۔ چیونٹیاں** ۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ہے حَتّٰی اِذَا اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ یٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ (۲۷/۱۸) ۔ صاحب تاج کے نزدیک وادی النمل ، جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے* ۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ارض شام میں ہے ۔ لیکن اگر یہ وادی اُس راہ گزر پر واقع تھی جو ملکہ سبا کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا ۔ بہرحال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں ، بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام ہے ۔ اور اَلنَّمْلُ اُس قبیلہ کا نام ۔ نَمْلَةٌ ۔ اس قبیلہ کی ایک عورت ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس ہوتی تھیں ۔ جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے ۔ یعنی ان قبائل کا تمدن (Matriarchal) تھا ۔

اَنَامِلُ (اَنْمُلَةٌ کی جمع ہے) ۔ انگلیوں کے بالائی سرے ۔ (۳/۱۱۸) ۔

## ن م م

اَلنَّمُّ ۔ بھڑکانا اور برانگیختہ کرنا ۔ فساد پیدا کرنے کے لئے بات کو پھیلانا ۔ بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنانا ۔ اَلنَّمِیْمَةُ ۔ چغلی ۔ آہستہ بات کی آواز ۔ لکھنے کی آواز یا ترکش کی آواز کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلنَّمَّامَةُ ۔

*تاج ۔ **تاج و قاموس ۔ دیکھئے مادہ ''و د ی''

حس وحرکت ۔ حیات نفس*۔ اَلنَّمَّامُ ۔ جو شخص اپنے پیٹ میں بات نہ رکھ سکے**۔ ادھر ادھر باتیں کرتا رہے ۔ چغلخور۔

قرآن کریم میں ہے ۔ مَشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (۶۸/۱۱) ۔ چغل خور ۔ ادھر کی باتیں اُدھر بہت زیادہ پہنچانے والا ۔ (یہاں نَمِيْمٌ بمعنی نَمِيْمَةٌ ہے)۔ لوگوں میں فساد پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ جھوٹی باتیں، اور باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش ،کرنے والا ۔

## ن و ء

نَاءَ ۔ يَنُوْءُ ۔ نَوْءً ۔ دشواری اور مشقت سے اٹھنا ۔ نَاءَ بِالْحِمْلِ ۔ وہ بوجھ کو لیکر گراں باری سے اٹھا ۔ نَاءَ بِهِ الْحِمْلُ ۔ بوجھ نے اسے گرانبار کر دیا اور جھکا دیا***۔ قرآن کریم میں قارون کے خزانے کے متعلق ہے ۔ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ (۲۸/۷۶) ۔ انہیں ایک مضبوط طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ نَاءَ کے معنی ہیں وہ بوجھل چیز کو لیکر اٹھا ۔

## ن و ب

اَلنَّوْبُ ۔ کسی چیز کا بار بار لوٹنا ۔ شہد کی مکھیوں کو اسی لئے نَوْبٌ کہتے ہیں کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف آتی ہیں ۔ حادثہ یا واقعہ کو نَائِبَةٌ ۔ (جمع نَوَائِبُ) کہتے ہیں کہ یہ چیز انسانی زندگی میں بار بار پیش آتی رہتی ہے ۔ نَوْبَةٌ ۔ نیز (نَوْبَةٌ) باری کو کہتے ہیں ۔ (دراصل پانی پلانے کی باری کو کہتے ہیں)۔ اَلْمُنْتَابُ ۔ پانی کی طرف جانے کا راستہ کیونکہ لوگ اس پر باری باری سے گذرتے ہیں ۔ اَلنِّيَابَةُ ۔ قائم مقامی کرنا ۔ باری ۔ اَنَابَ زَيْدٌ عَنْهُ وَكِيْلًا ۔ زید نے اپنی جگہ وکیل کو قائم مقام کر دیا****۔

انابت الی اللہ ۔ قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے ۔ اَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ (۳۹/۵۴) ۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (۳۰/۳۱) ۔ وغیرہ ۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے شہد کی مکھی (نَوْبٌ) کی مثال سامنے لائیے ۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں سینکڑوں میل ادھر اُدھر نکل جاتی ہے ۔ مختلف وادیوں میں پھرتی اور مختلف باغات میں گھومتی ہے ۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل کو لیکر ہر بار اپنے چھتہ (مرکز) کے طرف لوٹتی ہے ۔ وہ کہیں ہو اسکا چھتہ

*تاج و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج و محیط ۔ ****تاج و راغب و محیط ۔

اسکی نگاھوں کا مرکز اور اس کی گردش کا محور ھوتا ھے۔ وہ اسکی نظروں سے ایک ثانیہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ھوتا۔ وہ اسکی تمام توجہات کا قبلہ ھوتا ھے۔ یہی کیفیت، سفر زندگی میں ایک مرد مومن کی ھوتی ھے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ھو، اسکی توجہات کا مرکز اور گردشوں کا محور خدا کا قانون (اور اسے نافذ کرنے والا نظام) ھوتا ھے۔ وہ ھر فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ھے اور اپنی متاع حیات اور حاصل تگ و تاز کو لیکر اس کی طرف لوٹتا ھے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (۲/۱۵۴)۔ "اور جہاں کہیں تم ھو اپنی توجہات کو اسی طرف مرکوز رکھو"۔ مومن کی تو کیفیت یہ ھوتی ھے کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ نگاہ او بشاخ آشیانہ

بعینہ یہی کیفیت شہد کی مکھی کی ھے جس کے متعلق کہا گیا ھے کہ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶/۶۹)۔ "تو تمام پھلوں (پھولوں) کا رس چوس، اور اپنے رب کے راستے پر فرمانبرداری سے چلی جا"۔ ایک مومن دنیا بھر کے علوم و فنون کا اکتساب کرتا ھے لیکن ان کے ماحصل کا مرکز قرآن کریم کو بناتا ھے۔ قرآنی نظام اسے پھر تمام نوع انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ھے۔

یہ ھے اِنَابَتْ اِلَی اللہ کا صحیح مفہوم۔ زندگی کے ھر دوراھے پر فیصلہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا۔ وھیں سے راہ نمائی لینا۔ اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو لیکر اسی کی طرف لوٹنا۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ھے کہ توبہ، لغزش کے بعد ندامت کے لئے آتا ھے اور انابت، مستقبل میں لغزشوں سے محفوظ رھنے کے لئے۔ یعنی توبہ میں انسان، غلط قدم اٹھ جانے کے بعد، واپس آکر صحیح راستے پر گامزن ھوتا ھے اور انابت میں قدم اٹھانے سے پہلے ھی سوچ لیتا ھے کہ صحیح راستہ کونسا ھے اور پھر اسی راستے پر چلتا ھے۔ یہ حفظ ما تقدم (Preventive) ھے، وہ تدبیر بعد مرض (Curative)۔

# ن و ح

نَاحَ۔ وہ چیخ چیخ کر رویا۔ نَوْحٌ۔ وہ عورتیں جو نوحہ کرنے کے لئے جمع ھوں۔ نیز نوحہ کرنا۔ اَلنِّيَاحَةُ۔ نوحہ کرنا۔ اَلتَّنَاوُحُ۔ ایک

دوسرے کے آمنے سامنے ہونا ( جسطرح عورتیں نوحہ کرتے وقت ہوتی ہیں )*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ( یعنی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا ) ۔

نُوْحٌ ۔ حضرت نوحؑ (۵۹/۷)۔ یہ غیر عربی لفظ ہے ۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کا لقب ہے کیونکہ وہ بہت روتے اور گڑگڑاتے رہتے تھے*۔ لیکن زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے ۔

قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز بالعموم حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے ۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ . . . . (۱۶۳/۴)۔ ” بیشک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جسطرح نوح کیطرف اور اس کے بعد دیگر انبیاء کیطرف وحی کی تھی “ . . . . ۔ ( البتہ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت نوحؑ کے ساتھ آدم کا بھی نام آیا ہے ۔ اس کے لئے دیکھئے عنوان ( ا ۔ د ۔ م )۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتداء قوم نوح سے ہوئی ۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی ، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے ۔ لیکن اب فیصلہ کا رخ اس طرف ہے کہ اسکی ابتدا عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل انسان کی تمدنی زندگی کی مؤسس تھی ۔ اسی قوم میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں ، آج سے قریب چھ سات ہزار سال قبل ، حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے ۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے ۔ قرآن کریم ( ان معاملات میں ) نہ زمان سے بحث کرتا ہے نہ مکان سے ۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے ۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا ۔

حضرت نوحؑ اپنی قوم کے ایک فرد تھے ۔ اسی لئے قرآن کریم انہیں ان کے مخاطبین کا بھائی کہکر پکارتا ہے ۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ . . . . (۱۰۶/۲۶)۔ ” جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا “ ۔

اگرچہ قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز حضرت نوحؑ کے تذکرہ سے کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس قوم میں خدا کے رسول آچکے تھے ۔ قرآن کریم میں ہے وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ . . . (۳۷/۲۵)۔ ” قوم نوح نے جب رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کردیا “ ۔

---

*تاج و راغب ۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں ذہن انسانی ہنوز اپنے عالمِ طفولیت میں تھا اور وہ لوگ تمدنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات بھی اپنی عقل سے پوری نہیں کر سکتے تھے ۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی کسطرح بنائیں ۔ ۔ ۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۱/۳۷) ” ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے “ ۔

حضرت نوحؑ کا پیغام وہی تھا جو تعلیم ربّانی کا اصل الاصول ہے ۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ ۔ ۔ (۷/۵۹) ۔ ” اے میری قوم ۔ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو ۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الٰہ نہیں “ ۔ قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی (۷۱/۲۳) ۔ اگر دعوت حضرت نوحؑ کا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش چھوڑ کر ” خدا کی پرستش “ میں لگ جائیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کی مخالفت ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہئے تھی ۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا (۲۶/۱۱۱) اور ارباب دولت و حشمت (سرداران قوم) کی طرف سے اسکی مخالفت ہوئی (۱۱/۲۷) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس میں مترفین (آسودہ حال سرمایہ داروں) کا طبقہ اپنی ہلاکت دیکھتا تھا اور غریبوں کا طبقہ اپنے لئے زندگی کے آثار پاتا تھا ۔ یہ وہ طبقہ تھا جو اعلٰی طبقہ کے نزدیک قابل نفرت شمار ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں اراذل (کمینے) کہتے تھے (۲۶/۱۱۱ ؛ ۱۱/۲۷) ۔

مترفین کے طبقہ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی ۔ حضرت نوحؑ کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں (۵۴/۹) ۔ اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ وہ مغلوب ہوجائینگے (۵۴/۱۰) ۔ اس کے بعد طوفان آیا (۵۴/۱۱-۱۲) ۔ مخالفین غرق ہوگئے اور حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کشتی میں سوار ہوکر صحیح و سلامت خشکی پر اتر گئے ۔

اسی سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ” غیر “ جو حضرت نوحؑ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کا شمار ” اپنوں “ میں ہوگیا تھا اور خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اور آپ کی بیوی (جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے) ان کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں (۶۶/۱۰ ؛ ۱۱/۴۶) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نے پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کر دیا تھا کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوتی ہے ۔ وطن اور خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی ۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹/۱۴) '' وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہا ''۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال کی تھی۔ لیکن قدیم زمانے کی تاریخ میں '' بادشاہوں کی عمر '' سے مراد ہوتا تھا وہ زمانہ جس میں حکومت ان کے خاندان میں رہتی۔ اس اعتبار سے ساڑھے نوسو برس کا زمانہ وہ مدت ہے جس میں شریعت حضرت نوحؑ کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سَنَةٌ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل (چوتھائی سال) کے بھی ہیں لہذا '' أَلْفَ سَنَةٍ '' کے معنی ہوئے اڑھائی سو برس۔ اس میں سے پچاس سال نکال دینے سے باقی عمر دو سو سال رہ جاتی ہے جو مستبعد نہیں۔ [مزید تفصیل (س۔ ن۔ و) اور (ع۔ و۔ م) کے عنوانات میں دیکھئے]۔

## ن و ر

اَلنُّوْرُ۔ روشنی، جس قسم کی بھی ہو۔ یا روشنی کی شعاع۔ زمخشری نے کہا ہے کہ ضِيَاءٌ میں نُوْرٌ سے زیادہ زور اور شدت ہوتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضِيَاءٌ ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُوْرٌ اس روشنی کو جو ذاتی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورج کے لئے ضِيَاءٌ اور چاند کے لئے نُوْرٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے*۔ (نیز دیکھئے عنوان ض۔ و۔ أ)۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰/۵)۔ ''اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا''۔ واضح رہے کہ ضیاء اور نور کا یہ فرق وہاں ہی ہوگا جہاں ان الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لایا جائے گا۔ ورنہ نور کے معنے روشنی ہونگے۔ نُوْرٌ اسے کہتے ہیں جو خود واضح اورظاہر ہو اوردوسری چیزوں کوروشن اور واضح کردے*۔ اللہ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو نُوْرٌ کہا ہے سورۃ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ (۵/۱۵)۔ ''یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی واضح کتاب آگئی''۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لئے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ روشنی کا

*تاج۔

دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم، انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے اور قیمت کیا۔ اسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے۔ یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا۔ لہذا جہاں اللہ نے قرآن کریم کو نور کہا ہے تو اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس نور (روشنی) سے مقصود کیا ہے۔ يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵/۱۶)۔ "اللہ اس روشنی کے ذریعے، ہر اس شخص کو جو اس کے قانون سے ہم آہنگ ہوتا ہے سلامتی اور تکمیلِ ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کردیتا ہے اور اس طرح انہیں (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نکال کر (زندگی کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے"**۔ یعنی انہیں زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اسی مشعل ہدایت کو لے کردنیا میں چلتےپھرتے ہیں۔ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ (۶/۱۲۳)۔

مَنَارَةٌ اور مَنَارٌ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے روشنی نکلے (اس کے بعد مجازاً اذان دینے کی جگہ کو بھی مَنَارَةٌ۔ کہنے لگے)*۔ مَنَارٌ۔ ان حدود کو بھی کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے قائم کی جائیں*۔ مُنِيْرٌ۔ خوش رنگ اور روشن چیز یا آدمی کو کہتے ہیں*۔ نیز روشن کرنے والا۔

اَلنَّارُ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ دونوں لفظ ایک ہی اصل سے ہیں۔ (۲/۱۷)۔ نَارٌ کے معنے ہیں شعلے کی لپٹ جو نظر آجائے*۔ نیز اَلنَّارُ کے معنی علامت اور نشانی کے بھی آتے ہیں، اس لئے کہ عرب اپنے اونٹوں کو گرم لوہے سے داغ دے کر نشان لگایا کرتے تھے*۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے اسکی دلیل کچھ وزنی نہیں۔ نُوْرٌ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ نَارٌ میں نفرت اور وحشت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسی لئے نَارَتِ الْمَرْاَةُ تَنُوْرُ کے معنی ہیں عورت کا متنفر اور متوحش ہونا۔ ہرن نیز، وحشی (غیر مانوس) جانوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بَقَرَةٌ نَوَارٌ۔ اُس گائے کو کہتے ہیں جو نر سے متنفر ہو۔ حتّٰی کہ مُنَاوَرَةٌ کے معنی آپس میں گالی گلوچ کے ہیں۔ نیز نَائِرَةٌ کے معنی

---

*تاج۔ **موت کی تاریکی اور زندگی کی روشنی کے لئے دیکھئے (۶/۱۲۳)۔

عداوت ، بغض اور فتنہ کے ہیں کیونکہ عداوت اور بغض بھی ایک اندرونی آگ ہے ۔ نَائِرَۃٌ الْحَرْبِ ۔ سے مراد جنگ کا شر اور ہیجان ہے* ۔ نَارُ الْحَرْبِ ۔ اُس آگ کو کہتے تھے جسے عرب پہاڑ کی چوٹی پر جلاتے تھے اور جس سے مراد اعلانِ جنگ ہوتا تھا** ۔ نَارَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں قوم نے شکست کھائی** ۔

اس سے عَذَابُ النَّارِ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہوجائے۔ ( بمقابلہ جنت کے جس کے نیچے پانی کی نہریں ہیں ۔ پانی اور آگ کا تقابل مفہوم کو واضح کردیتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ن ۔ ھ ۔ ر )۔ اس میں اس دنیا کی زندگی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی ہلاکت سامانی بھی۔ اَصْحٰبُ النَّارِ وہ ہیں جو خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا ہوں ( ۳۸-۳۹/۲ )۔ یہ آگ دلوں کو محیط ہوتی ہے ۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ ( ۶-۷/۱۰۴ ) ۔ ''قانون خداوندی کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں'' ۔ (مزید تفصیل جَھَنَّمُ اور ج ۔ح۔ م کے عنوانات میں ملیگی) ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نَار سے ہوئی ہے ( ۳۸/۷۹ )۔ اس لئے جہاں نَار سے بچنے کی تاکید ہے تو اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے ۔ ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے ۔ اسی لئے عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور خود اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی ہیں ۔ اِس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔

سورۃ حجر میں ہے ۔ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ( ۲۷/۱۵ ) ۔ جَآنّ سے مراد وہ تمام چیزیں یا قوتیں ہیں جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ( Invisible ) ہیں ۔ اس آیت میں نَارِ سَمُوْم (سخت تیز آگ) سے مراد وہ حرارت ہوسکتی ہے جو مادہ کی اُس حالت میں ہوتی ہے جب اس نے ہنوز کوئی متشکل صورت اختیار نہ کی ہو ۔ ایٹم وغیرہ کی حرارتیں اسی قبیل سے ہیں ۔ نیز جان سے مراد وہ مخلوق بھی ہوسکتی ہے جو انسان سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور جو اب نابود (Extinct) ہوچکی ہے ۔ انسان اس مخلوق کا جانشین ہے (دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ف ) ۔ چونکہ اس زمانے میں زمین کی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***روح المعانی ۔

سطح نسبتاً زیادہ گرم تھی اس لئے اُس مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی ۔ ہوسکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی یہ کہا گیا ہو کہ اسکی تخلیق نار سے تھی ، جس طرح انسان کی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس کی ابتدا مٹی سے کی گئی ہے ۔

(ابلیس اور جان وغیرہ کے مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات ب ۔ ل ۔ س اور ج ۔ ن ۔ ن دیکھئے) ۔ سورۃ نور میں ہے اللہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ . . . . . ( ۲۴/۳۵ )۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ نے اس مثال سے اپنی ذات کو سمجھایا ہے ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن کچھ تصور نہیں کرسکتا ۔ یہاں خدا نے مَثَلُ نُوْرِہٖ کہا ہے ۔ یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے ( جیسی آگے بیان کی گئی ہے ) ۔ نورِ خداوندی بڑا جامع لفظ ہے اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اسکا استعمال آیا ہے۔ اسکی جامعیت کے اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی ''روشنی'' ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے ۔ عقل کی روشنی ۔ علم کی روشنی ۔ وحی کی روشنی وغیرہ ۔ یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں ۔ اس ''روشنی'' میں خدا کی کتاب (قرآن کریم) بھی شامل ہے ۔ اس مثال میں قرآن ہی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ۔ خود مثال کے مختلف حصے اور تشبیہات اس کی تائید کرتی ہیں ۔

## ن و ش

اَلنَّوْشُ ۔ کسی چیز کو لے لینا ۔ تَنَاوَشَہٗ ۔ اس نے اسے لے لیا ۔ اَلنَّوْشُ ۔ طلب کرنا ۔ اَلنَّوُوْشُ ۔ قوی آدمی جسکی گرفت سخت ہو ۔ نَاشَ بِہٖ یَنُوْشُ ۔ وہ اس سے چمٹ گیا اور لٹک گیا *۔ نَاشَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں کو پکڑا تا کہ اس کی ڈاڑھی اور سر کو کھینچے **۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَاَنّٰی لَھُمُ التَّنَاوُشُ (۳۴/۵۲) ۔ اب وہ ایمان کو کیسے پا سکتے ہیں ۔ اب وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل گیا ''۔

## ن و ص

اَلنَّوْصُ ۔ پیچھے ہٹنا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آمد و رفت بتائے ہیں ۔ اَلنَّوْصُ ۔ بھاگنا ۔ نَاصَ یَنُوْصُ نَوْصًا ۔ متحرک ہونا اور کہیں چلے جانا ۔ بھاگ کر چھٹکارا حاصل کرلینا ۔ نَاصَ عَنْہُ ۔ وہ اسکے پاس سے پلٹ گیا ، کترا کر نکلا اور بھاگ گیا ۔ ایک طرف ہو گیا۔ نَاصَ اِلٰی کَذَا ۔ اسنے اسکی طرف پناہ لی ***۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۔ (۳۸/۳) پیچھے ہٹنے اور بھاگ کر کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا** ۔ مَنَاصٌ کے معنی بھاگنے کی جگہ بھی ہیں اور خود بھاگنا بھی ۔

# ن و ق

اَلنَّاقَةُ ۔ اونٹنی ، جب وہ جوان ہو جائے ( تقریباً چوتھے برس میں ) ۔ اَلتَّنْیِقَةُ ۔ کھانے اور لباس کو بہت زیادہ عمدہ ، خوشگوار اور پسندیدہ بنانا ۔ نفاست ۔ پختگی ۔ عمدگی ۔ مہارت ۔ باریک بینی ۔ تَنَوَّقَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں کسی کام میں انتہا کرنا ، نہایت باریک بینی سے کام لینا ۔ تاج نے ابن فارس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نَاقَةٌ ہی سے بنایا گیا ہے کیونکہ عربوں کے ہاں اونٹنی نہایت پسندیدہ اور عمدہ شے مانی جاتی تھی ۔ جسطرح جَمَلٌ ( اونٹ ) سے جَمَالٌ (حسن اور خوبصورتی) اور اَجْمَلُ سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہے ، اسی طرح نَاقَةٌ سے تَنَوَّقَ اور اَلْمُنَوَّقُ ہے جس کے معنے ہیں صاف کیا ہوا کھجور کا خوشہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بلند اور اونچا ہونے کے ہیں ۔ ممکن ہے اونٹنی کو اَلنَّاقَةُ اسکی بلندی کی وجہ سے کہتے ہوں ۔

قومِ ثمود کے ہاں پانی کی قلت تھی ( دیکھئے ث ۔ م ۔ د ) ۔ جتنا کچھ پانی جمع ہوتا ، قوم کے بڑے بڑے لوگ اسے اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور غریبوں کے جانور پیاسے مر جاتے ۔ حضرت صالح ؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ جو چارہ اور پانی خدا نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا قیمت دیا ہے ، اسے کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص کر لینا ظلم ہے ۔ تم اس روش سے باز آجاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے ۔ چنانچہ بہت سی حیل حجت کے بعد وہ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے کہ پانی میں سب کی باری مقرر کر دی جائے ۔ اس کے لئے حضرت صالح ؑ نے کہا کہ بہت اچھا ۔ یہ ایک اونٹنی ہے ۔ میں اسے چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اسے اسکی باری پر پانی پینے دیتے ہو یا نہیں ۔ اگر تم نے اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اگر تم نے اسے روک دیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد محض زبان سے کر لیا ہے ، دل سے اسے نہیں مانتے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور انہوں نے اس اونٹنی کو بے دردی سے قتل کر دیا ۔

اسے قرآن کریم میں نَاقَةُ اللّٰهِ (۷/۷۳) کہا گیا ہے ۔ خدا کی مخلوق میں سے وہ اونٹنی جو اس بات کی علامت تھی ( لَكُمْ اٰيَةً ) کہ وہ لوگ اپنے اس

---

*تاج و محیط ۔ **ابن فارس ۔

معاهدہ پر جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کار بند رہتے ہیں یا نہیں ۔ جس طرح کعبہ کو خدا نے بَیْتِیْ (میرا گھر) کہا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو نَاقَۃُ اللہ کہکر پکارا گیا ہے ۔

# ن و ل (ن ی ل)

اَلنَّیْلُ ۔ اَلنَّائِلُ ۔ عطیہ جو کچھ انسان کو مل جائے یا پہنچ جائے ۔ نَالَ اس نے پا لیا ۔ نَالَ مِنْ عَدُوِّہٖ مَطْلُوْبَہٗ ۔ وہ اپنے دشمن کو جو گزند پہنچانا چاہتا تھا وہ اسے پہنچا دیا *۔ اور یوں اپنا مقصد پورا کر لیا ۔ اَنَلْتُہٗ اِیَّاہُ وَنِلْتُہٗ ۔ میں نے اسے کوئی چیز حاصل کرائی، دیدی یا پہنچا دی ۔ نَالَ الرَّحِیْلُ ۔ روانگی قریب آگئی* ۔ تَنْوِیْلٌ ۔ عطا کرنا ۔ اَلنَّوَالُ ۔ عطاء** ۔

اَلنِّیْلُ ۔ مصر کا مشہور دریا ۔ نیز عِظْلِیْم کا درخت جس سے نیل (رنگ) بنایا جاتا ہے* ۔ یہ ھندی لفظ نیل سے معرب ہے ۔

سورہ بقرہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) ۔ میرا عہد ظالمین کو نہیں پہنچے گا ۔ یعنی جو لوگ میرے قوانین سے سرکشی اختیار کر جائینگے اور انسانی حقوق میں کمی کرینگے انکے لئے میرا یہ وعدہ نہیں کہ انہیں نوع انسانی کی امامت ملیگی ۔ سورہ توبہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا (۹/۱۲۰) ۔ نہ وہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں ۔ سورہ اعراف میں ہے ۔ لَا یَنَالُہُمُ اللہُ بِرَحْمَۃٍ (۷/۴۹) ۔ "اللہ ان پر رحمت نہیں کریگا"۔

# ن و م

اَلنَّوْمُ نیند (۲/۲۵۵) نیز (۹/۵۸) ۔ مَنَامٌ ۔ سونے کی جگہ یا وقت ۔ یا نیند اور خواب (۳۷/۱۰۲ ؛ ۳۹/۴۲) ۔ نیز اس کے معنی آنکھ کے بھی آتے ہیں اس لئے کہ نیند کی جگہ آنکھ بھی ہے***۔ چنانچہ سورہ انفال میں جو ہے اِذْ یُرِیْکَہُمُ اللہُ فِیْ مَنَامِکَ (۸/۴۳) ۔ تو اس کے معنی بعض مفسرین نے آنکھ ھی کے لئے ہیں*** ۔ یعنی جب اللہ انہیں تیری نگاہوں میں (کم) دکھاتا تھا ۔

نَامَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا سو گئی یعنی ساکن ہو گئی ۔ نَامَتِ النَّارُ ۔ آگ کی تپش اور تندی ماند پڑ گئی ۔ نَامَ عَنْ حَاجَتِہٖ ۔ وہ اپنی ضرورت سے غافل ہو گیا ۔ اَلنُّوْمَۃُ ۔ جسے در خور اعتناء نہ سمجھا جائے ۔ اَلنَّوِیْمُ ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج ۔

جو شخص اپنی چیزوں کی طرف سے غفلت برتے - نیز گمنام* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمود اور حرکت کے ٹھہر جانے کے ہیں - اِسْتَنَامَ اِلیٰ فُلَانٍ - فلاں کیطرف پہنچکر اس نے اطمینان حاصل کرلیا -

# ن و ن

نُوْنٌ - اسے عبرانی اورسریانی زبان میں بھی نُوْنٌ ہی کہتے ہیں - اس کے معنی بڑی مچھلی کے آتے ہیں- اس حرف ( ن ) کی قدیم شکل بہت کچھ مچھلی سے مشابہت رکھتی تھی**- قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کو ذَا النُّوْنِ ($\frac{۲۱}{۸۷}$) بھی کہا گیا ہے - اور صَاحِبِ الْحُوْتِ بھی ( $\frac{۶۸}{۴۹}$ )- یعنی مچھلی والا - سورۃ الصّٰفّٰت میں انہیں یونس کے نام سے پکارا گیا ہے ( $\frac{۳۷}{۱۳۹}$ )-

تعریفات میں ہے کہ نُوْنٌ علم اجمالی کو کہتے ہیں جس سے مراد دوات ہے ، کیونکہ وہ حروف جو علم کی صورت اختیار کرتے ہیں اجمالی طور پر اس کی روشنائی میں موجود ہوتے ہیں - یعنی معنی اس کے دوات ہیں اور مراد اس سے اجمالی علم ہے**- سورۃ القلم میں ہے نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ ( $\frac{۶۸}{۱}$ ) - ''دوات اور قلم اور جو کچھ لوگ ان سے لکھتے ہیں (یعنی علم) اس پر شاھد ہے کہ . . . . '' (ہوسکتا ہے کہ یہاں ن مقطعات میں سے ہو) - تاج اور اقرب الموارد میں ہے کہ نُوْنٌ کے معنی تلوار کے پھل ( یا دھار) کے بھی ہیں - اس اعتبار سے دیکھئے تو ن - وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ کے معنی یہ ہونگے کہ سیف (تلوار) اور قلم یعنی جو کچھ اس سے لکھتے ہیں اس حقیقت پر شاھد ہیں کہ . . .(دین خداوندی کی بالآخر کامیابی ہوگی) - تلوار سے مراد قوتِ نافذہ اور قلم سے مراد قانونِ خداوندی ہے - ''قرآن کریم اور تلوار'' وہ محکم شہادات ہیں جن کی موجودگی میں اسلام کا کوئی دعویٰ بلا دلیل نہیں رہ سکتا - یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے یہ کہہکر توجہ دلائی ہے کہ

درکمر تیغِ دو رُو ، قرآن بدست     تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
ایں دو قوت حافظ یک دیگراند     کائنات زندگی را محور اند

سورۃ حدید میں اسی ضمن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے رسولوں کو بھیجا - ان کے ساتھ ضابطہؑ قوانین نازل کیا - اور فولاد (شمشیر) بھی - فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ( $\frac{۵۷}{۲۵}$ )- جس میں سخت قوت ہے اور نوع انسانی کے لئے فوائد کثیر - واضح رہے کہ قرآن کریم اور شمشیر کے ساتھ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کو شمشیر کے زور سے منوایا جائے گا - اس

*محیط - **محیط و لسان العرب -

کے معنی یہ ھیں کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا جس میں قرآنی اصول و قوانین نافذ کئے جائیں گے - اسی قوت نافذہ کو شمشیر سے تعبیر کیا گیا ھے - وہ قوت جو دنیا میں عدل قائم رکھنے کا موجب بنتی ھے اور جس سے مجرمین کو تباہ کاریوں سے روکا جاتا ھے -

## ن و ی

نَوَى الشَّيْءَ يَنْوِيْهِ - کسی چیز کا قصد اور دل میں عزم کرنا- پختہ ارادہ کرنا ، اور اس کی طرف دل سے متوجہ ہونا - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں - (۱) کسی چیز کا قصد اور (۲) کسی چیز کی گٹھلی - اَلنِّیَّةُ - وہ سمت جس کی طرف سفر کیا جائے* - دل سے کسی کام کا عزم کرنا - بعض کا خیال ھے کہ اس کے معنی ھیں دل کا جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کے لئے کسی مناسب کام کے لئے آمادہ ھونا** - نَوَاكَ اللّٰهُ - خدا سفر میں تیرے ساتھ رھے اور تیری حفاظت کرے - اَلنَّوِیُّ - رفیق یا رفیقِ سفر* - هم نیت - اَلنَّوَاةُ - گٹھلی - اس کی جمع اَلنَّوَی ھے - (۶/۹۶)- نَوَاةُ التَّمْرِ - کھجور کی گٹھلی -

## ن ھ ج

اَلنَّهْجُ - اَلْمِنْهَاجُ - واضح راستہ - اَنْهَجَ الطَّرِيْقُ وَالْاَمْرُ - راستہ اور معاملہ واضح ھو گیا - نَهَجَ الْاَمْرُ کے بھی یہی معنی ھیں - فُلَانٌ اسْتَنْهَجَ طَرِيْقَ فُلَانٍ - فلاں آدمی فلاں کے طریق پر چلا*** -

قرآن کریم میں ھے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (۵/۴۸) - ”ھم نے تم میں سے ھر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا“ - (اس کے تفصیلی مفہوم کے لئے عنوان ش - ر - ع دیکھئے) -

## ن ھ ر

نَهْرٌ - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھلنے یا کھولنے کے ھیں - اَنْهَرْتُ الدَّمَ - میں نے خون کو کھول دیا اور بہا دیا - نَهْرٌ کے معنے ھیں پانی بہنے کی جگہ - بعض نے کہا ھے کہ نَهْرٌ در اصل پانی کو کہتے ھیں اور اس کے بہنے کی جگہ کو مجازاً نَهْرٌ کہہ دیتے ھیں - اس کی جمع اَنْهَارٌ ھے - اَلنَّهَرُ - بمعنی نَهْرٌ ھے - نیز اس کے معنی وسعت و فراخی اور روشنی بھی ھیں - چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ھے

*تاج - **محیط - ***تاج و محیط و راغب -

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (۵۴/۵۴) ۔ تو اس میں نَهَرٌ کے معنی روشنی اور فراخی کے ہیں ۔ اَلنَّهِيْرُ کے معنی ہیں کثیر اور وافر* ۔ روشنی کی جہت سے اَلنَّهَارُ دن کے لئے بولا جاتا ہے ۔ یعنی لَيْلٌ کی ضد ۔ اَلنَّهْرَةُ کے معنے کسی چیز کو اچک کرلے جانا بھی ہیں ۔ اسی لئے نَهَرَ الرَّجُلَ نَهْرًا کے معنی ہیں اس آدمی نے دن میں حملہ کیا* ۔ غالباً اسی جہت سے نَهَرَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے آدمی کو جھڑک دیا ۔ اَلْمَنْهَرَةُ ۔ مکانات کے سامنے کی کھلی جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے* ۔ یہاں سے وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰) کے معنی واضح ہوجاتے ہیں ۔ یعنی صاحبِ احتیاج کو ذلیل و حقیر نہ سمجھ ۔ اور (۱۷/۲۳) میں والدین کے متعلق جو کہا ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْ هُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳) تو وہاں بھی لَا تَنْهَرْ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انہیں جھڑکو نہیں ۔ ان کی تحقیر مت کرو ۔ اور ان سے شرافت سے بات کرو ۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق بار بار آتا ہے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ (۲/۲۵) ۔ ان باغات کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی ۔ پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نہر کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن عربی زبان میں نَهْرٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہ رہا ہو ۔ اس میں دریا ، ندی ، نہر سب ہی آ جاتے ہیں ، جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں** ۔

قرآن کریم کے ان مقامات میں جہاں جہاں جنت سے مراد دنیوی زندگی میں جنتی معاشرہ ہے ، اس کی انہار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گا ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) ۔ اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہونگی ۔ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ (۱۴/۲۵) ۔ وہ اپنے پھل ہمیشہ دیتا رہتا ہے ۔

اور جہاں جنت سے مراد اُخروی جنت ہے ، ۔ تو اس کی تمام تفاصیل تمثیلی ہیں ۔ (۱۳/۳۵ و ۴۷/۱۵) ۔ لہذا وہاں بھی اَنْهَارٌ سے مراد اس قسم کی نہریں نہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں ۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانی کو زندگی کہا ہے (۲۱/۳۰) اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے ۔ اس لئے جس معاشرہ میں آبِ رواں کی فراوانی ہو اس میں زندگی کی فراوانی ہوگی ۔ ''باغات میں نہریں رواں ہونے'' سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرسبزیاں ہیں ۔

---

*تاج ۔ **لین ۔

# ن ھ ی

نَهَاهُ يَنْهَاهُ نَهْيًا ۔ اَمَرَ کی ضد ہے ۔ روکنا ۔ منع کرنا ۔ باز رکھنا ۔ اِنْتَهٰی ۔ رک جانا ۔ باز آجانا ۔ اَلنُّهْيَةُ ۔ کسی چیز کی انتہا اور آخری حد کو کہتے ہیں ۔ اَلنِّهَايَةُ کے بھی یہی معنی ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں ۔ یعنی انتہا تک پہنچ جانا ۔ انتہا تک پہنچکر ہر بات رک جاتی ہے ۔ اس لئے اس کے معنی رک جانے کے آئے ہیں ۔ اَلنُّهْيَةُ ۔ عقل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو بعض امور سے روکتی ہے ۔ اسکی جمع النُّهَی ہے* ۔ (خود عَقْلٌ کے معنی بھی روکنے کے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ق ۔ ل ) ۔ رَجُلٌ مَنْهَاةٌ ۔ وہ شخص جس کی رائے پر لوگ اعتماد کریں* ۔

قرآن کریم میں ہے فَاِنِ انْتَهَوْا (۲/۱۹۳) ۔ ’’ اگر وہ لوگ لڑائی سے رک جائیں ‘‘ ۔ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بمقابلہ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (۳/۱۰۹) آیا ہے ۔ یعنی معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا ۔ یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے ۔ (مَعْرُوْفٌ اور مُنْكَرٌ کے لئے دیکھئے عنوانات (ع ۔ ر ۔ ف ) اور (ن ۔ ک ۔ ر)۔ اُولِی النُّهٰی (۲۰/۵۴) ۔ صاحبان عقل و بصیرت ۔ اِنْتَهٰی (۲/۲۷۵) رک جانا ۔ اَلْمُنْتَهٰی ۔ انتہائی کنارہ ۔ آخری حد ۔ (۵۳/۱۴) ۔ (سِدْرَةٌ کے لئے عنوان س ۔ د ۔ ر دیکھئے )

---

*تاج ۔

# و

## وَ (حرف)

وَ ۔ (۱) ''اور'' (And) کے معنوں میں ۔ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ (۳۲/۲۷) ۔ ان کے چوپائے اور وہ خود . . .

(۲) مَعَ (ساتھ) کے معنوں میں ۔ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ (۱۰/۷۱) ۔ تم اپنے معاملہ کو اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر بالکل پختہ کرو ۔

(۳) اَوْ (یا) کے معنوں میں ۔ بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱) ۔ اللہ کے عہد کے ذریعہ یا لوگوں کے عہد کے ذریعے ۔

(۴) تاکہ ۔ کے معنوں میں ۔ یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُکَذِّبَ (۶/۲۷) اے کاش ہم واپس بھیجدیئے جاتے تاکہ ہم پھر تکذیب نہ کرتے ۔ (یہاں دراصل کَیْ یا لامِ تعلیل محذوف ہے) ۔

(۵) یعنی ۔ کے معنوں میں ۔ اسے واوِ تفسیری کہتے ہیں اور اس کا استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ یعنی یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ واو عاطفہ (اور کے معنوں میں) ہے یا واو تفسیری (یعنی کے معنوں میں) ۔ مثلاً قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ (۲۱/۶۹) ۔ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا ۔ اور یہ بھی کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی یعنی سلامتی والی (نقصان نہ پہنچانے والی ٹھنڈک) ہو جا ۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہاں واو کا ترجمہ یعنی زیادہ موزوں ہے ۔

(۶) قسم کے لئے ۔ وَ الْعَصْرِ (۱۰۳/۱) ۔ زمانہ کی قسم ۔ یا زمانہ اس پر شاہد ہے کہ ۔

(۷) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَ تَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنَاهُ (۳۷/۱۰۳، ۱۰۴) ۔ سو جب وہ دونوں جھک گئے اور اس نے (بیٹے کو) کنپٹی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی ۔ (یہاں ۔ وَ ۔ کے بغیر بھی معنے وہی رہتے ہیں) ۔

(۸) ''حالانکہ'' ۔ ''دراں حالیکہ'' ۔ کے معنوں میں (اسے واو حالیہ کہتے ہیں) ۔ وَ أَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ (۲/۴۴) ۔ دراں حالیکہ تم کتاب کی پیروی (یا تلاوت) کرتے ہو ۔ نیز وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲) ۔ دراں حالیکہ تم (خوب) جانتے ہو ۔

# و أ د

اَلْوَأْدُ وَ الْوَئِيْدُ ۔ بلند اور سخت آواز ۔ اونٹ کی بڑبڑاہٹ ۔ وَأَدَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی کو گرانبار کر دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ چنانچہ بوجھ لیکر چلنے والے اونٹوں کی گراں رفتاری وَئِيْدٌ کہلاتی ہے ۔ یہیں سے وَأَدَ الْبِنْتَ يَئِدُ وَأْدًا کے معنی ہیں (لڑکی کو) زندہ زمین میں دفن کر دیا ۔ اور مٹی تلے دبا دیا ۔ مٹی کا بوجھ اس پر ڈال دیا ۔ عرب جاہلیت میں قبیلہ کندہ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے* ۔ اس لڑکی کو جسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جاتا اَلْمَوْءُوْدَةُ وَ الْوَئِيْدَةُ کہتے تھے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ إِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۸۔۹) ۔ جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم کی سزا میں یوں مار دیا گیا تھا ۔ رسول اللہ ؐ عورتوں سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی ۔ (۶۰/۱۲) ۔ اس سے (غالباً) بھی لڑکیاں مراد ہیں، بجز اس کے کہ یہاں قَتْل سے مراد اولاد کو تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ہو ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ت ۔ ل و ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

اس سے مراد صرف عرب جاہلیت کے زمانہ کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لڑکیاں ہیں جنہیں ہمارے معاشرہ میں ''زندہ در گور'' کر دیا جاتا ہے ۔ جو اپنی ساری عمر اس طرح بسر کردیتی ہیں کہ نہ مردہ ہیں نہ زندہ ۔ وہ گھروں میں نہیں ہوتیں ، قبروں میں دفن شدہ ہوتی ہیں جہاں سے ان کی نجات کی کوئی شکل نہیں ہوتی ۔ جب تک ہمارے معاشرہ میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین قرآن کریم کے مطابق نہیں ہوتے ، بیچاری بے زبان لڑکیوں کی حالت ایسی ہی رہے گی ۔ اور ان کی نشو و نما کی صلاحیتیں دفن ہی رہینگی ۔

*تاج و محیط ۔

# و أ ل

وَئَلَ اِلَیْہِ ۔ یَئِیلُ وَأْلاً ۔ کسی کی طرف پناہ لی ۔ اس کی طرف تیزی سے گیا ، اس کی طرف پلٹا ۔ وَاَلَ مِنْہُ۔ اس سے نجات چاھنا ۔ اَلْوَاْلُ وَ الْمَوْئِلُ وَ الْمَوْاَلَۃُ ۔ نجات اور پناہ کی جگہ ۔ جائے پناہ ۔ اَلْاَلَۃُ الرَّجُلِ ۔ آدمی کے گھر والے جن کی طرف وہ پناہ لیتا ھے* ۔ ابن فارس نے اس کے معنی مجتمع ھونے اور پناہ لینے کے لکھے ھیں ۔

سورۂ کہف میں مَوْئِلاً (۱۸/۵۸) پناہ اور بچاؤ کی جگہ کے معنوں میں آیا ھے ۔

# و ب ر

اَلْوَبَرُ (جمع اَوْبَارٌ) ۔ اونٹ ، خرگوش اور لومڑی کے بال ۔ اَھْلُ الْوَبَرِ ۔ بادیہ نشین** ۔ قرآن کریم میں اَوْبَارٌ ۔ (۱۶/۸۰) آیا ھے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ص ۔ و ۔ ف) ۔

# و ب ق

وَبَقَ ۔ یَبِقُ ۔ وَبَقًا و وُبُوْقًا وَ مَوْبِقًا ۔ ھلاک ھونا ۔ اَلْمَوْبِقُ ۔ ھلاکت گاہ ۔ مَوْبِقٌ روک اور آڑ کو بھی کہتے ھیں ، اور قید خانہ کو بھی ۔ اَوْبَقَہٗ اس نے اسے روک دیا ۔ قید کر دیا ۔ نیز ھلاک کردیا*** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اَلْمَوْبِقُ ھر اس چیز کو کہتے ھیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ھو جائے۔ اور وَبَقَ کے معنی ھیں ھلاک ھو جانا ۔ سورۂ کہف میں ھے ۔ وَ جَعَلْنَا بَیْنَہُمْ مَوْبِقًا (۱۸/۵۲) ۔ اس کے دونوں معنی ھوسکتے ھیں ۔ یعنی ان کے درمیان آڑ یا روک بنا دی یا ان کے باھمی تعلقات کو ان کے لئے وجہ ھلاکت بنا دیا ۔ سورۂ شوریٰ میں ھے ۔ اَوْ یُوْبِقْھُنَّ (۴۲/۳۴) ۔ یا اُنہیں تباہ و برباد کردے ۔ چنانچہ اَلْمُوْبِقَاتُ ھلاک کرنے والے گناھوں کو کہتے ھیں*** ۔

# و ب ل

اَلْوَبْلُ ۔ اَلْوَابِلُ ۔ موسلا دھار بارش** ۔ (۲/۲۶۴) ۔ اَلْوَبِیْلُ ۔ شدید** ۔ تَاخُذُ تَاہُ اَخْذًا وَّبِیْلاً (۷۳/۱۶) ۔ ضَرْبٌ وَبِیْلٌ ۔ سخت مار ۔ وَبِیْلٌ دراصل دھوبی کی اس موگری کو کہتے ھیں جس سے وہ کپڑوں کو کوٹتا ھے** ۔ اسی

*تاج و محیط و اقرب الموارد ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔

سے اَلْوَبَالُ ۔ شدت ، سختی ، ناپسندیدہ ، فساد ، نیز بمعنی مصیبت اور ناموافق وناسازگار آتا ہے*۔ وَبَالَ اَمْرِہٖ (۵/۹۵) ۔ اپنے کام کا برا نتیجہ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں شدت (سختی) پائی جاتی ہے ۔ نیز اکٹھا ہونا ۔

## و ت د

اَلْوَتَدُ ۔ کھونٹا اسکی جمع اَوْتَادٌ ہے ۔ وَتَدَ الْوَتِدَ یَتِدُہٗ وَتْدًا ۔ اس نے زمین یا دیوار میں میخ یا کھونٹی گاڑ دی ۔ اَلْمِیْتَدُ ۔ وہ ہتھوڑی جس سے میخ یا کھونٹی ٹھونکی جائے ۔ اَلْوَاتِدُ ۔ ثابت (محکم گڑی ہوئی) چیز ۔ وَتَدَ فُلَانٌ رِجْلَہٗ فِی الْاَرْضِ ۔ فلاں نے زمین میں اپنا قدم جما لیا ۔ اسی سے اَوْتَادُ الْاَرْضِ پہاڑوں کو کہتے ہیں اور اَوْتَادُ مِنَ الْبِلَادِ شہروں کے رؤساء اور امراء کو**۔

قرآن کریم نے فرعون کو ذُوالْاَوْتَادِ (۳۸/۱۲) کہا ہے ۔ اس کے معنی ہیں بڑی محکم قوتوں کا مالک۔ جسکے کھونٹے دور دور تک گڑے ہوئے تھے ۔ اور پہاڑوں کو بھی اَوْتَادًا (۷۸/۷) کہا ہے کیونکہ وہ بھی کھونٹوں کیطرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں ۔

(اہل تصوف کے ہاں جو ابدال اور اوتاد کی اصطلاحات ہیں وہ قرآنی نہیں) ۔

## و ت ر

اَلْوَتْرُ ۔ اَلْوِتْرُ ۔ فرد ، یعنی اکیلی چیز ۔ (شَفْعٌ کے خلاف)**۔ قرآن کریم میں وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹/۳) آیا ہے ۔ عددِ طاق (Odd) ۔ برخلاف عددِ جفت ۔ وَتَرَہٗ مَالَہٗ وَحَقَّہٗ ۔ اس نے اس کا مال اور حق کم کر دیا ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَنْ یَتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ (۴۷/۳۵)۔ وہ تمہارے اعمال (کے ثمرات) کو کم نہیں کریگا ۔ وَتَرَ کے معنی بدلہ لینا اور اس میں زیادتی کرنا بھی ہیں ۔ نیز جوڑے کو الگ الگ کر دینا** ۔ اَلْوِتْرُ ۔ قتل کے سبب سے عداوت اور دشمنی***۔

تَتْرٰی (اصل میں وَتْرٰی تھا۔ واو ، تاء سے بدل گئی) چیزوں کا اسطرح پے درپے آنا کہ ان کے درمیان کچھ وقفہ ہو ۔ اگر وہ مسلسل طور پر آتی رہیں تو انہیں مُتَوَاتِرٌ نہیں کہینگے بلکہ مُتَتَابِعٌ یا مُتَدَارِکٌ یا مُتَوَاصِلٌ کہینگے ۔ جَاءَتِ الْخَیْلُ تَتْرٰی کے معنی ہوتے ہیں

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ ***محیط ۔

گھوڑے یکے بعد دیگرے کچھ کچھ وقفہ کے بعد آئے۔ مُوَاتَرَۃٌ الصَّوْمِ۔ ایک دن روزہ رکھنا اور پھر ایک یا دو دن کا ناغہ کر دینا۔ مُوَاتَرَۃٌ میں وقفہ لازمی ہے۔ اگر وقفہ نہ ہو تو اسے مُدَارَکَۃٌ ومُوَاصَلَۃٌ کہینگے***۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا (۲۳/۴۴)۔ پھر ہم نے اپنے رسولوں کو وقفوں کے ساتھ متواتر بھیجا۔ اَلْوَتِیْرَۃُ۔ کسی کام پر مداومت کرنا***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے جو مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں عدم مشابہت کی بنا پر قیاس کام نہیں کرتا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔

## و ت ن

اَلْوَاتِنُ۔ اپنی جگہ مقیم، ثابت اور ہمیشہ رہنے والی چیز۔ اَلْمَاءُ الْوَاتِنُ۔ ہمیشہ بہنے والا پانی جو ختم نہ ہو۔ اَلْوَتِیْنُ۔ رگ جان، جس کے کٹ جانے سے انسان مرجاتا ہے*۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْہُ الْوَتِیْنَ (۶۹/۴۶)۔ پھر ہم اسکی رگِ جان کاٹ دیتے۔

## و ث ق

وِثَاقٌ۔ یا وَثَاقٌ۔ اس رسی، بیڑی یا بندھن وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ وَثَاقٌ باندھنے کو اور وِثَاقٌ رسّی کو کہتے ہیں۔ اَوْثَقَہٗ۔ اسے رسّی سے کس کر باندھ دیا*۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا یُوْثِقُ وَثَاقَہٗ اَحَدٌ (۸۹/۲۶ نیز ۴۷/۴)۔ وَثُقَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں وہ چیز محکم اور مضبوط ہو گئی*۔ قرآن کریم میں العُرْوَۃُ الْوُثْقٰی کی تفسیر لَا انْفِصَامَ لَھَا نے کردی (۲/۲۵۶)۔ یعنی جو ٹوٹ نہ سکے۔ مِیْثَاقٌ اور مَوْثِقٌ کے معنی ہیں پکا وعدہ۔ مستحکم عہد۔ وَثِقَ بِہٖ کے معنی ہیں کسی پر اعتماد کرنا۔ اسے امانت دار سمجھنا*۔ اِسْتَوْثَقَ مِنْہُ۔ اس سے قابل اعتماد عہد حاصل کرلیا*۔ کَـلَاٌ مُسْتَوْثَقٌ۔ اتنا وافر چارہ جس پر اعتماد کرلیا جائے کہ یہ سال بھر کے لئے کافی ہو جائیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمِیْثَاقُ اس عہدو پیمان کو کہتے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد ہو**۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و راغب۔

# و ث ن

وَثَنَ بِالْمَكَانِ ۔ وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا ۔ اَلْوَاثِنُ ۔ مقیم اور جما ہوا ۔ جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وَثَنٌ بُتٌ کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا *۔ (جمع اسکی اَوْثَانٌ ہے $\frac{۲۹}{۱۷}$) ۔ تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وَثَنٌ چھوٹے صَنَمْ (بت) کو کہتے ہیں ۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور، یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ ہے ۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں بدترین قسم کا وَثَنٌ ہے جسکی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے ۔

قرآن کریم تمام نوع انسان کے لئے مستقل ضابطہ حیات ہے جسے جب عملی شکل دی جائے تو ایک متحرک معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔ '' متحرک '' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتا ہوا زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک ( Dynamic Movement ) کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے ، اس میں جمود پیدا ہو جائے ، تو یہ '' وثنیت '' ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ بدقسمتی سے ہم پتھر کے بتوں کو تو دیکھتے اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں لیکن اپنے قلب و دماغ میں رکھے ہوئے بتوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتے!

# و ج ب

وَجَبَ الْبَعِيْرُ تَوْجِيْبًا ۔ اونٹ نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور جم کر بیٹھ گیا * ۔ اَلْمُوَجِّبُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو فربہی کی وجہ سے اٹھ نہ سکے ۔ اس اعتبار سے وَجَبَ الْحَائِطُ کے معنی ہیں دیوار گر پڑی ۔ وَجَبَ الرَّجُلُ وُجُوْبًا ۔ آدمی مر گیا ۔ (یعنی ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا ) ۔ اَلْوَجْبَةُ ۔ کسی چیز کا آواز کے ساتھ گرنا ۔ اَلْمُوْجِبُ موت کو کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ذبح کردہ اونٹوں کے متعلق ہے فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا ($\frac{۲۲}{۳۶}$) ۔ جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں، یعنی ٹھنڈے ہو جائیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ گر پڑنا اور واقع ہو جانا اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے ۔ وَجَبَ الشَّيْئُ ۔ کسی چیز کا پختہ طور پر جمنا اور

*تاج و راغب ۔

لازم اور ضروری ہونا ۔ اَوْجَبَہٗ ۔ وَجَّبَہٗ ۔ اس نے اسے جمایا اور لازم کر دیا۔ اِسْتَوْجَبَہٗ ۔ وہ اسکا مستحق ہو گیا * ۔ نیز اس کے معنی ہیں ، اس نے اُسے واجب سمجھا * ۔ وَاَجَبَ لِفُلَانٍ حَقَّہٗ ۔ اس نے اسکے حق کی رعایت کی ** ۔

# و ج د

وَجَدَ وُجُوْدًا کے بنیادی معنی کسی چیز کو پا لینا ہیں ۔ کبھی کسی چیز کو جاننے اور اس کا علم حاصل کرلینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ لیکن یہ فعل، مصدر و ابواب یا صلوں کے فرق کے ساتھ اورمعنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً مَوْجِدَةً وَ وِجْدَانًا غصے کے لئے آتا ہے ۔ وَجَدَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس پر ناراض ہوا ۔ نیز وَجَدَ یَجِدُ کے معنے مالدار اور فارغ البال ہونا بھی ہیں ۔ چنانچہ اَلْوِجْدُ ۔ اَلْوَجْدُ اور اَلْوُجْدُ ۔ مالداری ۔ فراخی ۔ اور وسعت کو کہتے ہیں ۔ وَجَدَ بِہٖ وَجْدًا ۔ اس سے محبت کی ۔ اِنَّہٗ لَیَجِدُ بِفُلَانَۃَ وَجْدًا شَدِیْدًا ۔ وہ فلاں عورت کی محبت کرتا اور اس کی جدائی میں غمگین رہتا ہے ۔ وَجَدَ بِہٖ ۔ اس نے اسے چاہا اور غمگین ہوا ۔ اَلْوَجِیْدُ ۔ ہموار زمین کو کہتے ہیں *** ۔ اَلْوَاجِدُ ۔ غنی ۔ تونگر ۔ دولتمند *** ۔ وُجْدٌ ۔ استطاعت ، مقدرت (٦٥/٦) ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ (٢/٩٦) تو انہیں سب سے زیادہ حریص پائیگا ۔ یہ لفظ زیادہ تر انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے ۔ وُجُوْدٌ یا مَوْجُوْدٌ وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نہیں آئے ۔ یہ متکلمین کی اصطلاحات ہیں ۔

# و ج س

اَلْوَجْسُ ۔ خفی آواز یا دل کی گھبراہٹ کو کہتے ہیں۔ اس سے اَلْوَاجِسُ دل میں گذرنے والی بات کو کہتے ہیں ۔ اَلْاِیْجَاسُ ۔ دل ہی دل میں کسی بات کو محسوس کرنا اور اسے پوشیدہ رکھنا ۔ یونہی ذرا سا احساس ہونا یا خیال گذرنا جس میں خوف کا بھی شائبہ ہو* ۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً (١١/٧٠)۔ اس نے ان کی طرف سے دل ہی دل میں ذرا خوف محسوس کیا۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔

## و ج ف

وَجَفَ الشَّیْءُ ۔ چیز کا مضطرب ہونا ۔ قَلْبٌ وَاجِفٌ ۔ مضطرب (تیز دھڑکنے والا) دل*۔ قرآن کریم میں ہے ۔ قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَۃٌ ( ۷۹/۸ ) ۔ اس دن دل مضطرب و پریشان ہونگے ۔

وَجَفَ الْفَرَسُ ۔ گھوڑے کا تیز دوڑنا ۔ اَوْجَفْتُہٗ ۔ میں نے اسے تیز دوڑایا* ۔ سورۃ حشر میں ہے ۔ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ ( ۵۹/۶ ) ۔ تم نے اس پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے ۔ لشکر کشی نہیں کی ۔

## و ج ل

اَلْوَجَلُ ۔ گھبراہٹ اور خوف ۔ وَجِلَ ۔ یَوْجَلُ ۔ گھبرانا ۔ ڈرنا ۔ ڈرنے اور گھبرانے والے کو وَجِلٌ کہتے ہیں ، اس کی جمع وَجِلُوْنَ ہے ۔ ( ۱۵/۵۲ ) ۔ اَلْوَجِیْلُ ۔ اَلْمَوْجِلُ ۔ گڑھا جس میں پانی اکٹھا ہو جائے ۔ اَلْوُجُوْلُ ۔ بوڑھے لوگ** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْوَجَلُ ۔ دل ہی دل میں خوف کے احساس کرنے کو کہتے ہیں*** ۔

قرآن کریم میں مومنین کی صفت یہ لکھی ہے کہ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ ( ۸/۲ ) ۔ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ دوسرے مقامات میں بتایا گیا ہے ، خدا کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کے قوانین کے خلاف روش اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے ۔ اس تباہی اور بربادی کے احساس سے انسان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ اسی کو خدا کا خوف کہتے ہیں ۔ یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج و عواقب کا احساس ۔

## و ج ہ

وِجَاہُ الشَّیْءِ ۔ کسی چیز کے سامنے یا بالمقابل**** ۔ اَلْوَجْہُ ۔ کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے سامنے آنے کے ہیں ۔ اس جہت سے اَلْوَجْہُ انسان کے اس حصۂ جسم کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے ۔ اور

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****محیط ۔

چونکہ انسان کا چہرہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اس لئے اسے وَجْہٌ کہتے ہیں*۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ خود نفس شے یا ذات کے لئے بھی بولا جانے لگا**۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ (۲/۱۱۲) میں وَجْہٌ کے معنی پورا اپنا آپ ہیں نہ کہ اپنا چہرہ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ (۱۷/۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ وہ تمہارا برا حال کردیں۔ یا یہ کہ وہ تمہارے سرداروں کا برا حال کردیں۔ وَجْہُ الْقَوْمِ۔ قوم کے معزز اور شریف فرد یا سردار کو کہتے ہیں۔

وَجْہُ النَّهَارِ۔ دن کا ابتدائی حصہ۔ اَلْوَجْہُ مِنَ الدَّهْرِ۔ زمانہ کا ابتدائی حصہ۔ یعنی زمانہ کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے**۔

اَلْوَجْہُ۔ جاہ۔ مرتبہ اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْوَجِيْہُ۔ صاحب جاہ۔ صاحب وجاہت۔ اَلْوَجِيْهَةُ۔ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے ایک جیسا ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (۳۳/۶۹)۔ اس کے معنے صاحب عزت کے ہیں۔

وَجْہٌ کے معنی ہوتے ہیں مقصد (Purpose)۔ مطلوب (Object)۔ راستہ، جو مقصد تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا جائے (Course)۔ سمت (Direction) جس طرف کوئی جا رہا ہو۔ وہ منزل مقصود جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔ چنانچہ وَجْہُ الطَّرِيْقِ۔ اس منزل کو کہتے ہیں جس کی طرف راستہ لیے جا رہا ہو***۔ اور وَجْہُ الْاَمْرِ کسی بات کے مقصد اور اس کے صحیح رخ کو کہتے ہیں۔ (جِهَةٌ اور وِجْهَةٌ کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں۔ سمت۔ مقصد۔ وجہ۔ سبب)۔ مُتَوَجَّهٌ۔ وہ مقام جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔

قرآن کریم نے انسانی اعمال کی غایت یہ بتائی ہے۔ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (۲/۲۷۲)۔ عام طور پر اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کی رضا جوئی یا خوشنودی کے لئے۔ اس سے ذہن انسانوں کے خوشی یا ناراضگی کے جذبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے بلند و بالا ہے۔ وَجْہُ اللّٰهِ کا صحیح مفہوم ہے وہ مقصود جو اللہ نے مقرر کردیا ہے۔ وہ منزل جسکی طرف قوانین خداوندی لیے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لئے ہونا چاہئے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کردیا ہے۔ اس کا ہر کام اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہونا چاہئے جو قوانین خداوندی نے اس کے

*محیط۔ **تاج نیز لطائف اللغۃ۔ ***لین۔

لئے مقرر کر دی ہے - سورۃ روم میں ہے وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ (۳۰/۳۹) - جو کچھ تم نوعِ انسانی کی نشوو نما کے لئے کرتے ہو، اس مقصد کے پیش نظر کہ تم اُس منزل تک پہنچ جاؤ جو قوانین خداوندی نے مقرر کر رکھی ہے - یعنی اس سے خود تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما اور صلاحیتوں کی نمود ہو جائے - اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (۲۸/۸۸) - اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تغیر پذیر ہوتا ہے (ھَالِکٌ کے یہی معنی ہیں) لیکن استمرار اور دوام ان اعمال کو حاصل ہوتا ہے جو اس منزل کے حصول کے لئے سرزد ہوں جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے - یا یہ کہ دنیا کا ہر راستہ تغیر پذیرہوتا ہے، بجز اس راہ کے جو خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جاتی ہے* - یہی مفہوم سورۃ رحمٰن کی ان آیات کا ہے - کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷) - دنیا کا ہر نظام اور ہر راستہ تغیر پذیر ہے بجز اس راستے کے جو خدائے ذوالجلال و الاکرام کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے جائے* - اسی کو اِبْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی (۹۲/۲۰) کہا گیا ہے - دنیا میں ہر شخص کا اپنا اپنا مقصود و مطلوب اور ہر قوم کی اپنی اپنی منزل ہے - وَلِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا (۲/۱۴۸) - جماعت مومنین وہ ہے کہ وہ زندگی کے جس گوشے اور کار و بارِ حیات کے جس شعبے میں بھی ہو اس کے سامنے ہمیشہ وہ منزل مقصود رہتی ہے جو قوانینِ خداوندی نے متعین کر دی ہے - فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (۲/۱۱۵) -

## و ح د

اَلْوَاحِدُ - گنتی میں پہلا عدد - ایک - وَاحِدٌ اوراَحَدٌ دونوں کے معنی "ایک" ہیں لیکن ان کے استعمال کا فرق اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا کہ جب کہا جاتا ہے کہ مَا اَتَانِیْ مِنْھُمْ اَحَدٌ تو اس کے معنی ہونگے میرے پاس ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا - لیکن جب کہا جائے گا کہ جَآءَنِیْ مِنْھُمْ وَاحِدٌ تو اس کے معنی ہونگے ان میں سے میرے پاس صرف ایک شخص آیا (دو نہیں آئے)** - ابن فارس نے کہا ہے کہ ھُوَ وَاحِدُ قَبِیْلَتِہٖ کے معنی ہیں وہ اپنے قبیلہ میں یکتا ہے -

---

*وَجْہُ رَبِّکَ یا وَجْھَہٗ کے معنی خود ذاتِ خداوندی بھی ہیں [دیکھئے عنوانات (ب - ق - ی) اور (ف - ن - ی)] لیکن راغب نے ان معانی کو ترجیح دی ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں - ** تاج -

قرآن کریم میں اللہ کے لئے وَاحِدٌ بھی آیا ہے (۲۲/۳۹) اور اَحَدٌ بھی (۱۱۲/۱)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَحَدٌ وہ ہے جسکی ذات میں کوئی اور شریک نہ ہو اور وَاحِدٌ اسے کہتے ہیں جسکی صفات میں کوئی اور شریک نہ ہو*۔ چنانچہ اَحَدٌ کے معنی ہونگے وہ ذات جو بے مثل و بے نظیر ہو۔ جو یگانہ ہو۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت (Basic characteristic) یہ ہے کہ وہ یگانہ (Unique) ہو۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲/۱) میں ذات خداوندی کی اس بنیادی خصوصیت، یعنی اسکی یگانگت (Uniqueness) کا ذکر ہے۔

اَلْاُحْدَانُ ان تیروں کو کہتے ہیں جو یکتا اور بے نظیر ہوں**۔ اَلْمِیْحَادُ۔ اس ٹیلے کو کہتے ہیں جو دوسرے ٹیلوں سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہو*۔ اِتَّحَدَ الشَّیْئَانِ۔ دونوں چیزیں خلط ملط ہو کر ایک ہو گئیں۔ مجازاً یہ لفظ متفق ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے*۔

قرآنی تعلیم کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے، یعنی اس حقیقت کے اعتراف اور یقین پر کہ کائنات میں صرف ایک قوت ہے جس کا اقتدار و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی اور قوت کا آئین و قانون نہیں چلتا۔ لہذا انسانوں کی دنیا میں بھی اُسی کا قانون و آئین چلنا چاہئے۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا۔ (۱۸/۲۶) وہ اپنے حکم اور قانون میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اسلئے مومن وہ ہے جو لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّہٖ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ جو اپنے رب کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ جو خدا کے قوانین کے علاوہ (جنہیں اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے) اور کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکتا۔

(نیز دیکھئے عنوان ا۔ ح۔ د)۔

## و ح ش

اَلْوَحْشُ۔ جنگلی جانور جو انسانوں سے مانوس نہ ہو۔ جمع وُحُوْشٌ ہے۔ ایک کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ (مَکَانٌ وَحْشٌ) بے آباد ویران جگہ سے منسوب چیز کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ مَکَانٌ وَحْشٌ۔ خالی جگہ۔ بَلَدٌ وَحْشٌ۔ وہ علاقہ جو ویران ہو اور وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ بَاتَ وَحْشًا۔ اس نے بھوکے رات گذار دی۔ وہ خالی پیٹ رہا** اَلْوَحْشُ۔ اَلْاِنْسُ کی ضد ہے***۔ یعنی نامانوس، وحشی، جنگلی۔ ذَالِکَ مِنْ وَحْشِ النَّاسِ۔ یہ آدمی رذیل اور آدم بیزار لوگوں میں سے ہے*۔

*محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱/۵) ۔ اس میں وُحُوْشٌ کے معنی نامانوس جانور بھی ہو سکتے ہیں اور وحشی اور جنگلی لوگ بھی ۔

# و ح ی

اَلْوَحْیُ ۔ اشارہ ، جس میں تیزی اور سرعت ہو ۔ وَحَیْتُ لَکَ بِخَبَرِ کَذَا ۔ میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارا کر دیا ۔ یا چپکے سے مطلع کردیا*۔ چنانچہ سورہ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے کہ ان سے کہدیا گیا تھا کہ وہ لوگوں سے بات نہ کریں ۔ فَاَوْحٰی اِلَیْھِمْ (۱۹/۱۱) لہذا اس نے لوگوں کو اشارہ سے کہا ۔

(۲) راغب نے کہا ہے (اور صاحب تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے) کہ اَلْوَحْیُ کے معنی تیز اشارہ کے ہیں ۔ اسی لئے شَیْءٌ وَحِیٌّ کے معنی ہیں وہ چیز جو جلدی سے آجائے ، اور اَمْرٌ وَحِیٌّ ۔ تیز رفتار معاملہ ۔ اَلْوَحٰی جلدی ۔ تیزی کرنا ۔ اَوْحَی الْعَمَلَ ۔ اس نے کام میں جلدی کی*۔

(۳) اَلْوَحْیُ کے معنی کتابت (یعنی لکھنا) بھی ہیں ۔ وَحَیْتُ الْکِتَابَ ۔ میں نے کتاب کو لکھا ۔ واحٍ ۔ لکھنے والا (کاتب) ۔ اَلْوَحْیُ لکھی ہوئی چیز یا نامہ ۔ چنانچہ جوھری نے کہا ہے کہ اَلْوَحْیُ کے معنی اَلْکِتَابُ ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے ۔ اور ابن فارس اور راغب نے بھی ۔ سورہ مائدہ میں جو ہے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ (۵/۱۱۱) ۔ تو اس میں وحی کے معنی ''لکھے ہوئے حکم'' کے ہیں* ۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو (بقول راغب) حضرت عیسٰیؑ کی وساطت سے (انجیل میں لکھی ہوئی) بھیجی گئی تھی ۔

(۴) اَوْحٰی کے معنی حکم کرنا ۔ امر کرنا ۔ چنانچہ صاحب تاج نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت (۵/۱۱۱) میں حواریوں کی طرف وحی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں حکم دیا تھا* ۔ اور یہ وحی حضرت عیسٰیؑ کی وساطت سے حواریوں کو ملی تھی ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا علم ہو جائے ، وَحْیٌ کہلاتی ہے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو ۔ مخفی طور پر یا ویسے ہی ۔

سورہ حٰمٓ سجدہ میں ہے وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (۴۱/۱۲) ''اس نے ہر سماء میں اس کا امر وحی کر دیا'' اس میں امر وحی (یا وحیٌ

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔

امر) کے معنی مامور کرنے کے ہیں - یعنی وہ قانون خداوندی جسکی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے - اسی کو سورہ النور میں اسطرح بیان کیا گیا ہے - کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (۲۴/۴۱) - کائنات کی ہر شے جانتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور وہ مقصد کیا ہے جس کے حصول کے لئے انہیں سرگرم عمل رہنا ہے - یہی وہ وحی ہے جو ان میں جاری و ساری ہے - یعنی امر خداوندی - خدا کا قانون - اس کے متعلق سورہ زلزال میں ہے - بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹/۵) - یعنی اس مقصد کے لئے خدا نے زمین کی طرف وحی کی ہے - زمین کو اسکا حکم دے رکھا ہے - زمین کے متعلق خدا کا قانون یہ ہے - اسی طرح سورہ النحل میں ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (۱۶/۶۸) - شہد کی مکھی کی طرف خدا نے وحی کر رکھی ہے - یعنی اس کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرے -

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرم عمل ہے - یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شے میں ازخود ودیعت کر دی گئی ہے - اسی کو قانون فطرت کہتے ہیں - یا، جانداروں کے لئے جبلت ((Instinct) - یہ قانون ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے -

انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے اسلئے اسکے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسکا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے - جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے اس پر وہی قانون فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے - کھانا، پینا - سونا، جاگنا - افزائش نسل - بیماری، موت - سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے - یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں -

لیکن انسان کی زندگی طبیعی زندگی (Physical life) ہی نہیں بلکہ اسکی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ہے - نیز اس کی ذات (Personality) بھی ہے - اس کے لئے بھی ایسے قانون کی ضرورت ہے، اور وہ قانون ایسا ہونا چاہئے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ قانون فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو - اس قانون کا نام بھی وَحْیٌ ہے - لیکن فرق یہ ہے کہ :-

(۱) یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی - اس کےلئے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وحی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے - اُس انسان کو نبی اور رسول کہتے ہیں - یہ وحی انہیں حضرات سے مخصوص ہے -

(۲) کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے ۔ یہ اسلئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار و ارادہ استعمال کرے ۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لئے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلے ۔ اس لئے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہ راست دی جاتی ہے ، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انہیں بہر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے ۔

(۳) انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے ، لیکن یہ اسکے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کرکے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں ۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نگل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے ، لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے ۔

خدا کا قانون جو حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے ۔ اَلْوَحْیُ کہلاتا ہے ۔ اس کے خدا سے پانے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا ۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی، اور اس وحی کو انبیاء کرامؑ اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انہیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے ۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے ۔ خدا کی طرف سے نازل شدہ ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر اس تک پہنچتی ہے ۔ بالفاظ دیگر ، اس میں انسان کی داخلیت ( Subjectivity ) کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں یکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے ۔ منزل من اللہ کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کرسکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں

وہ صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں ۔ یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے ۔ یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عروس حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھا سکتا ۔ اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں ۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) ۔ اسے جبریل نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے ۔ چونکہ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی ہے اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوتی ہے ، وہ کس طرح ملتی ہے ۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے ۔ (البتہ ہم علم و بصیرت ۔ دلائل و براہین نیز وحی کے نتائج سے (Pragmatically) اس کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں) ۔ انبیاء کو یہ وحی کبھی ''اشارہ سریعہ'' کے ذریعے ملتی تھی، کبھی ''من وراء حجاب''۔ لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے ۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (۴۲/۵۱) ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے ۔ بشر کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء ۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ کی صورت میں ہوا) ۔ باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے ۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے، اسکے باہر اور کہیں نہیں ۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ ۲/۱۰۵ و ۳/۷۲)۔ یعنی رسول اللہؐ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے ۔ چونکہ رسول اللہؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہوگیا اس لئے اب کسی انسان کو براہ راست وحی نہیں مل سکتی ۔ اب انسان کے پاس علم کے دو ہی سرچشمے رہ گئے ۔ ایک اس کی اپنی عقل اور دوسری خدا کی وحی جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ اس کے علاوہ کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں ملتا ۔ الہام ۔ کشف وغیرہ کے تصورات کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ (الہام کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ہ ۔ م) ۔ قرآن کریم اور عقل کے ملنے سے انسانی علم مکمل ہو جاتا ہے ۔ نیز یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہؐ کو جو وحی ملی تھی اس کی دو قسمیں تھیں ۔ ایک وحی متلو (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کریم سے باہر (روایات کے اندر) ہے ۔

قرآن کریم میں وحی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں - اسکی رو سے صرف قرآن کریم وحی کے ذریعے ملا ہے ( ٦/١٩ ) - یہ تصور یہودیوں کے ہاں رائج تھا ، اور وہیں سے مسلمانوں کے ہاں آ گیا - رسول اللہؐ کے زمانے میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاحات کا کہیں ذکر نہیں ملتا -

(اس مقام پر وحی کے متعلق انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے - اگر آپ مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں تو میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں وحی کا باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے) -

اَوْحیٰ الَیْہِ - کے معنے رسول بنا کر بھیجنے کے بھی ہیں - چنانچہ اَوْحیٰ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے اپنے معتمد پیامی کو اپنے معتمد غلام کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا* - ابن الانباری نے کہا ہے کہ وحی کو وحی اسلئے کہتے ہیں کہ فرشتہ اسے پوشیدہ طور پر مخلوق میں سے اسی شخص کو پہنچاتا ہے جس کی طرف وہ بھیجی جاتی ہے - اِیْحَاءٌ کے اصلی معنی ایک کا دوسرے کے ساتھ علیحدگی میں خفیہ باتیں کرنا ہیں - ابو اسحٰق نے بھی کہا ہے کہ وحی کے اصلی معنی اِعْلَامٌ فِیْ خَفَاءٍ ہیں* - اسی لئے قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے مخالفین کے متعلق ہے یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلیٰ بَعْضٍ ( ٦/١١٣ ) - اس کے معنی خفیہ سازشوں کے ہیں (نیز ٦/١٢٢) - اِخْفَاء کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو دل میں ڈال دینا - چنانچہ اَوْحَتْ نَفْسُہٗ کے معنے ہیں اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا - اس کے دل میں خدشہ پیدا ہو گیا -

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ اَوْحَیْنَا اِلیٰ اُمِّ مُوْسیٰ ( ٢٨/٧ و ٢٠/٣٨ ) - ہم نے ام موسیٰ کی طرف وحی کی ''کہ اس بچے کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا'' - جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، وَحْیٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے ، یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو - چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کے معنے ہیں ، حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے حکم بھیجنا - اسی طرح والدہ موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہونگے ان کی طرف کسی کی وساطت سے حکم بھیجنا یا باخبر کر دینا - جس انداز سے انبیاء کی طرف وحی ہوتی تھی وہ

*تاج -

انہی سے مخصوص تھی۔ محض اَوْحَیْنَا کے لفظ سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ غیر نبی کی طرف بھی (اسی قسم کی) وحی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

یاد رکھئے وحی، جسکے معنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی حاصل ہونے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہ کو مل گئی اور اب وہ قرآن کریم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد انسانوں کو ان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے کچھ اور نہیں ملا۔ نہ ملے گا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے، یا دانستہ لوگوں کو فریب دیتا ہے۔

چونکہ وحی میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے قرآن کریم نے اسے ایسا اَلْعِلْمُ کہا ہے جو انسانی خیالات اور خواهشات سے یکسر متمیز ہوتا ہے (۲/۱۲۰)۔ اس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ رسول کی وحی میں اس کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳/۳-۵)۔ وہ اپنی خواهش سے نہیں کہتا بلکہ یہ وہ وحی ہے جو اسکی طرف بھیجی گئی ہے۔ بڑی قوتوں والے (خدا) نے اسے اس کا علم دیا ہے''۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نبی کے علاوہ اور کسی کو یہ علم نہیں مل سکتا۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (۷/۶۲)۔ ''میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔ لہذا جو حقائق وحی کی رو سے ملتے ہیں عقلِ انسانی انہیں دریافت نہیں کر سکتی۔ عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جسطرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔ عقل کے لئے قابل اعتماد راستہ وهی ہے جو وحی نے متعین کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء کرام کو وحی بالفاظ ملتی تھی۔ یعنی وحی کے الفاظ بھی خدا کیطرف سے ہوتے تھے۔ اَلْوَحْیُ کے معنے الطَّرِیْقُ الْمُعْتَمَدُ قابل اعتماد راستہ بھی ہیں (لطائف اللغۃ)۔

## و د د

اَلْوُدُّ۔ اَلْوِدَادُ۔ دوستی۔ محبت۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے محبت کرنا اور اسکے ہوجانے کی تمنا کرنا ہیں۔ اَلْمَوَدَّۃُ محبت۔ اَلْوَدُّ۔ میخ کو کہتے ہیں اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ اَلْوَتَدُ کا ایک لغت ہے (جس کا مادہ و۔ت۔د ہے) *۔

---

* تاج۔

قرآن کریم میں ہے ۔ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ (۲/۹۶) ۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ تمنا ہے ۔ سورہ مریم میں ہے سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹/۹۶)۔ خدائے رحمٰن ان کے لئے جاذبیت اور محبت پیدا کر دیگا ۔ اَلْوَدُوْدُ خدا کی صفت ہے ۔ (۸۵/۱۴) ۔ یعنی بہت زیادہ محبت کرنے والا ۔

سورہ روم میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق ہے کہ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً (۳۰/۲۱) ۔ تم میں باھمی مودّت پیدا کر دی ۔ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح جوڑ دیا کہ تم ایک دوسرے کے لئے تقویت (Support) کا موجب بن گئے ۔ سورہ ممتحنہ میں مَوَدَّۃً بمقابلہ عداوت آیا ہے (۶۰/۷) ۔

سورہ شوریٰ میں ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (۴۲/۲۳) ”تم ان سے کہدو کہ میں تم سے اس (رسالت) کا کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ میں صرف رشتہ داری کے تعلقات (مودت) چاھتا ھوں“ ۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ق ۔ ر ۔ ب دیکھئے ۔

## و دّ

وَدًّ ۔ سُوَاعٌ ۔ یَغُوْثُ ۔ یَعُوْقُ اور نَسْرٌ قومِ نوحؑ کے بت تھے۔ (۷۱/۲۳) ۔ عرب ان بتوں کے ناموں سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ وَدًّ نام کے ایک بت کی پرستش دومۃ الجندل میں قبیلہ بنو کاب کے ھاں ھوتی تھی۔

## و د ع

وَدَعَ ۔ یَدَعُ ۔ کوئی چیز ٹھہر گئی ۔ قرار پا گئی ۔ وَدَعَ و وَدَّعَ ۔ چھوڑا ۔ ترک کیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھوڑنے اور خالی کر دینے کے ھیں ۔ تَوَادَعَ الْفَرِیْقَانِ ۔ دونوں فریقوں نے ترک جنگ کا معاھدہ کر لیا ۔ اس عہد و پیمان کو وَدِیْعٌ کہتے ھیں ۔ پھر اَلْوَدِیْعُ ہر عہد و پیمان کو کہنے لگے ۔ اور اَلْوَدِیْعَۃُ ۔ امانت کو جو کسی کے پاس حفاظت کے لئے رکھی جائے ۔ تَوْدِیْعُ الثَّوْبِ ۔ کپڑے کو محفوظ جگہ رکھکر اسے گرد و غبار سے بچا لینا ۔ تَوَدَّعَہٗ ۔ اسے محفوظ مقام میں رکھ دیا* ۔

اَلْوَدِیْعُ ۔ پرسکون اور باوقار آدمی ۔ الوَدْعُ ۔ قبر یا مقبرہ ، جہاں مردہ سکون اور آرام سے پڑا رھتا ہے ۔ اَلْمُسْتَوْدَعُ ۔ وہ مقام جہاں کسی چیز کو بحفاظت رکھ دیا جائے* ۔ قرآن کریم میں ہر جاندار شے کے مُسْتَقَرٌّ

*تاج و محیط ۔

اور مُسْتَوْدَع" کا ذکر ہے۔ (دیکھئے ۔ ۹۹/۶ ; ۶/۱۱) ۔ جاندار اشیاء کے سلسلہ ارتقاء (Organic evolution) کا اصول یہ ہے کہ ہر شے کچھ وقت کے لئے ایک خاص مقام میں ، ایک خاص حالت میں ، ٹھہرتی ہے ۔ پھر وہاں سے نشو و نما پاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچتی ہے ۔ اور اسطرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہوئی اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے ۔ یہ راستے میں رکنے کے مقامات اس کے مُسْتَقَرٌّ ہیں اور آخری منزل اسکی مُسْتَوْدَع" ۔ جسے ہم " راستے میں رکنے کا مقام" ( مُسْتَقَرٌّ ) کہتے ہیں اس میں بھی وہ شے جمود کی حالت میں نہیں ہوتی ۔ وہاں بھی اسمیں تبدیلی ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن وہ تبدیلی ایسی غیر مرئی ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے ۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ تبدیلی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اسے ہم اس کی اگلی منزل کہتے ہیں ۔

وَدَعَهُ وَدْعاً ۔ اور وَدَّعَهُ تَوْدِيعاً ۔ کسی کو الوداع کہنا ۔ کسی کو رخصت کرنا ۔ ( وَدَعَ کا ایک مصدر دَعَةٌ ہے جسکے معنی فراخی عیش اور راحت و آرام کے ہیں ) ۔ اَلتَّوْدَاعِ کہنے والا ، مسافر کو یہ دعا دیتا ہے کہ خدا اسے سفر کی مشقت سے محفوظ رکھے اور آرام کی حالت میں پہنچا دے ۔ یہ تھی اس لفظ کی اصل ۔ بعد میں یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے اور چھوڑنے کے لئے بولا جانے لگا ۔ اور اس کے بعد صرف چھوڑ دینے ( ترک کر دینے ) کے معنی میں استعمال ہونے لگا ***۔ چنانچہ سورہ الضحیٰ میں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۹۳/۳)۔ اور سورہ احزاب میں دَعْ اَذَاهُمْ (۳۳/۴۸) کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں ۔

# و د ق

وَدَقَ اِلَيْهِ ۔ اس کے قریب ہوا ۔ وَدَقَ الْمَطَرُ ۔ آسمان سے بارش برسی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے اور مانوس ہونے کے ہیں ۔ آسمان سے آنے کی وجہ سے بارش کو الوَدْقُ کہا جاتا ہے ۔ محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی قریب آنا اور مائل ہونا ہیں **۔ وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں مادہ چوپایہ کا ، نر کی خواہش کے وقت ، رطوبت باہر نکالنا ۔ جب سخت بارش ہو رہی ہو اور اس میں غبار سا نظر آئے تو اس غبار کو وَدْقٌ کہتے ہیں ۔ اسی طرح جب گرمی کی شدت سے ہوا میں لہریں سی نظر آئیں تو انہیں وَدِيقَةٌ کہتے ہیں ***۔

*تاج و محیط ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

تاج میں ہے کہ ہر قسم کی بارش خواہ زوردار ہو یا ھلکی وَدْقٌ کہلاتی ہے۔ قرآن کریم میں اَلْوَدْقُ بارش کے لئے آیا ہے جب وہ بادلوں میں سے نکلے (۲۴/۴۳)۔

## و د ی

وَدَی الشَّیْءُ وَدْیاً ۔ وہ چیز بہ پڑی * ۔ اَلْوَادِیْ ۔ وہ جگہ جہاں پانی بہتا ہو۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں ۔ اس کے بعد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہنے لگے **۔ اس کی جمع اَوْدِیَۃٌ آتی ہے (۱۳/۱۷)۔ پھر استعارۃً طریقہ ، مسلک اور اسلوب کو بھی وَادٍ کہدیتے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ فِیْ وَادٍ غَیْرِ وَادِیْکَ ۔ فلاں آدمی تمہارے طریقہ سے جداگانہ طریقہ رکھتا ہے **۔ قرآن کریم میں شاعروں (جذبات پرست انسانوں) کے متعلق کہا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّھُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کسطرح ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری بری طرح ستا رھی ہو اور اسکی کہیں تسکین نہ ہوتی ہو مختلف خیالات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں ۔ (مزید تفصیل ش ۔ ع ۔ ر کے عنوان میں دیکھئے)۔

اَوْدَاہُ ۔ اس نے اس کا خون بہا دیا ۔ اسے ھلاک کر دیا **۔ اَوْدَی الرَّجُلُ ۔ آدمی ھلاک ہو گیا * ۔ یہیں سے اَلدِّیَۃُ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے***۔ یعنی خون بہا (۴/۹۲)۔

## و ذ ر

اَلْوَذْرَۃُ ۔ گوشت کی چھوٹی بوٹی جس میں ھڈی نہ ھو۔ ذَرْہُ ۔ اسے چھوڑ دے۔ ھُوَ یَذَرُہٗ ۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے ۔ اس لفظ کا مصدر نیز ماضی اور اسم فاعل مستعمل نہیں ہوتے ۔ صرف امر اور مضارع مستعمل ہوتے ہیں **** ۔ (یہ لفظ تَرَکَ کا مرادف ہے)۔

سورۃ المزمل میں ہے وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ (۷۳/۱۱)۔ ہمارے قانون کو جھٹلانے والوں کو ہم پر چھوڑ دو ۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو ۔ ان کے متعلق تم فکر مت کرو ۔ ہمارا قانون ان سے خود نپٹ لیگا ۔

وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۔ (۲/۲۳۴)۔ اور اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑ جائیں۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و محیط ۔

# و ر ث

وَرِثَ اَبَاهُ ۔ وہ اپنے باپ کا وارث ہوا ۔ اَوْرَثَہٗ ۔ اَبُوْہُ ۔ اسکے باپ نے اسے وارث بنایا ۔ اَلْوِرْثُ ۔ اَلْاِرْثُ ۔ اَلتُّرَاثُ ۔ میراث ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وَرْثٌ اور مِیْرَاثٌ تو مال میں ہوتی ہے اور اِرْثٌ حسب میں ہوتی ہے ۔ اَلْوَرْثُ ۔ تازہ چیز ۔ اَلْوَارِثُ خدا کی صفت ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی کی ملکیت میں ہونا اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہونا ہیں ۔ اس اعتبار سے خدا کے لئے اَلْوَارِثُ کے معنی واضح ہیں ۔

راغب نے کہا ہے کہ وراثتِ حقیقی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے جس میں اس پر نہ تو کوئی ذمہ داری عائد ہو اور نہ ہی اس پر اس سے محاسبہ کیا جائے ۔ نیز ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے لئے قَدْ وَرِثَ کَذَا کہتے ہیں ، اور کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دینے کے لئے اَوْرَثَ کہا جاتا ہے ۔ وراثت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی ۔ وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ بھی کہتے ہیں ۔ یعنی میں نے فلان آدمی سے علم کا استفادہ کیا** ۔ حضرت زکریا ؑ نے جب خدا سے دعا کی تھی کہ میرے ہاں بیٹا عطا کردے تاکہ وہ یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ (۱۹/۶) ۔ تو وراثت سے ان کی مراد اس خاندان کے علم و فضل کی وراثت تھی ، نہ کہ نبوت کی ۔ کیونکہ نبوت کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی ۔ یعنی جس طرح بیٹا باپ کی جائداد کا وارث ہو جاتا ہے محض بیٹا ہونے کی جہت سے ، اسی طرح نبی کا بیٹا ، محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو سکتا تھا ۔ نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی ۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسے شخص کو بھی خدا نبوت کے لئے منتخب کرلیتا تھا جس کا باپ نبی تھا ۔ اسے یہ منصب باپ سے وراثت میں نہیں ملتا تھا ۔ خدا سے وہبی طور پر ملتا تھا ۔

سورۃ بقرہ میں اَلْوَارِثُ (۲/۲۳۳) ۔ متوفی کے ترکہ کے وارث کے لئے آیا ہے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳/۱۷۹) ۔ اس میں میراث کے معنے ملک کے ہیں ۔ سورۃ الفجر میں ہے وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) ۔ یہ لوگ میراث کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں ۔ سورۃ

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔

اعراف میں ہے۔ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳)۔ یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں ، تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں ، وارث بنایا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وارث کے معنے صرف کسی کے ترکہ کا وارث نہیں بلکہ اپنی محنت کے ماحصل کے مالک کو بھی وارث کہا گیا ہے ۔ وراثت ارض کے بھی یہی معنی ہیں ، جس کے لئے صلاحیت شرط ہے ۔ (۲۱/۱۰۵)

# و ر د

اَلْوَرْدُ ۔ ہر درخت کے پھول ۔ (اس کا واحدہ وَرْدَةٌ ہے) لیکن بعد میں یہ لفظ گلاب کے پھول کے لئے زیادہ بولا جانے لگا* ۔ اور پھر سرخ یا گلابی رنگ کے لئے ۔ قرآن کریم میں ہے فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵/۳۷) ۔ وہ دِهَانٌ کی طرح سرخ ہو جائے گا ۔ (دھان کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ھ ۔ ن)۔

اَلْوِرْدُ ۔ گھاٹ ۔ (جانوروں کا) پانی کے گھاٹ پر پہنچنا ۔ خواہ اس میں داخل ہوا جائے یا نہ ہوا جائے* ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ وہ لوگ یا جانور جو پانی پر آئیں ۔ انہیں بھی اَلْوِرْدُ کہتے ہیں۔ اَلْمَوْرِدَةُ اَلْوَارِدَةُ ۔ راستہ ۔ پانی یا گھاٹ تک پہنچنے کا راستہ ۔ اَلْمَوَارِدُ ۔ گھاٹ یا راستے۔ اَلْوَارِدُ ۔ گھاٹ پر پہنچنے یا اترنے والا ۔ جری ۔ آگے بڑھنے والا* ۔ جو شخص پہلے منزل پر پہنچ کر قافلہ کے جانوروں کے لئے پانی کھینچکر تیار رکھے** ۔ أَوْرَدَهُ اس کو گھاٹ پر لایا ۔ اَلْوَرِيْدُ ۔ قلب کی رگ* ۔

سورۃ ہود میں ہے وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱/۹۸)۔ کتنا برا ہے وہ گھاٹ جس پر اُترا جائیگا۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹/۸۶) ۔ ہم مجرمین کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہنکا کر لائیں گے ۔ سورۃ یوسف میں قافلے کے آگے جا کر پانی وغیرہ لانے والے کے لئے وَارِدٌ کا لفظ آیا ہے (۱۲/۱۹) ۔

سورۃ مریم میں جہنم کے متعلق ہے وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا (۱۹/۷۱) ۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو ۔ اس آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ تمام انسان (مومن و کافر سب) جہنم میں داخل ہونگے۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔

پھر مومنوں کو اس سے نکال لیا جائے گا اور کافر اس میں رہیں گے (اس کی تائید کے لئے اس سے اگلی آیت ۔ ۱۹/۷۲ ۔ پیش کی جاتی ہے) ۔ لیکن یہ خیال بوجوہ غلط ہے ۔ اس لئے کہ قرآن کریم سے، جہنم سے نکلنے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا ۔ جہنم ایسی "جگہ" نہیں جہاں سے سزا بھگتنے کے بعد نکل آنا ہوگا ۔ جہنم درحقیقت سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے کی کیفیت (State) ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (۲۱/۱۰۱-۱۰۲) ۔ وہ اس سے دور رکھے جائینگے۔ اتنی دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہ سن سکیں گے ۔ اس اعتبار سے آیت (۱۹/۷۱) میں مِنْكُمْ سے مراد تمام نوع انسانی نہیں بلکہ (جیسا کہ پیچھے سے سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے) اس سے مراد وہی کفار اور سرکش مجرم ہیں جو حیات بعد الممات جیسی اہم حقیقت کے منکر تھے ۔ اور اس کے بعد (۱۹/۷۲ میں) جو ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا تو اس میں ثُمَّ کے معنی "اس کے بعد" نہیں ۔ یہ ایک الگ بات کا ذکر ہے ۔ (دیکھئے عنوان ثُمَّ) ۔ نیز نجات کے معنے عذاب سے محفوظ رکھنے کے بھی ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ ج ۔ و) ۔

لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ (۱۹/۷۱) میں مِنْكُمْ سے مراد تمام انسان (مومن و کافر سب) ہیں تو، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، وِرْدٌ میں اندر داخل ہونا ضروری نہیں ۔ اس سے مراد کسی مقام تک صرف پہنچنا ہیں ۔

اس اعتبار سے یوں سمجھا جائیگا کہ جنت، خواہ دنیوی ہو خواہ اُخروی، اس تک پہنچنے کے لئے تکلیفوں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے گا ۔ آگ اور خون میں کھیلنا ہوگا ۔ یہ "پل صراط" دنیا میں ایک ایک قدم پر موجود ہے جس سے گزر کر جنت کا دروازہ ملتا ہے ۔ جو شخص ان پُر خار وادیوں میں ذرا غیر محتاط (غیر متقی) ہؤا ۔ یا مشکلات و مصائب سے گھبرا کر بھاگ اٹھا ۔ وہ تباہیوں کے جہنم میں گر جائے گا ۔ جو احتیاط برتے گا اور مصائب میں ثابت قدم رہے گا وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا ۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سخت دشوار گذار مراحل سے گذرنا ہوگا ۔ (مثلاً ۲/۲۱۴ و ۳/۱۴۱ و ۹/۱۶ و ۳۳/۱۰) ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں پہلے مشقتوں اور تکلیفوں سے گذرا جائے گا اور اس کے بعد جنت میں پہنچا جائے گا ۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اس دنیامیں حق و صداقت کے پیامبروں کو مخالفین کی طرف سے تکالیف پہنچائی جائینگی ۔ جو ان تکالیف کو برداشت کرکے جادۂ حق و صداقت

پر قائم رہے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا - وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے گا - جنت اور جہنم کا فیصلہ انسان کے اس دنیا کے اعمال کرتے ہیں -

جو حقیقت اوپر بیان ہوئی ہے اسے فلسفہ کی زبان میں یوں کہا جائیگا کہ تخلیق (Creation) کا طریق (Process) یہ ہے کہ ہر تخلیقی تصور (Creative Idea) کے مشہود (Manifest) ہونے سے پہلے ایک داخلی ہیجان اور خلجان ہوتا ہے - (اسے Labour Pains کہئے) ایک کامیاب نابغہ (Genius) اس فکری خلجان اور ہیجان سے کامیاب باہر نکل آتا ہے - خام اور ناکام اس کشمکش میں کھو کر رہ جاتا ہے - تاریخ پر نگاہ ڈالئے - کتنے ہی خامکار مفکر اس گرداب میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں -

نبوت اس طریق (Process) سے ماورا ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب وحی کی خود پیدا کردہ فکر نہیں ہوتی -

## و ر ق

اَلْوَرَقُ درخت کے پتے - ایک پتے کو وَرَقَةٌ کہتے ہیں * - قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ (۶/۵۹) - ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ اَلْوَرَقُ چاندی کو کہتے ہیں خواہ وہ ٹھپہ لگی ہوئی ہو یا نہ ہو - ابوالہیثم نے کہا ہے کہ اَلْوَرَقُ - اَلْوَرِقُ اور اَلرِّقَةُ - خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیر اور مال - اور (۲) خاکستری رنگ کے ہیں - سورۂ کہف میں ہے فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ (۱۸/۱۹) - اس کے معنی سکّے کے ہیں - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ کلام قدیم میں وَرَقٌ ان جھلیوں اور کھالوں کو کہتے تھے جن پر لکھا جاتا تھا ** - اسی سے کتاب کے اوراق ہیں -

## و ر ی

اس مادہ میں چھپنے اور ظاہر ہونے کے ، دونوں معنی پائے جاتے ہیں - وَرَتِ النَّارُ - آگ بھڑکی - اَوْرَى النَّارَ - آگ بھڑکائی - اور وَرَّاهُ تَوْرِيَةً - اس کو چھپا دیا - دراصل اس میں چھپانے اور ظاہر کرنے کے دونوں پہلو بیک وقت موجود ہوتے ہیں - مثلاً چقماق کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے - اور جب اس سے نکلتی ہے تو روشن ہوجاتی ہے - اس لئے کہتے ہیں

* تاج - ** محیط -

وَرَىَ الزَّندُ ۔ چقماق سے آگ نکلی ۔ اسی بناء پر وَرّیَ الْخَبَرَ کے معنی ہیں اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریق سے ظاہر کیا*۔ وَارَاہُ اسے چھپایا ۔ یُوَارِیْ (۳۱/۵) چھپائے ۔ تَوَارَی ۔ چھپا*۔ تَوْرِیَۃٌ ۔ ایہام*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ کسی قیاس کا پابند نہیں ۔

اَلْوَرَاءُ ۔ پوتے کو کہتے ہیں***۔ وَمِنْ وَرَاءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (۷۱/۱۱) کی یہی تفسیر کی گئی ہے ۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو ان کے بیٹے اسحٰقؑ کی بشارت ملی اور اسحٰقؑ سے آگے ، ایک پوتے یعقوبؑ کی ۔

تَوْرَاۃٌ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی مادہ سے ہے* ۔ ایسی صورت میں اس کے معنے ہوں گے ۔ وہ شے جس سے آگ یا روشنی حاصل کی جائے ۔ (کتاب تورات کے لئے دیکھئے عنوان تَوْرَات*) ۔ وَرَاءَ ذَالِکَ ۔ یعنی سِوَیٰ ذَالِکَ ۔ اس کے سوا کچھ اور** ۔ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَہٗ (۹۱/۲) ۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے اس سے انکار کرتے ہیں ۔

سورۃ واقعہ میں ہے ۔ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ (۷۱/۵۶) ۔ کیا تم نے آگ پر غور کیا جسے تم روشن کرتے ہو ۔ اور سورۃ عادیات میں ہے ۔ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲/۱۰۰) ۔ وہ گھوڑے جن کے ٹاپ مارنے سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں ۔

وَرَاءٌ ۔ وَرْیٌ کے بنیادی معانی (چھپنے اور ظاہر ہونے) کے لحاظ سے وَرَاءٌ کے معنی بھی پیچھے اور آگے دونوں آتے ہیں* ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے معانی متعین کئے جائینگے ۔

# و ز ر

اَلْوَزَرُ ۔ بلند اور محفوظ پہاڑ ۔ وہ پہاڑ جس میں پناہ لی جائے ۔ ہر جائے پناہ یا حفاظت گاہ *۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کَلَّا لَا وَزَرَ (۱۱/۷۵) ۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے****۔

اَلْوِزْرُ ۔ بار گراں ۔ بہت بڑی ذمہ داری ۔ اسکی جمع اَوْزَارٌ ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) ملجا ، جائے پناہ اور (۲) کسی چیز میں گرانی اور بھاری پن کے ہیں ۔ وَزَرَ ۔ اس نے بوجھ اٹھایا ۔ وَازِرٌ بوجھ اٹھانے والا *۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۶۵/۶) ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ جلد ۱) ۔ نیز ابن فارس ۔ ****کتاب الاشتقاق۔

ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری خود پوری کرنی ہوگی۔ اور کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ نہ ہی کوئی کسی دوسرے کے اعمال کی جزا اور سزا میں حصہ دار ہوگا۔ قانون مکافات کا یہ عظیم الشان اصول ہے جسکا قرآن کریم نے اسطرح اعلان کیا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری اور اپنے اپنے کئے کا پھل۔ آج کے جہنمی معاشرہ کا سا حال نہیں کہ — دانہ این می کارد، آن حاصل برد۔ محنت کوئی کرے، عیش کوئی اڑائے۔ جرم کوئی کرے، سزا کوئی بھگتے۔ غلطیاں کسی سے ہوں، اسکے نتائج کوئی برداشت کرے۔ تنخواہ کوئی پائے، ذمہ داریاں کوئی اٹھائے۔ قرآنی معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوگا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی وہاں کا غیر متبدل اصول ہوگا۔

وَزِیْرٌ و مُوَازِرٌ۔ جس پر ذمہ داری ہو۔ وہ جو کسی کے بوجھ میں شریک ہو*۔ راغب نے المُوَازَرَة کے معنے معاونت بتائے ہیں اور وَزِیْرٌ کے معنے معاون و مدد گار۔ نیز امیر کا بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانے والا**۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَاجْعَلْ لِیْ وَزِیْرًا مِنْ اَھْلِیْ (۲۰/۲۹)۔ "میرے اہل میں سے میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے"۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ۔ جنگ کے ہتھیار (۴۷/۴)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعت مومنین ضرورةً جنگ اس لئے کرتی ہے کہ "خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے"۔ یعنی جنگ کا امکان نہ رہے۔ دنیا میں امن و سلامتی ہو جائے۔ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَھَا (۴۷/۴)۔ "تاآنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھدے"

# و ز ع

وَزَعْتُہٗ اَزَعُہٗ وَزْعًا۔ میں نے اس کو روک دیا۔ منع کردیا۔ فَاتَّزَعَ۔ پس وہ رک گیا۔ اَلْوَازِعُ۔ روکنے اور باز رکھنے والا۔ اس جہت سے یہ حاکم اور والی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز ان سپاہیوں اور سرکاری کارندوں کے لئے بھی جو لوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔ نیز وہ شخص جو فوجی امور کی تدبیر کرے اور فوج کو نظم و ضبط میں رکھے۔ کمانڈار***۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے جیوش و عساکر (لشکروں) کے متعلق ہے فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ (۲۷/۱۷) اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ وہ نہایت ترتیب سے صف در صف رہتے تھے، ادھر ادھر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ یا یہ کہ انہیں ایسے نظم و ضبط میں رکھا تھا کہ وہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی کسی پر ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ اسی سورة میں ذرا

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و راغب۔

آگے چل کر حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا مذکور ہے کہ رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ (۲۷/۱۹) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے نشو و نما دینے والے مجھے ایسی تمام چیزوں سے روک دے جو تیرے شکر کے راستے میں حائل ہوتی ہوں ۔ مجھے اتنا ضبط عطا کر دے کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف تیرے متعین کردہ راستے میں صرف کروں ۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اَوْزِعْنِيْ کے معنی توفیق دینا ۔ سمجھانا ۔ اور کسی چیز کا شیدائی بنانا بھی ہیں ۔ جب کسی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح راستے پر لگ جانے کی توفیق دیدی ۔

سورہ حم سجدہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۴۱/۱۹) وہ روک دیئے جائینگے ( اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ح ۔ م میں جَحِيْمٌ ) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قیاس اور قاعدے کے پابند نہیں ۔

# و ز ن

اَلْوَزْنُ ۔ ہاتھ سے کسی چیز کے ہلکے یا بھاری ہونے کا اندازہ کرنا* ۔ کسی چیز کی مقدار معلوم کرنا** ۔ بعض نے کہا ہے کہ وَزْنٌ ۔ ہلکا یا بھاری ہونے کو کہتے ہیں ، لیکن لیث کا قول ہے کہ وَزْنٌ ایک چیز کے بوجھ کا دوسری چیز کے بوجھ کے برابر ہو جانا ہے ۔ وَزَنَ ۔ يَزِنُ ۔ وزن کرنا ۔ وزن کرکے دینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی استقامت اور تناسب و اعتدال کے ہیں نیز دو چیزوں کے وزن کو برابر کرنے کے ۔

قرآن کریم نے وَزْنٌ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ نظام کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ تَوَازُنْ کی رو سے قائم ہے ۔ اگر مختلف اشیاء کا باہمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے ۔ اس کے لئے فرمایا ۔ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷) ۔ خدا نے اس سلسلۂ کائنات کو ان بلندیوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا ۔ مختلف فضائی کروں اور اجرام فلکی کی باہمی جذب و کشش اس عظیم المثال توازن کی زندہ شہادت ہے ۔ چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسکی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

أَلاَّ تَطْغَوا فِي الْمِيزَانِ (۵۵/۸) ۔ لہذا تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھو وَ أَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (۵۵/۹) ۔ معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو ۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے جو اس توازن کے قیام کا ذمہ دار ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطہ قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اَلْمِيزَانُ بھی نازل کی ہے ۔ یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام ۔ وہی نظام وہ معیار بنتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح صحیح "وزن" متعین ہوتا ہے ۔ وَ أَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) ۔ لیکن دنیا میں کوئی نظام قوت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہا کہ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ (۵۷/۲۵) ۔ اس کے لئے ہم نے فولاد (کی شمشیر) بھی نازل کی ۔ یہ ہے قرآنی نظام کا صحیح نقشہ ۔ یعنی خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (الکتاب) ۔ اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے نظام (المیزان) ۔ اور اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے قوت (الحدید) ۔ حدید کے متعلق فرمایا کہ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) ۔ اس کی شدت اور سختی، فتنہ و فساد برپا کرنے والے عناصر کے لئے روک تھام کا کام دیتی ہے اور یوں یہ قوت، نوع انسانی کے لئے فی الجملہ ۔ باعث منفعت بن جاتی ہے ۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے ۔ فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۔ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۔ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۶-۹) ۔ جس کی سعی و عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عیش فراواں کی زندگی نصیب ہوگی ۔ جسکا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت و رسوائی کے آغوش میں چلا جائیگا ۔ (مَوَازِينُ ۔ مِيزَانٌ کی جمع ہے) ۔ اس نظام میں ہر چیز کا وزن ٹھیک ٹھیک، یعنی ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوگا ۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ (۷/۸) ۔ اور تمام وہ کوششیں جو خدا کے نظام ربوبیت عامہ کے خلاف ہوں گی بے نتیجہ ہو کر رہ جائینگی ۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵) ۔ اسطرح یہ معاشی اور معاشرتی نظام، کائناتی نظام سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے جس میں ہر شے موزون ہے ۔ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ (۱۵/۱۹) ۔ یعنی ایک خاص تناسب (Proportion) کو لئے ہوئے ۔

توازن کے اعتبار سے وَزِینُ الرَّأیِ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی رائے بہت صحیح اور وزندار ہو۔ اور رَاجِحُ الْوَزْنِ اس شخص کو جو کامل العقل اور کامل الرائے ہو*۔ اور اَوْزَنُ الْقَوْمِ۔ قوم کے بہترین و معزز ترین فرد کو کہتے ہیں**۔

# و س ط

اَلْوَسَطُ۔ ہر چیز کا درمیانی حصہ۔ وہ نقطہ جو دونوں اطراف سے برابر فاصلے پر ہو۔ وُسُوْطُ الشَّمْسِ۔ آفتاب کا آسمان کے درمیان آ جانا۔ مُتَوَسِّطُ الْبَیْتِ۔ وہ چیز جو خصوصیت سے گھر کے درمیان واقع ہو*۔ محیط میں ہے کہ اَلْوَسَطُ اور اَلْوَسْطُ اس درمیانی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے تمام اطراف کا فاصلہ برابر ہو**۔

چونکہ ہر چیز کا اوسط (درمیانی نقطہ) نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، یعنی افراط و تفریط کے بالکل درمیان، اس لئے یہ لفظ ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَاسِطَۃُ الْقِلَادَۃِ۔ ہار کا درمیانی موتی جو نفیس ترین ہوتا ہے۔ وَسَاطَۃُ الدَّنَانِیْرِ۔ بہترین دینار*۔ اَلْوَاسِطَۃُ۔ درمیانی۔ بیچ میں پڑنے والا۔ علت (کسی چیز کا ذریعہ اور سبب)**۔ اَلْوَسِیْطُ۔ وہ شخص جو جھگڑا کرنے والوں کے بیچ میں پڑے*۔ قرآن کریم میں جنگ کے گھوڑوں کے متعلق ہے فَوَسَطْنَ بِہٖ جَمْعًا (۱۰۰/۵)۔ وہ دشمنوں کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں۔

قرآن کریم میں امت مسلمہ کے متعلق ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت وَسَطْ بنایا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر ہو (Equidistant)۔ یعنی نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں سب برابر ہوں، جس طرح دائرے کے مرکز سے محیط کا ہر نقطہ برابر فاصلے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو عدل اور انصاف کے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹے۔ اس قسم کی قوم صحیح معنوں میں اقوام عالم کے اعمال و افعال کی نگران اور محتسب ہوسکتی ہے۔ لہٰذا امت وَسَط سے مراد ایسی قوم ہے جسے بین الاقوامی

---

*تاج۔ **محیط۔

اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو۔ جو تمام اقوام کے افعال و حرکات کی نگران ہو اور بین الاقوامی معاملات کو پورے پورے عدل و انصاف سے سلجھائے۔ قرآن کریم نے یہ مقام متعین کیا تھا جماعت مومنین کا۔

یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کا بین الاقوامی نظام اور اقوام عالم کے متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کے لئے اس قسم کا انتظام اس زمانے میں تجویز کیا تھا جب دنیا ہنوز "بین الاقوامی" تصور تک سے نا آشنا تھی۔

# و س ع

وَسِعَ۔ یَسَعُ۔ سَعَۃً۔ قدرت رکھنا۔ طاقت رکھنا۔ اختیار رکھنا۔ مَا اَسَعُ ذٰلِکَ۔ میں اس کی قدرت نہیں رکھتا۔ ھٰذَا الْاِنَاءُ یَسَعُ عِشْرِیْنَ کَیْلًا۔ اس برتن میں بیس پیمانہ بھر چیز سمانے کی گنجائش ہے۔ اَلْوَاسِعُ۔ اَلْوَسِیْعُ۔ فراخ۔ کشادہ۔ اَلْوَسْعُ اَلْوُسْعُ اَلْوِسْعُ اَلسَّعَۃُ۔ ان سب کے معنی، فارغ البالی۔ کشادگیٔ رزق۔ قدرت اور طاقت کے ہیں۔ اَلْوَسَاعُ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے دوڑے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی تنگی اور بدحالی کی ضد بتائے ہیں۔

راغب نے لکھا ہے کہ وُسْعٌ اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے سپرد کیا جائے۔ اس لئے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (۲/۲۸۶) کے معنی یہ ہیں کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے**۔ (اس کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے)۔ اَلْمُوْسِعُ۔ صاحب اختیار و وسعت*۔ اَلْوَاسِعُ۔ خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے*۔

قرآن کریم میں اَلْمُوْسِعُ۔ اَلْمُقْتِرُ۔ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۳۶)۔ یعنی وہ جسے رزق کی کشادگی نصیب ہو۔ یہی معنی سورۃ نور میں اُولُوا السَّعَۃِ کے ہیں (۲۴/۲۲)۔ یعنی آسودہ حال اور کشائش والے لوگ۔ سورۃ ذاریات میں ہے اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱/۴۷)۔ ہم صاحب وسعت ہیں۔ یعنی ہماری قدرت اور اختیارات بھی وسیع ہیں اور ہم رزق میں فراخی اور کشادگی بھی عطا کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (۲/۲۵۵)۔ اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ علم ہی نہیں بلکہ رحمت (سامان ربوبیت) بھی (۴۰/۷)۔

---

*تاج۔ **محیط۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶ و ۶/۱۵۳ و ۷/۴۲ و ۲۳/۶۲) ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا جو اپنے احکام و قوانین کی اطاعت چاہتا ہے تو اس سے اس کا اپنا کوئی فائدہ مطلوب نہیں ۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے ۔ اس کی قدرت و اختیارات کا دائرہ وسیع ہو جائے ۔ ایسے کشادگی اور فراخی نصیب ہو جائے** ۔ سورۃ اعراف میں اس کے ساتھ کہا گیا ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (۷/۴۲) ۔ ان وسعتوں اور فراخیوں کا نام جنت کی زندگی ہے ۔ یعنی اس دنیا میں رزق اور زندگی کی خوشگواریوں کی وسعت اور کشاد ، اورخود انسانی ذات (Personality) کے اختیارات و ممکنات کے دائرے کی وسعت ، جس سے انسان اُخروی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ یہ وہ جنت ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے ۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۲۱) ۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کےمعنی یہ ہیں کہ ان احکام کا ثمرہ وسعت ہے۔ یعنی جنت ۔ یہ اسی مفہوم کی تائید میں ہے جسے دوسری جگہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵) سے ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے یہ معنے بھی ہیں کہ خدا ایسے احکام دیتا ہے جو کسی کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں ۔ اس آیت کا عام مفہوم بھی لیا جاتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات پر پہلا مفہوم زیادہ موزوں نظرآتا ہے ۔ قرآنی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ انسانی ذات کی نشو و نما ہے جس سے اس کی صلاحیتوں اور ممکنات کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے ۔

## و س ق

وَسَقَ يَسِقُ وَسْقًا ۔ چیزوں کو ملانا ۔ متفرق چیزوں کو اکٹھا اور جمع کرنا ۔ نیز بوجھ اٹھانا ۔ کسی چیز کو اپنے اندر لے لینا ۔ وَسَقَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی نے نر کے جنسی مادہ کو اپنے اندر رحم میں جمع کرکے اس کا منہ بند کر لیا ۔ یعنی وہ حاملہ ہوگئی۔ اِسْتَوْسَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ جمع ہوگئے* ۔ نواب صدیق خاں نے لکھا ہے کہ (و ۔ س ۔ ق) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے*** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اٹھا لینا بتائے ہیں ۔

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔ ***العلم الخفاق ۔

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّیْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴/۱۷) ۔ رات اور ہر وہ شے جسے وہ جمع کرلیتی ہے ۔ یعنی تاریکیاں ۔ یا ستارے اور چاند ۔ وَسْقٌ ۔ ایک اونٹ کا بار ۔ ساٹھ صاع ۔ اِتِّسَاقٌ ۔ ہر چیز کے مل جانے اور اس کے اجزاء کے اکٹھے ہو جانے کو کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴/۱۸)۔ اس میں چاند کے کامل ہو جانے کا مفہوم ہے ۔ اِتِّسَاقُ الْقَمَرِ ۔ چاند کے بھر پور ، کامل اور برابر ہو جانے کو کہتے ہیں ۔ یہ حالت تیرھویں سے سولھویں رات تک ہوتی ہے ۔

# و س ل

اَلْوَسِیْلَۃُ ۔ کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنا ۔ لہذا مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ اَلْوَصِیْلَۃُ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ وَصِیْلَۃٌ کے معنی کسی چیز تک پہنچنا ہیں اور وَسِیْلَۃٌ کے معنی رغبت کے ساتھ پہنچنا*۔ اس کے معنی منزلت ۔ مقام ۔ مرتبہ کے ہیں *۔ نیز ہر وہ چیز جس کے ذریعے کسی دوسرے سے قرب حاصل کیا جائے۔ نیز قُرْبَۃٌ ۔ یعنی قدرو منزلت کے اعتبار سے کسی سے قریب ہونا**۔ تَوَسَّلَ اِلَیَّ بِکَذَا ۔ اس نے میری طرف فلاں چیز کے ذریعے قرب حاصل کیا***۔ صاحب تاج العروس اور محیط نے وَسِیْلَۃٌ کے معنی مرتبہ ۔ درجہ ۔ قرب ۔ تعلق کے لکھے ہیں ۔ تَوَسَّلَ اِلَی اللّٰهِ تَوَسُّلاً ۔ اس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اسے خدا کا قرب حاصل ہوگیا ۔ اَلْوَاسِلُ ۔ رغبت کرکے کسی کا قرب حاصل کرنے والا **۔

سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے جس کے غلط ( مروجہ ) مفہوم نے ، اسلام جیسے حیات بخش دین ( نظام زندگی ) کو اشخاص پرستی کا طلسم بنا کر رکھ دیا ہے ۔ وہ آیت یہ ہے ۔ یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوااللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۳۵) ۔ اس کا سیدھے سادے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے ۔ "اے ایمان والو ! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ اور اس کی طرف "وسیلہ" طلب کرو ۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو ۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ" ۔ ہم نے اس میں لفظ "وسیلہ" کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے کیونکہ اسی کے غلط مفہوم پر اشخاص پرستی کی وہ عمارت قائم کی جاتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ۔ لفظ "وسیلہ" کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں ان کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو ۔ اور خدا کے ہاں درجہ مرتبہ ، قرب ، منزلت طلب کرو ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے

---

* راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین جلد اول صفحہ ۱۴۱) ۔

میں پوری پوری جدو جہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ یعنی خدا کے ہاں قدرو منزلت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں مسلسل جدو جہد کرتے رہو۔

اور اگر لفظ "وسیلہ" کا ترجمہ "ذریعہ" کیا جائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے ہاں عزت و منزلت۔ درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ طلب کرو۔ یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ وہ عمل صالح ہے جو خدا کے ہاں درجہ اور مرتبہ ملنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس طریق سے تم خدا کے مقرب بن سکتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے "وسیلے" کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ وسیلہ ہے "پیرو مرشد"۔ لہذا مرشد (پیر طریقت) کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

اور جب "وسیلہ" کے معنی "پیر پکڑنے" کے کر لئے تو "جَاهِدُوْا" کے معنی ہو گئے "اپنے نفس سے جہاد کرنا"۔ جسے جہاد اکبر قرار دیا جاتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ، انسانوں کو قرار دینے والے اس دین (اسلام) کے نام لیوا ہیں جو دنیا سے شخصیت پرستی کو مٹا کر، خدا اور بندے کا براہ راست (قرآن کریم کے ذریعے) تعلق پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس دین کے عطا کرنے والے خدا کا اعلان یہ تھا کہ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ "جب میرے بندے تجھ سے (اے رسول) میری بابت پوچھیں تو (کہدو کہ) میں ان سے قریب ہوں"، اتنا قریب کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ "میں ہر شخص کی پکار کا، جو مجھے پکارتا ہے، جواب دیتا ہوں"۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) "انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں۔ اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ تا کہ انہیں رشدوہدایت مل جائے"۔ بات کسقدر صاف ہے۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے دوسرے لوگ "مرشد" تلاش کرتے رہتے ہیں۔ (یَرْشُدُوْنَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ خدا کے علاوہ کوئی "مرشد" (راہ بتانے والا) نہیں (دیکھئے ۱۸/۱۷)۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) "خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور طاقت حائل نہیں رہتی"۔ یہی وہ صحیح آزادی

ہے جسے عطا کرنے کے لئے نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے (۷/۱۵۷) - لیکن ہم نے اس آزادی کی جگہ ، انسان پرستی کی مقدس زنجیروں سے اپنے آپ کو اس طرح جکڑ لیا کہ ہمارے فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی آزاد نہ رہ سکا - یاد رکھئے - مسلمان ، دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل صرف اس وقت ہو سکے گا جب اس نے انسانوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر صرف اللہ کے سامنے جھکنے کا مسلک اختیار کر لیا -

## و س م

اَلْوَسْمُ - تپائے ہوئے لوہے سے داغ دینا یا نشان لگانا - اَلْوِسَامُ - وہ نشان جو داغ دینے سے پڑ جائے - وَسَمَ یَسِمُ وَسْماً - جانور کو لوہے سے داغ دیکر نشان زدہ کرنا -

اَلسِّمَةُ - علامت - نشانی - فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَيْرِ - فلاں آدمی پر بھلائی کا نشان ہے - مَوْسِمُ الْحَجِّ - وہ زمانہ جو اجتماعِ حج کے لئے نشان زد کر دیا جائے - تَوَسُّمٌ فراست و ذکاوت کو کہتے ہیں - اَلْوَسْمِیُّ - موسمِ بہار کی ابتدائی بارش (جس سے زندگی اور حسن کی نمود کی نشان دہی ہو جاتی ہے) * -

قرآن کریم میں ہے سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۶۸/۱۶)- ہم اس کی ناک پر داغ دینگے- (ذلت و خواری مفہوم ہے) - سورۃ حجر میں ہے - اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (۱۵/۷۵) - اس میں صاحبان فراست کے لئے نشانیاں ہیں - ان لوگوں کے لئے جو آثار و قرائن سے حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں -

## و س ن

اَلْوَسَنُ - اَلسِّنَةُ - نیند کی ابتدا یا اونگھ یا نیند کے جھونکے کو کہتے ہیں - اس کا اگلا درجہ نَوْمٌ ہوتا ہے - نیز اس کے معنی غفلت ہونے ہیں - هُوَ فِیْ سِنَةٍ - وہ غفلت میں ہے * - اسکے معنے نیند کی گرانی اور شدت بھی ہیں ** - قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے - لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵)- بے خبر ہونا تو ایک طرف وہ کسی شے سے غافل تک بھی نہیں ہوتا -

---

* تاج و راغب - ** تاج -

# و س و س

اَلْوَسْوَاسُ ۔ ھلکی سی آھٹ ۔ شکاری کی آھٹ ۔ دبے پاؤں چلنے سے پیدا ھونے والی خفیف سی آھٹ ۔ چلنے میں زیور کے بجنے کی ھلکی آواز کو بھی کہتے ھیں (جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ھوتے ھیں)*۔ دل میں مختلف قسم کے خیالات گذرنے کو بھی کہتے ھیں ۔ نیز ھر غیر واضح کلام کو جس میں مختلف آوازیں مل گئی ھوں ۔ نیز ایسی گفتگو کو جو بغیر نظم و ترتیب کے ھو* ۔ راغب نے الوَسْوَسَۃُ کے معنی برے خیال کا دل میں گذرنا لکھے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے فَوَسْوَسَ لَھُمَا الشَّیْطَانُ (۲۰/۷) ۔ "پھرشیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا" ۔ اس سے مراد وہ خیالات ھیں جوخود غرضی کے جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتے ھیں ۔ یا جنھیں شرپسند لوگ کسی کے دل میں پیدا کریں ۔ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۱۱۴/۵-۴) ۔ وہ جو دبے پاؤں آکر چپکے سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ھے ۔ ایسے لوگ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ھیں ۔ ان سے محتاط اور محفوظ رھنے کی سخت تاکید کی گئی ھے ۔

# و ش ی

اَلْوَشْیُ ۔ کپڑے پر (مختلف رنگوں سے) نقش و نگار بنانا ۔ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں** ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف کوئی رنگ لگانا ھیں*** ۔ اسکے بعد یہ لفظ رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ھونے لگا ۔ چنانچہ کہتے ھیں وَشَی النَّمَّامُ کَلَامَہٗ ۔ چغلخور نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی** ۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ھے ۔ مُسَلَّمَۃٌ لَا شِیَۃَ فِیْھَا (۲/۷۱) ۔ وہ بالکل صحیح اور سالم ھے اور اس پر کوئی داغ نہیں ھے ۔ یعنی کسی ایسے رنگ کا نشان نہیں جو اسکے سارے بدن کے رنگ کے خلاف ھو ۔

# و ص ب

وَصَبَ یَصِبُ ۔ وُصُوْبًا ۔ کسی چیز کا دائم اور ثابت رھنا ۔ اَوْصَبَ کے بھی یہی معنی ھیں ۔ (یہ متعدی بھی ھو جاتا ھے) ۔ وَصَبَ عَلَی الْاَمْرِ ۔ اس نے اس بات پر مداومت کی اور حسن کارانہ اسے انجام دیا ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ - بہت ہی لمبا چوڑا لق و دق بیابان جسکی انتہا نہ ہو۔ اَلْوَصَبُ - ہمیشہ رہنے والی بیماری - اسی سے اَلْاَوْصَابُ بیماریوں کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں ہے - وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ( ۱۶/۵۲ ) - کائنات کی ہر شے خدا کی فرمان پذیری کر رہی ہے اور ایسا مداومت سے ہو رہا ہے - مسلسل و پیہم ایسا ہو رہا ہے - (انسان کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے) - دوسری جگہ ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ( ۳۷/۹ ) - لازم ہو جانے والا عذاب -

# و ص د

اَلْوَصِيْدُ - صحن ، آنگن - دروازے کی چوکھٹ - پتھروں سے بنایا ہوا احاطہ ، جو اونٹوں کے لئے پہاڑ میں بنا لیا جاتا ہے* - سورۃ کہف میں ہے کہ ان کا کتا اپنے ہاتھ پھیلائے وَصِیْد میں رہتا تھا ( ۱۸/۱۸ )- اسکے معنی غار کے صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں - چوکھٹ سے مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے - اَوْصَدَ الْبَابَ وَ اَصَدَهٗ کے معنی ہیں اس نے دروازہ بند کر دیا - اَوْصَدَ الْقِدْرَ - اس نے ہانڈی کو ڈھانپ دیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں -

[اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (۱۰۴/۸) کے لئے دیکھئے عنوان أ - ص - د]

# و ص ف

وَصَفَ الشَّيْئَ يَصِفُهٗ وَصْفًا - کسی چیز کا حلیہ اور کیفیت بیان کرنا - اَلصِّفَةُ - کسی چیز کی حالت - کیفیت** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنے کے ہیں - نیز الصِّفَةُ کے معنی ہیں وہ علامت جو کسی چیز سے مستقل لگی رہے -

خدا کو دنیا میں قریب قریب ہر شخص مانتا ہے - لیکن جس جگہ پہنچ کر اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے کیسا؟ کوئی انسان اپنی عقل کی رو سے یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کیسا ہے - اس لئے کہ خدا انسانی عقل کی حد سے ماوراء ہے - لہذا خدا کے متعلق صرف وہی بات یقینی طور پر صحیح ہوسکتی ہے جسے خود خدا بتائے - اور اس کا ذریعہ وحی کے سوا اور کچھ

*تاج و راغب - **تاج -

نہیں - اور وحی اب آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے - لہذا خدا کا صحیح تصور وہی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے - جو تصور اس تصور کے خلاف ہوگا وہ غلط ہوگا ، اور خدا کی طرف اس کا انتساب باطل - چنانچہ اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) تصورات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ( ۶/۱۰۱ )- خدا کے متعلق جو تصور یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس سے بہت دور اور بلند ہے - وہ اس سے مبرا اور منزہ ہے -

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو بھی ''خدا پر ایمان'' لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کو مانتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے متعلق صحیح صحیح تصور رکھو- اور یہ تصور وہی ہوسکتا ہے جسے خدا نے خود قرآن کریم میں پیش کیا ہے - یہ اس کی صفات یا اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی ہیں - بالفاظ دیگر ، خدا کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے- کوئی محدود (Finite) لا محدود (Infinite) کو حیطۂ ادراک میں لا نہیں سکتا - اسی لئے خدا نے صرف اپنی صفات بیان کی ہیں - اور انہی صفات سے ہم اس کے متعلق اندازہ کر سکتے ہیں - خدا ، علیم ہے - خبیر ہے - بصیر ہے ( وغیرہ ) لیکن خود خدا ، جو علیم و خبیر و بصیر ہے ، ہے کیا ؟ ہم اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں ، نہ سمجھا سکتے ہیں -

# و ص ل

وَصْلٌ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا - جوڑ دینا - (فصل اور قطع کی ضد) - اَوْصَلَہٗ اِیْصَالاً - اس کو اس تک پہنچا دیا ، یا اس کے ساتھ ملا دیا - قَطْعٌ کے مقابلہ میں اِیْصَالٌ قرآن کریم میں ( ۲/۲۷ ) میں آیا ہے - وَصَلَ الشَّیْیَٔ یا اِلَی الشَّیْیِٔ - اس چیز کی طرف پہنچ گیا - قَطَعَ الرَّحِیْمَ کے مقابلہ میں وَصَلَ فُلَانٌ رَحِمَہٗ بولتے ہیں*- (قطع رحم کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع) -

اَلْوَصِیْلَۃُ ( ۵/۱۰۳ ) - وہ بکری جو لگاتار سات بطن میں دو دو مادہ بچے دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے - جاہلیت عرب میں اس نر بچہ کو ذبح نہیں کرتے تھے اور اس بکری کے دودھ کو عورتیں نہیں پیتی تھیں - اس بکری کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا* - ( بعض

*تاج -

ائمه لغت نے اس بکری کا تعارف اور طرح سے بھی کرایا ہے ۔ بعض نے بکری کے بجائے اونٹنی بھی بتایا ہے* ۔ بہرحال اس سے مقصود ان توھمات کا ذکر کرنا ہے جو اسلام سے پہلے وہاں رائج تھے ۔

ھمارے ھاں کسی بزرگ کی وفات پر عام‌طور پر کہتے ھیں کہ ان کا ''وصال'' ھوگیا ۔ یہ تصور ھندؤں کے تصوف (ویدانت) سے آیا ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح خدا کی روح کا ایک جزو ہے جو بدقسمتی سے مادی جسم کے جیل خانے میں محبوس ھوگئی ہے ۔ اس جسم سے علیحدگی کے بعد یہ جزو اپنے کل سے جا کر مل جائے گا ۔ اس ملاپ کے لئے وِصَال کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یعنی فلاں واصل بالحق ھوگیا ۔ خدا کے ساتھ مل گیا ۔ وحدت وجود کے مسلک کی یہی تعلیم ہے ۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ھیں ۔ اسی طرح ''عُرس'' کا تصور ہے جو عیسائیوں کے مسلک خانقاھیت سے آیا ہے ۔ اس کے معنی شادی کرنے کے ھوتے ھیں ۔ عیسائیوں میں راھبہ عورتوں (Nuns) کے متعلق یہ عقیدہ ھوتا ہے کہ ان کی شادی ان کے خدا (یسوع مسیح) سے ھو چکی ھوتی ہے ۔ اور وہ گویا خدا کی عروس (دلہن) ھیں ۔ یہی تصور ھمارے تصوف میں آ گیا جہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ ''اللہ والے'' کی وفات کے معنی یہ ھوتے ھیں کہ اس کی شادی (عرس) خدا سے ھوگئی ۔ یعنی خدا سے اس کا وصال ھوگیا ۔ یہ سب تصورات غیر قرآنی ھیں ۔

# و ص ی

وَصَى الشَّیْئُ بِہٖ وَصْیًا ۔ متصل ھوجانا ۔ مل جانا ۔ وَصَّاہُ بِہٖ یَصِیْہٖ ۔ اسے اس سے ملا دینا ۔ (لازم و متعدی) ۔ وَصَى النَّبْتُ ۔ پودے گتھ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ۔ اَرْضٌ وَاصِیَۃٌ ۔ وہ زمین جس کے پودے قریب قریب ، اور باھم گتھے ھوئے ھوں ۔ فَلَاۃٌ وَاصِیَۃٌ ۔ وہ بیابان جو دوسرے بیابان سے ملا ھوا ھو***۔

اس سے راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَصِیَّۃُ کے معنے ھیں کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے کسی کو ایسی ھدایات دینا جن میں نصیحت بھی شامل ھو** ۔ امر و حکم اور فریضہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ اسی سے اَوْصٰی یُوْصِیْ کے معنے واجب قرار دینے ، معاملہ سونپ دینے کے آتے ھیں ۔ نیز اَوْصٰی وَ وَصّٰی کے معنے عہد و پیمان کرنے کے آتے ھیں ۔ اور کسی کو (اپنے مرنے کے بعد) کسی چیز کا مالک بنا دینے کے***۔ اَلْوَصِیُّ ۔ وصیت کرنے والا ۔ نیز جسے وصیت کی گئی ھو (اس کے دونوں معنی آتے ھیں) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط

قرآن کریم میں ہے وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ (۲/۱۳۲)۔ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس کا حکم دیا ۔ اس بات کو مسلسل ان تک آگے بڑھا دیا ۔ سورۃ نساء میں ہے ۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (۴/۱۱) ۔ اللہ اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے ۔ سورۃ یٰسٓ میں تَوْصِيَةً کا لفظ آیا ہے (۳۶/۵۰)۔ سورۃ العصر میں جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)۔ اس کے عام معنے تو یہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں لیکن اس مادہ کے بنیادی معانی کے لحاظ سے اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ حق و استقامت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے رہتے ہیں ۔ ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ حق و استقامت ہے۔ ان کی وجہ جامعیت قوانین خداوندی کی رُو سے تعمیری نظام پر ثابت قدم رہنا ہے ۔

مُوْصٍ ۔ وصیت کرنے والا (۲/۱۸۲)۔

قرآن کریم میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲/۱۸۰) ۔ ''تم میں سے جس کے سامنے موت آ موجود ہو ۔ اور وہ مال چھوڑے ۔ اس پر فرض قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور دیگر اقربا کے لئے قاعدے کے مطابق وصیت کرے ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے''۔ اس سے واضح ہے کہ ترکہ کے لئے ماں باپ اور دیگر اقرباء کے لئے وصیت کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے ۔ لیکن اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی وصیت نہ کرسکے ۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (Cover نہ کرے) ۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے وارثین کے لئے خود حصے مقرر کر دئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان حصوں کو بیان کرتے وقت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے کہ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱۔۱۲) ۔ ''وصیت جو اس نے کی ہو اس کے بعد ۔ یا قرضے کی ادائیگی کے بعد'' ۔ یہ حکم اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں ۔ لیکن ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (۱/۳) مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں ۔ اس کی سند میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی ، اس لئے کہ رسول اللہؐ کا کوئی ارشاد قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کریم کو منسوخ کرسکتی ہے ۔ اس لئے اس حدیث نے قرآن کریم کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے ۔ اس قسم کے عقیدے کے

متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا ہماری حالت پر رحم کرے ۔ یاد رکھئے ۔ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ۔ اس کی کسی آیت کو نہ کوئی دوسری آیت منسوخ کرتی ہے نہ قرآن کریم سے باہر کوئی اور چیز منسوخ کرسکتی ہے ۔ خدا کے کلام کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر محکم ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ س ۔ خ) ۔ لیکن اگر رسول اللہؐ نے ایسی بات کہی بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے کسی صحابیؓ کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہو کہ وہ اپنے مال کے ایک تہائی حصہ سے متعلق فلاں کے حق میں وصیت کردے ۔ اس صورت میں یہ چیز دائمی حکم کی حیثیت نہیں رکھیگی ۔ محض وقتی مشورہ ہوگا ۔

یہ بھی واضح رہے کہ وصیت اور وراثت کے احکام اسی وقت نافذ العمل ہوں گے جب افراد کے پاس فاضلہ دولت ہوگی ۔ جب معاشرہ ایسا قائم ہوجائے جس میں ہر فرد اپنی فاضلہ دولت کو قرآن کریم کے حکم کے مطابق قرآنی نظام کے حوالے کردے ۔ (دیکھئے عنوان ع ۔ ف ۔ و) تو اس وقت ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ نے ایسا ہی کیا تھا ۔ نہ حضورؐ نے زائد از ضرورت دولت اپنے پاس رکھی ، نہ ترکہ چھوڑا ۔ نہ جائداد بنائی ، نہ وہ وراثت میں کسی کی طرف منتقل ہوئی ۔ اسطرح آپؐ پر ترکہ اور وراثت کے احکام عائد نہیں ہوئے ۔ یہی کیفیت تمام مومنین کی اس وقت ہوگی جب قرآنی نظام ربوبیت قائم ہوگا ۔ اس وقت تک قرآن کریم کی رُو سے ہر مومن پر، جو کچھ مال چھوڑے ، وصیت کرنا فرض ہے ۔ اور وصیت کے معاملہ میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے معاملات کو فرد متعلقہ سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے ۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی ۔ ولایت بھیجا ۔ بیرسٹر کرایا ۔ وہ اب بڑا امیر اور خوش حال ہے ۔ دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہوا ہے ۔ اس کی پرورش ، تعلیم، تربیت وغیرہ کے تمام اخراجات باقی ہیں ۔ یہ شخص اپنی وصیت کی رُو سے اپنا پورا ترکہ اس نوزائیدہ بچے کو دے سکتا ہے ۔ لیکن اگر اسے حق وصیت نہ دیا جائے تو اس کے ترکہ کا آدھا حصہ بڑا بیٹا لے جائیگا ۔ وصیت کے متعلق اس انفرادی حق کے بعد ، قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں بکسر ظلم اور جانبداری سے کام لے تو معاشرہ (عدالت) کو اختیار ہے کہ عدل و انصاف کے مطابق ، وارثین میں مصالحت کی صورت پیدا کردے ($\frac{۲}{۱۸۲}$) ۔ وصیت کو قرآن کریم نے اتنی اہمیت دی ہے کہ سورۃ المائدہ میں اس کے لئے شہادت کا تفصیلی طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے ۔ ($\frac{۵}{۱۰۶}$) ۔

# و ض ع

وَضَعَ الشَّیْءَ مِنْ یَدِہٖ یَضَعُہٗ۔ اس نے کسی چیز کو ہاتھ سے گرا دیا۔ نیچے رکھ دیا*۔ وَضَعَ الشَّیْءَ فِی الْمَکَانِ۔ کسی چیز کو کسی جگہ رکھ دیا*۔ سورۃ کہف میں ہے وُضِعَ الْکِتَابُ (۱۸/۴۹)۔ سورۃ رحمٰن میں ہے۔ وَضَعَ الْمِیْزَانَ (۵۵/۷)۔ وضع حمل کے لئے یہ لفظ (۳۵/۱۱) میں آیا ہے۔ وَضَعَ عَنْہُ (۹۴/۲)۔ دور کر دینا۔ ہٹا دینا۔ گرا دینا۔ وَضْعُ ثِیَابٍ۔ کپڑے اتار کر رکھ دینا۔ (۲۴/۶۰)۔ مَوْضِعٌ جمع مَوَاضِعُ۔ جگہیں۔ موقعے۔ (۴/۴۶)۔ مَوْضُوْعَۃٌ۔ رکھے ہوئے (۸۸/۱۴)۔

وَضَعَتِ النَّاقَۃُ۔ اونٹنی تیز رفتاری سے چلی۔ وَضَعَ الرَّجُلُ۔ آدمی دوڑا۔ اَوْضَعْتُہٗ۔ میں نے اسے دوڑایا*۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ وَلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ (۹/۴۷)۔ وہ (فتنہ پیدا کرنے کے لئے) تمہارے اندر تگ و تاز کرتے۔ سرگرم عمل رہتے۔ بھاگ دوڑ کرتے۔

# و ض ن

وَضَنَہٗ۔ اس نے اسے ترتیب وار، ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ دیا۔ اَلْمَوْضُوْنَۃُ۔ بنی ہوئی زرہ۔ یعنی جس کے حلقے ایک دوسرے میں ترتیب وار پڑے ہوں۔ یا وہ چیز جس میں جواہرات ٹانکے گئے ہوں۔ یا وہ چیز جسے تہ بہ تہ جما کر رکھا گیا ہو۔ چنانچہ سَرِیْرٌ مَوْضُوْنٌ۔ دھرے بنے ہوئے پلنگ کو کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں سُرُرٍ مَوْضُوْنَۃٍ (۵۶/۱۵) آیا ہے۔ یعنی دھرے اور مضبوط بنے ہوئے پلنگ۔ یا جواہرات سے مرصّع پلنگ۔

# و ط أ

وَطِئَہٗ یَطَؤُہٗ وَطْأً۔ پاؤں سے کسی چیز کو روندنا۔ وَطِیَٔ الْمَرْاَۃَ یَطَؤُھَا۔ عورت سے وطی (جماع) کرنا۔ وَطُؤَ یَوْطُؤُ۔ نرم اور سہل ہونا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو دبا کر پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں۔ سورۃ فتح میں ہے۔ لَمْ تَعْلَمُوْھُمْ اَنْ تَطَئُوْھُمْ (۴۸/۲۵)۔ جنہیں تم لاعلمی میں پامال کردیتے۔

---

*تاج و راغب۔ **تاج و راغب و محیط۔

وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا (۳۳/۲۷) - ایسی زمینیں جنہیں تم نے اپنے پاؤں سے نہیں روندا - ان تک ہنوز تمہارے قدم نہیں پہنچے - اَلْمَوْطَأُ وَ الْمَوْطِیُٔ - قدم رکھنے کی جگہ* - وَ لَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا (۹/۱۲۰) - نہ وہ کسی ایسی سرزمین پر چلتے ہیں - مُوَاطَاَۃٌ* - دراصل یہ کسی کے قدم پر قدم رکھنے کو کہتے ہیں - رَجُلٌ مُوَطَّأُ الْعَقِبِ - وہ شخص جس کی پیروی اوراتباع کی جاتی ہو* - اس سے مُوَاطَاَۃٌ کے معنی موافقت اور مطابقت کرنے کے آتے ہیں* - چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے - لِیُوَاطِئُوْا عِدَّۃَ (۹/۳۷) - تاکہ اس طرح وہ اسے (مہینوں کی) گنتی کے مطابق کرلیں - سورۃ مزمل میں ہے - اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْأً (۷۳/۵) - رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے اٹھنا ، سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے - یا انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا مَرْکَبْ بن جاتی ہے (کیونکہ وَطَأَ الْفَرَسَ کے معنی ہیں وہ گھوڑے پر سوار ہوا)** - یہ نبی اکرمؐ کی اس جد و جہد کا بیان ہے جب حضورؐ (نظام خداوندی کے ابتدائی مراحل میں) دن رات مصروفِ کار رہتے تھے - اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے رات کا آرام بھی قربان کر دینا ، انسانی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی واضح شہادت ہے ، بالخصوص جب یہ قربانی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہ ہو ، بلکہ نوع انسان کی نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے ہو -

## و ط ر

اَلْوَطَرُ - حاجت - ایسی ضرورت جس کے پورا کرنے کی فکر اور خاص اہتمام ہو*** - اہم ضرورت**** -

قرآن کریم میں "قضائے وطر" (۳۳/۳۷) میں آیا ہے جس کے معنی ضرورت پورا کرلینا ہیں - یعنی قطعِ تعلق کر لینا - یا وظیفہ ازدواج کی خواہش و ضرورت کو پورا کرلینا - یعنی یہ فیصلہ کرلینا کہ اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی - اسی کو قطع تعلق کا فیصلہ کہینگے -

## و ط ن

اَلْوَطَنُ - انسان کے رہنے اور بسنے کی جگہ - اقامت گاہ - مجازاً بیل اور بکریاں باندھنے کی جگہ کو بھی کہہ دیتے ہیں - وَطَنَ بِہٖ - یَطِنُ - اَوْطَنَ - قیام کرنا - اِسْتَوْطَنَہٗ وَ اتَّطَنَہٗ وَ تَوَطَّنَہٗ وَ تَوَطَّنَ بِہٖ - اس نے اُس جگہ کو وطن بنا لیا - اَلْمَوَاطِنُ مِنَ الْحَرْبِ - جنگ کے میدان*** -

*تاج و راغب - **محیط - ***تاج و محیط - ****راغب -

قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے ۔ سورۃ توبہ میں ہے ۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ (۹/۲۵) ۔ ''یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بہت سے جنگ کے میدانوں میں تمہاری مدد کی'' ۔

# و ع د

وَعَدَ ۔ يَعِدُ ۔ وَعْدًا وَعِدَةً ۔ کوئی وعدہ کرنا ۔ خواہ اچھی بات کا ہو یا بری بات کا ۔ اگر وَعَدَ کے ساتھ خیر یا شر کا ذکر نہ کیا جائے تو خیر کے لئے وَعَدَ کہتے ہیں اور شر کے لئے اَوْعَدَ (لطائف اللغۃ) ۔ اَلْمِيْعَادُ ۔ وعدہ کا زمانہ یا مقام* ۔ مَوْعِدٌ کے معنی وعدہ اور عہد کے آتے ہیں، نیز وعدہ گاہ، وعدہ کا وقت* ۔ سورۃ کہف میں یہ لفظ ''وعدہ پورا ہونے کے وقت'' کے لئے آیا ہے (۱۸/۵۸) ۔

اَلْوَعِيْدُ ۔ حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑبڑانا ۔ یہ لفظ ہر دھمکی اور تہدید کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ اَوْعَدَهٗ اور تَوَعَّدَهٗ کسی کو دھمکانا ۔ ڈراوا دینا* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَاعَدْنَا مُوْسٰی (۲/۵۱) ۔ اس میں اللہ کی طرف سے وقت مقرر کرنا اور حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اس کا قبول کرنا اور اتباع کرنا دونوں شامل ہیں ۔ اسی لئے یہ باب مُفَاعَلَةٌ سے آیا ہے ۔ ویسے مُوَاعَدَةٌ کے معنی باہمی عہد و پیمان کرنے کے ہیں ۔

خدا کے وعدوں سے مراد ہیں وہ نتائج جو اس کے قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطا نہیں ہوتی ۔ اسی طرح ان قوانین سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں ۔

قرآن کریم میں اعمالِ صالحہ کے خوشگوار نتائج کے لئے بھی وَعَدَ کا لفظ آیا ہے (۲۴/۵۵) ۔ اور غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج کے لئے بھی (۹/۶۸) ۔

سورۃ توبہ میں ہے اِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ (۹/۱۱۴) ۔ ''(یہ) صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا'' ۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ خدا تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے ۔ یا خدا نے اس کا وعدہ کیا تھا ۔ تو اس کے معنی یہ

*تاج و محیط ۔

ہوں گے کہ خدا کے قانون پر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا "اپنے وعدہ" سے خدا، اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ جسطرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ "خدا کے وعدے سچے ہیں" تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کرکے رہتے ہیں۔ ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی۔

## و ع ظ

وَعَظَ کے معنی ہیں کسی کو کسی کام کے اچھے انجام اور مضر عواقب و نتائج سے آگاہ کرکے اس کے دل کو نرم کرنا۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اَلْوَعْظُ کہتے ہیں انذار و تخویف کو۔ نیز اس طرح خیر کی باتیں بیان کرنا جس سے دل میں نرمی پیدا ہو جائے۔ صاحب محیط کے نزدیک اس کے معنی محض "وعظ کہنے" کے نہیں بلکہ حکم دینے کے ہیں۔ یعنی کسی کو کسی ایسی بات سے حکماً روک دینا جسکا انجام خراب ہو*۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی زجرو توبیخ کو کہتے ہیں جس میں ڈراوا بھی شامل ہو**۔ قرآن کریم میں مَوْعِظَةٌ کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ حتیٰ کہ خود قرآن کریم کو بھی مَوْعِظَةٌ مِنْ رَّبِّكُمْ (۱۰/۵۷) کہا ہے۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں۔ یعنی دوسروں کو غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرکے، اُس سے روکنا۔ اور (نظام کے اندر) افراد کو غلط کاموں سے حکماً (بذریعہ قانون) روکنا۔ چنانچہ سورہ نحل میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ .... يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱۶/۹۰)۔ اس میں پہلے امر کا لفظ آیا ہے۔ یعنی اللہ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔ اور آخر میں يَعِظُكُمْ ہے۔ لہذا مومنین کے لئے خدا کا امر اور وعظ ایک ہی بات ہے۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کا حکم، کسی ڈکٹیٹر کا مستبدانہ حکم نہیں ہوتا۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اسکی حکمت، علت غائی، مقصد، فائدہ بھی بتاتا ہے۔ حکم اور حکمت کے اس مجموعہ کا نام وعظ ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲/۲۳۱)۔ خدا نے جو کتاب و حکمت (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے۔ یہ متقین

---

*تاج و محیط اور لین۔ **راغب

کے لئے مَوْعِظَۃٌ ہے (۲/۶۶) - ویسے اس کے ذریعے متنبہ ہر ایک کو کیا جائیگا - چنانچہ منافقین کے متعلق ہے فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (۴/۶۳) - ان سے اعراض کر اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتا رہ ، بڑے دلنشیں انداز سے (۴/۶۳) - لہذا غیر مسلموں کے لئے دین کی طرف دعوت کے سلسلے میں ” وعظ “ پندو نصائح کے مرادف ہوگا ، اور مسلمانوں کے لئے قرآنی احکام اور ان کے نظام کی طرف سے جاری کردہ ہدایات جن کے مقاصد و فوائد کو اس انداز سے سمجھایا گیا ہو کہ اس سے دل میں لینت و رقت پیدا ہو جائے اور وہ اسطرح ان پر عمل پیرا رہیں -

## و ع ی

وَعَاهُ يَعِيْهِ وَعْيًا - نیز اَوْعٰى يُوْعِيْ - اِيْعَاءٌ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - یاد کر لینا - حفظ کر لینا - کسی چیز کو برتن میں جمع کر لینا* - بالعموم وعی باتوں وغیرہ کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کے لئے آتا ہے اور اَوْعٰى اشیاء اور ساز وسامان کو محفوظ رکھنے کے لئے** - اَلْوِعَاءُ (جمع اَوْعِيَۃٌ) وہ چیز (برتن - تھیلا - بوری وغیرہ) جسمیں دوسری چیزیں اکٹھی کرکے رکھی جائیں (۱۲/۷۶) - سورہ معارج میں سرمایہ دارانہ ذہنیت والے کے متعلق ہے وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰/۱۸) - وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے بند کرکے رکھ لیتا ہے - سورہ انشقاق میں ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (۸۴/۲۳) - اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اسطرح جمع کرکے بند رکھتے ہیں - اُذُنٌ وَاعِيَۃٌ بات کو محفوظ رکھنے والا کان - یعنی جس کان میں جو کچھ پڑے پھر وہ اسے باہر نہ نکالے اور اس پر غور و فکر بھی کرے* - سورہ حاقہ میں ہے وَتَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَۃٌ (۶۹/۱۲) - ” اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں “ -

## و ف د

اَلْوَفْدُ - ریت کے اوپر سے جھکے ہوئے ٹیلے کی چوٹی - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جھانکنے اور نکلنے کے ہیں - اَلْوَافِدُ - سب سے آگے نکل جانے والا (اونٹ) - اَلْاِيْفَادُ - کسی چیز کا بلند ہونا اور اوپر سے جھکنا - تیز چلنا - جلدی کرنا - هُمْ عَلٰى اَوْفَادٍ - وہ لوگ سفر پر ہیں - الاِيْفَادُ - کسی کو کسی کے پاس ایلچی بنا کر بھیجنا -

---

*تاج و محیط - **راغب و ابن فارس -

وَفَدَ فُلَانٌ ۔ وہ کسی بادشاہ یا امیر کے پاس (ایلچی بنکر) پہنچا ۔ اَوْفَدَهُ عَلَيْهِ ۔ اس نے اسے اس کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا ۔ وُفُوْدٌ ۔ بڑے لوگوں کے پاس عطایا لینے کے لئے جانا* ۔ اَلْوَفْدُ ۔ وہ لوگ جو فتح کے جشن پر مبارکباد دینے کے لئے یا کسی اور موقعہ پر بادشاہ کے دربار میں پہنچیں** ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَفْدُ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بادشاہوں کے پاس جائیں*** ۔

سورہ مریم میں ہے يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (۱۹/۸۵) ۔ جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے پاس بطور وَفْد اکٹھا کرینگے ۔ اوپر دئے ہوئے معانی کے لحاظ سے وَفْدًا کے اندر بلندی اور عظمت ، قرب اور مسابقت ، عزت اور برگزیدگی ، حصول عطایا و نوازشات اور وصول سامانِ نشو و نما سب کچھ آجاتا ہے ۔ یہ ہے متقین کے اعمال حیات کا نتیجہ اور اُن کا مقام ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ متقین کو سب سے آگے رکھا جائیگا ۔ اس میں بھی عزت اور برگزیدگی کا پہلو موجود ہے ۔

# و ف ر

اَلْوَفْرُ مِنَ الْمَالِ وَالْمَتَاعِ ۔ وسیع پیمانہ پر کثیر مال و اسباب جن میں کسی چیز کی کمی نہ ہو ۔ وَفَرَ الْمَالُ ۔ مال کثیر ، باافراط اور پورا ہو گیا ۔ اَرْضٌ وَفْرَاءُ ۔ وہ زمین جس میں بکثرت پودے اور گھاس وغیرہ ہوں ۔ وَفَّرَهُ تَوْفِيْرًا ۔ اسنے اسکو بھرپور ، کثیر اور مکمل کر دیا ۔ اَلْوَفْرَاءُ ۔ بھری ہوئی چیز ۔ وہ پکھال جو پوری کھال سے بنائی گئی ہو ۔ اَلْوَافِرَةُ ۔ دنبہ کی بڑی چکتی (چکی) ۔ اَلْمَوْفُوْرُ ۔ ہر وہ چیز جو مکمل ہو چکی ہو**** ۔ قرآن کریم میں ہے جَزَاءً مَوْفُوْرًا ۔ (۱۷/۶۳) ۔ پورا پورا بدلہ ۔ جسمیں سے کچھ کم نہ کیا گیا ہو ۔

# و ف ض

وَفَضَ يَفِضُ وَفْضًا ۔ وہ تیزی سے دوڑا ۔ اِسْتَوْفَضَ ۔ اسنے جلدی کی ۔ نَاقَةٌ مِيْفَاضٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی ۔ اصل میں اَلْاِيْفَاضُ کے معنی ترکش اٹھا کر تیزی سے بھاگنے کے ہیں ۔ اسلئے کہ اَلْوَفْضَةُ چمڑے کا ترکش ہوتا ہے جسمیں لکڑی لگی ہوئی نہیں ہوتی ۔ ویسے یہ اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں چرواہا اپنا توشہ وغیرہ رکھتا ہے***** ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و راغب و محیط ۔ *****تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۴۳/۷۰)۔
گویا وہ کسی نشان (Goal) کیطرف بھاگے جارہے ہیں ۔

## و ف ق

اَلْوَفْقُ ۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونا ۔ ضرورت کے مطابق ہونا *۔ اَوْفَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ سب برابر ہوئے اور ایک صف میں کھڑے ہوگئے *۔ اَلْاِتِّفَاقُ ۔ انسان کے عمل کا اندازے اور پیمانۂ (تقدیر) کے مطابق ہو جانا ***۔ اَلتَّوْفِیْقُ ۔ اسباب کا مقصد کے مطابق کر دینا ۔ حصول مقصد کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے انہیں مہیا کر دینا**۔ موافقت پیدا کر دینا ۔ وَفَّقَ بَیْنَ الْقَوْمِ ۔ اس نے قوم کے درمیان صلح کرا دی**۔

سورہ نساء میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ان میں اصلاح کی کوشش کرو ۔ یُوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا (۴/۳۵) ۔ اللہ ان میں موافقت پیدا کر دیگا ۔ اعمال کے نتائج کو (سورہ النبأ میں) جَزَآءً وِّفَاقًا کہا گیا ہے (۷۸/۲۶) ۔ یعنی عمل اور اس کے نتیجہ میں پوری پوری موافقت ۔ (قرآن کریم کی رو سے جزا یا سزا خود عمل کے نتیجہ کا نام ہے) ۔ سورہ ہود میں ہے ۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۱/۸۸) ۔ میرے پیش نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مل جانا ، یا ان میں صحیح موافقت پیدا ہو جانا ، قانون خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا اسکی کوئی صورت نہیں ۔ (۴/۶۲) میں تَوْفِیْقًا کے معنی سنوارنے اور سدھارنے کے ہیں ۔ یعنی اصلاح ۔ موافقت ۔

## و ف ی

وَفَی الشَّیْءُ وُفِیًّا ۔ وہ چیز مکمل ہوگئی ۔ پوری ہو گئی ۔ کثیر ہوگئی ۔ اسی سے وَفِیٌّ وَّ وَافٍ کے معنی ہیں مکمل اور کثیر ۔ اَوْفَانِیْ حَقِّیْ ۔ اس نے میرا حق پورا پورا دیدیا ۔ اس میں کمی نہیں کی ۔ یہی معنی وَفَّی کے بھی ہیں ۔ یعنی پورا پورا دیدینا ****۔ اِسْتَوْفٰی فُلَانٌ حَقَّهٗ ۔ اس نے اپنا حق پورا پورا لے لیا ۔ اَلْوَفِیُّ ۔ وہ شخص جو پورا پورا حق ادا کرے ۔ اور پورا پورا حق وصول کرے ۔ نیز بہت وفاشعار ۔ اَلْوَفَاءُ کے معنی ہیں وعدہ پورا کرنا ۔ عہد و پیمان کا لحاظ کرنا اور پاس رکھنا ۔ اَلْوَفَاةُ کے معنی ہیں موت ، یعنی دنیا میں زندگی کے دن پورے کر لینا ۔ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ۔ خدا نے اسے وفات دیدی****۔ اَلْوَفٰی ۔ بلند زمین کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافِیْ اُس چیز کو جو آجائے یا اچانک نمودار ہو جائے ****۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ایفائے عہد، نقض عہد کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶/۹۱)۔ اور (۳/۲۴) میں وُفِّیَتْ کے معنی لَا یُظْلَمُوْنَ نے کر دئے ہیں۔ یعنی کمی نہ ہونا۔ پورا پورا مل جانا۔ سورہ ہود میں ہے وَاِنَّا لَمُوَفُّوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۱/۱۰۹)۔ اس سے تَوْفِیَۃٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ یعنی بلا کسی قسم کی کمی کئے پورا پورا دینا۔ سورہ نحل میں ہے وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ وَمِنْکُمْ مَنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶/۷۰)۔ اس کے معنی ہیں، اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے۔ پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی بھرپور جوانی تک پہنچا دیتا ہے جس میں تمام قویٰ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچا دیتا ہے جس میں قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آجاتا ہے۔ یہ معانی، انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی پہلے پیدائش۔ پھر جوانی۔ پھر بڑھاپا۔ لیکن اگر یَتَوَفّٰکُمْ کے معنی "وفات دیتا ہے" کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ بعض لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں۔

وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا (۶/۶۱)۔ یہانتک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اُسے وفات دیدیتے ہیں۔ خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق اس کے زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ (۵/۱۱۷)۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔

مُتَوَفِّیْ۔ وفات دینے والا۔ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ (۳/۵۴)۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں۔ اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ۔ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (۳/۵۳)۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کرسکینگے نہ صلیب دے سکینگے۔ بلکہ تم اپنی طبعی موت مرو گے (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ)۔ یہ لوگ تمہیں صلیب دیکر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کرینگے (وَرَافِعُکَ اِلَیَّ)۔ اور یہ اسطرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے۔ (وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ (۳/۵۴)۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے

کہ یہودی حضرت مسیح ؑ پر ہاتھ ڈالتے ، آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق ، وہاں سے ہجرت کر چکے تھے - یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی - (مزید تفصیل میری کتاب "شعلہ مستور" میں ملیگی) -

# و ق ب

اَلْوَقْبُ - پہاڑ یا چٹان میں گڑھا ، جس میں پانی جمع ہو جائے -
اَلْوَقْبَۃُ - ہموار میدان میں کنوئیں کی طرح ایک قدِ آدم یا دو قدِ آدم کے برابر گڑھا جس میں پانی جمع ہوجائے - پھر ہر گڑھے کے لئے بولا جانے لگا - اَلْوَقْبُ - کسی چیز کے اندر داخل ہو کر غائب ہو جانا - وَقَبَتِ الشَّمْسُ - سورج غروب ہو گیا - وَقَبَ الظَّلَامُ - تاریکی چھا گئی - یعنی لوگ اس کے اندر ڈوب کر غائب ہوگئے* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا غائب ہونے کی جگہ غائب ہو جانا بتائے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ( ۱۱۳/۳ ) - جب چاروں طرف سے تاریکیاں چھا جائیں - جب رات کی تاریکی میں آنے والی مصیبتیں گھیر لیں - (دیکھئے عنوان غ -س - ق) - لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنے ہیں "ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو" - اور اس سے مراد ہیں وہ تمام چیزیں جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رک جائے ، جیسے چاند جب ڈوب جاتا ہے تو نباتات کو ضرر پہنچتا ہے - ہماری ضروریاتِ زندگی کے نہ ہونے سے جس قدر نقصانات ہمیں پہنچ سکتے ہیں، ہم ان سے محفوظ رہنے کے لئے ، قانونِ خداوندی کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان نقصانات سے بچائے اور ہمیں سامانِ نشو و نما مہیا کردے - (المقام المحمود) -

# و ق ت

اَلْوَقْتُ - کسی کام کے لئے مقررہ زمانہ کی آخری حد - لہذا یہ لفظ بے اندازہ زمانہ کے لئے نہیں بولا جاتا** - یعنی غیر معین عرصہ کو وقت نہیں کہہ سکتے - ہر چیز جس کے لئے اس طرح زمانہ متعین کر دیا جائے مُوَقَّتٌ کہلاتی ہے - الوَقْتُ وَ التَّوْقِیْتُ - وقت مقرر کرنا - اَلْمِیْقَاتُ - مقررہ وقت کو بھی کہتے ہیں اور مقررہ مقام کو بھی - چنانچہ مِیْقَاتُ الْحَاجِّ - حاجیوں کے احرام باندھنے کے مقام کو کہتے ہیں*** -

---

*تاج و محیط و راغب - **راغب - ***تاج -

قرآن کریم میں ہے وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۷۷/۱۱) - جب رسولوں کا وقت مقرر کر دیا جائے گا - سورۃ نساء میں صلوٰۃ کے متعلق کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) کہا گیا ہے - اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ'' اور دوسرے معنی ہیں ایسا فریضہ جس کا وقت متعین کر دیا گیا ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْقُوْتُ - حد مقرر کردہ چیز کو کہتے ہیں - یعنی جس کی حد مقرر ہو - سورۃ بقرہ میں نئے چاند کے متعلق ہے - ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ (۲/۱۸۹) - یہ لوگوں کے لئے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہیں (مِیْقَاتٌ کی جمع مَوَاقِیْتُ) - سورۃ نبأ میں یَوْمَ الْفَصْلِ کے متعلق ہے کَانَ مِیْقَاتًا (۷۸/۱۸) - یعنی قانون مکافات کی رو سے ظہور نتائج کا وقت متعین ہوتا ہے -

# و ق د

وَقَدٌ - آگ کو کہتے ہیں ، اور آگ کے روشن ہونے کو بھی - وَقُوْدٌ - لکڑیوں کو کہتے ہیں جن سے آگ جلائی جائے - صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْحَطَبُ - ایندھن کی لکڑیوں کو کہتے ہیں - اور وُقُوْدٌ اس وقت کہتے ہیں جب ان لکڑیوں کو سلگا دیا جائے - اَوْقَدَ - اور اِسْتَوْقَدَ - آگ روشن کرنے کو کہتے ہیں* -

روح المعانی میں ہے کہ عربوں میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند پہاڑی پر آگ جلا دیتے - اس کو نار الحرب کہتے تھے (۵/۶۴) - قرآن کریم میں اِسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں آیا ہے - سورۃ مائدہ میں اَوْقَدَ بمقابلہ اَطْفَاَ آیا ہے - (۵/۶۴) - اَطْفَاَ کے معنی آگ بجھا دینے کے ہیں - سورۃ قصص میں تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ فرعون نے ہامان سے کہا کہ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ (۲۸/۳۸) - جس سے مراد اینٹوں کا آگ میں پکانا ہے - وَقُوْدٌ - ایندھن (۲/۲۴ و ۶۶/۶ و ۸۵/۵) - مُوْقَدَۃٌ (۱۰۴/۶) جلائی ہوئی -

# و ق ذ

اَلْوَقَذُ - شدتِ ضرب - بصائر میں ہے کہ مَوْقُوْذَۃٌ اس جانور کو کہتے ہیں جسے لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اور ذبح نہ کیا جائے اور جس پتھر سے اسے مارا جائے اس میں دھار نہ ہو** - جاہلیت میں اس طرح مرے

*تاج - **محیط -

ہوئے جانور کو کھا لیا کرتے تھے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لکڑی سے مارنے کے لکھے ہیں ۔ اور مَوْقُوْذَۃٌ ۔ جسے لکڑی کی ضرب سے مار ڈالا گیا ہو ۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے ( ۵/۳ ) ۔ ابو سعید نے کہا ہے کہ اَلْوَقْذُ کا مطلب ہے گُدّی کے اوپر اس زور سے مارنا کہ اس سے دماغ ماؤف ہو جائے* ۔

قرآن کریم نے اَلْمَیْتَۃُ ( مُردار ) کو بھی حرام قرار دیا ہے ۔ اس کی تشریح یہ کہکر کر دی ہے کہ مردار میں صرف وہی جانور شامل نہیں جو طبیعی موت مر جائیں ۔ اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو گلا گھٹ کر مر جائے ۔ جو چوٹ کھا کر مر جائے ( اَلْمَوْقُوْذَۃُ ) ۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے ۔ جو سینگ لگ کر مر جائے ۔ یا جسے درندوں نے کھایا ہو ۔ ہاں ، اگر ان میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا ۔ ( ۵/۳ ) ۔

## و ق ر

اَلْوَقْرُ ۔ کان میں بھاری پن ہونا ۔ یا سماعت کا بالکل جاتے رہنا** ۔ قرآن کریم میں ہے وَ فِیْ اٰذَانِہِمْ وَقْرًا ( ۶/۲۵ ) ۔ اَلْوِقْرُ ۔ بھاری بوجھ ۔ اَلْوَقَارُ ۔ سنجیدگی ، بھاری بھرکم پن ، عظمت ۔ جَنَانٌ وَاقِرٌ ۔ باہمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرا نہ اٹھے** ۔ اس سے بھی وَقَارٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے مَالَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا ( ۷۱/۱۳ ) ۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم خدا سے وقار کے امیدوار (طلبگار) نہیں ہوتے۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے ۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں درست ہوگا جب لِلّٰہِ کے معنی مِنَ اللہ ( اللہ سے ) لئے جائیں ۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ تم اللہ کے لئے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے ۔

وَقَّرَ ۔ کسی کی تعظیم کرنا ۔ تُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ ( ۴۸/۹ ) ۔ اسے تقویت پہنچاؤ اور اس کی تعظیم کرو ۔ سورۃ احزاب میں ازواج مطہرات سے کہا گیا ہے ۔ وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ( ۳۳/۳۳ ) ۔ اپنے گھروں میں نہایت سنجیدگی اور وقار سے رہو ۔ تم سے ذرا بھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہ ہو ۔ یعنی یہ وَقْرٌ سے ہے ۔ لیکن ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ وَقَارٌ سے ہے جس سے امر قِرْ آتا ہے ۔ جیسے وَعْدٌ سے عِدْ آتا ہے*** ۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***ابن فارس ۔

## و ق ع

وَقَعَ يَقَعُ ـ وُقُوْعاً ـ چیز گر پڑی ـ وَقَعَتِ الْإِبِلُ ـ اونٹ بیٹھ گئے ـ وَقَعَ رَبِيْعٌ بِالْأَرْضِ ـ بہار کی پہلی بارش برسی ـ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ ـ جن مقامات پر بارش برسی ہو ـ وَقَعَتِ الطَّيْرُ ـ پرندے اڑتے اڑتے کسی درخت یا زمین پر اتر پڑے ـ اَلْوَقَعُ ـ پتھر ـ اَلْوَقِيْعَةُ ـ اَلْوَاقِعَةُ ـ جنگ ، معرکہ ـ وَقَائِعُ الْعَرَبِ ـ عربوں کے ایام جنگ ـ اَلْوَقِيْعَةُ ـ ہتوڑا * ـ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُقُوْعُ کسی چیز کے ثابت ہونے اور گرنے کو کہتے ہیں ـ اَلْوَاقِعَةُ ایسا واقعہ جس میں سختی اور ناگواری پائی جائے ** ـ زجاج نے کہا ہے کہ ہر آنے والی چیز جس کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ ضرور آئیگی ـ اسے وَاقِعَةٌ کہدیتے ہیں * ـ

قرآن کریم میں ہے وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ (۲۲/۶۵) ـ خدا نے (اپنے قانون کے مطابق) بارش کو روک رکھا ہے کہ وہ یونہی از خود زمین پر نہ گر پڑے ـ سورہ نساء میں ہے ـ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ (۴/۱۰۰) اس کا اجر اللہ پر واجب ہو گیا ـ سورہ اعراف میں ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ (۷/۱۱۸) ـ حق محسوس شکل میں سامنے آ کر ثابت ہو گیا ـ سورہ الطور میں ہے إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (۵۲/۷) ـ خدا کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا ـ دوسری جگہ ہے إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۵۶/۱) جب ہو جانے والی بات ہو جائیگی ـ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (۵۶/۲) اسکے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ـ مَوَاقِعُ ـ واقع ہونے کی جگہیں (۵۶/۷۵) ـ مُوَاقِعٌ (اسم فاعل) ـ گر پڑنے والا (۱۸/۵۳) ـ أَوْقَعَ ـ ڈال دینا ـ (۵/۹۱) ـ

## و ق ف

وَقَفَ بِالْمَكَانِ يَقِفُ ـ وُقُوْفاً ـ وہ اس جگہ پر برابر کھڑا رہا ـ وَقَفْتُهُ ـ وَقْفاً ـ میں نے اسے ٹھہرا دیا *** ـ قرآن کریم میں ہے وَقِفُوْهُمْ (۳۷/۲۴) انہیں ٹھہراؤ ـ اَلْمَوْقِفُ ـ ٹھہرنے اور کھڑے ہونے کی جگہ ـ اَلتَّوْقِيْفُ فِي الْحَدِيْثِ ـ بات کو واضح کرنا *** ـ اصطلاحاً التَّوْقِيْفُ کسی بات کو معین کرنے کے لئے بولا جاتا ہے ـ

## و ق ی

وَقَى الشَّيْءَ يَقِيْهِ وَقْياً وَ وِقَايَةً ـ کسی چیز کی حفاظت کرنا ـ نگہبانی و نگہداشت کرنا ـ اسے مضر اور تکلیف دہ چیز سے بچانا ـ چنانچہ جب

*تاج ـ **راغب ـ ***تاج و محیط ـ

گھوڑا چلتے وقت نعل نہ ہونے کی وجہ سے سنبھال سنبھال کر پاؤں زمین پر رکھے ، خواہ اپنے سم میں درد کی وجہ سے ہو، یا سم کے چھل کر زخمی ہونے اور زمین کے سخت ہونے کی وجہ سے، تو اسے وَقِی الْفَرَسُ مِنَ الْحَفَا کہتے ہیں *۔

وِقَایَۃٌ ۔ احتیاط ۔ یا محفوظ رکھنے کا ذریعہ (Preservative) **۔

سَرْجٌ وَاقٍ ۔ ایسی زین جو گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ٹھیک بیٹھ جائے اور اسے زخمی نہ کرے**۔

قرآن کریم میں وَاقٍ بمعنی محفوظ رکھنے والا ، بچانے والا آیا ہے۔ مَالَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَلِیٍّ وَلَا وَاقٍ (۱۳/۳۷) '' تیرے لئے اللہ کے مقابلہ پر نہ کوئی سرپرست ہوگا۔ نہ بچانے والا'' ۔دوسرے مقام پر یہ مادہ محتاط رہنے اور اپنی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے ۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ (۲/۲۴) اپنے آپ کو عذاب آتش سے محفوظ رکھو۔ یا اس سے محتاط رہو۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ۔ احکام خداوندی کا اتباع کرنا ۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان سے ہم آہنگ رہنا ۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ مفہوم دیگر مقامات میں واضح کر دیا ہے ۔ سورہ مائدہ میں تَقْوٰی کے مقابلہ میں عُدْوَانٌ کا لفظ آیا ہے (۵/۲) ۔ اور عُدْوَانٌ کے معنی سرکشی کے ہیں ۔ لہذا تَقْوٰی کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہوا ۔ سورہ آل عمران میں اسکی مزید تشریح کر دی گئی ہے جہاں فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۳/۱۰۱) ۔ اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۱۰۱) یعنی تمام عمر قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو۔ بالفاظ دیگر اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) ۔ سب کے سب مل کر اللہ کے ضابطہ ہدایت کے ساتھ متمسک رہو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (قرآن کریم) سے ہم آہنگ رہنا ۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کرنا ۔ اسی لئے سورہ شعراء میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں غٰوِیْنَ آیا ہے (۲۶/۹۰-۹۱) ۔ غٰوِیْنَ وہ جو قوانین الٰہیہ کی راہ نمائی چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیں اور مُتَّقِیْنَ وہ جو اسکی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں ۔ قوانین خداوندی کی اس کامل ہم آہنگی کے اعتبار سے سورہ ص میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۲۸) ۔ فَاجِرٌ وہ

*تاج ۔ **لین ۔

ہے جو پھٹ کر الگ ہو جائے (دیکھئے ف - ج - ر) لہذا متقی وہ ہے جو اس ضابطہ کے ساتھ متمسک رہے - اسکے ساتھ چمٹا رہے - اس سے ہم آہنگ رہے - پھٹ کر الگ الگ ہو جانے (Disintegration) اور ہم آہنگ رہنے (Integration) کے مفہوم کے اعتبار سے سورہ الشمس میں ہے کہ خدا نے نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) میں یہ دونوں صلاحیتیں رکھدی ہیں - فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸) چاہے تو انسان ضابطہ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت و انتشار پیدا کر لے - انہی دونوں گروہوں کے متعلق سورہ محمد میں ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنے ہی خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتے ہیں (۴۷/۱۴) - لیکن دوسرا گروہ ان کا ہے جو قوانین خداوندی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں - اس دوسرے گروہ کو ان کا تقوی مل جاتا ہے (آتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ - ۴۷/۱۷) - لیکن یہ اسی کو ملتا ہے اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی * - (۹۲/۱۸-۱۷) - جو اپنا مال (یا جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد (۲/۲۱۹) اسکے پاس ہے وہ نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) دیدیتا ہے اور اسطرح خود اپنی ذات کی نشوونما (Development) کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے * -

لہذا مُتَّقِیْنَ وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرکے اپنی ذات کی نشوونما کریں - تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تُقَاةً) کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقْوٰی) - ان کا ہر وقت خیال رکھے - (تَقْوَی الْقُلُوْبِ) اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے - اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے - ایسا تمسک جیسے زین گھوڑے کی پیٹھ پر فٹ آجاتی ہے اور اسے زخمی نہیں ہونے دیتی -

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہدیا ہے کہ یہ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲/۲) - ہے - یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر جانا چاہیں - جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح اور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے - خودکشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا

---

*یتزکی (نشو و نما) - دیکھئے (ز - ك - و)

مہلک ہوتا ہے، اس سے بچنا، بے سود ہوتا ہے۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)۔ " ان کے لئے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ وہ صحیح بات کو ماننیگے ہی نہیں"۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں دیکھنا چاہئے کہ کہاں اس کے معنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہیں اور کہاں تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچنا۔ مثلاً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۰۱)۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۶۶/۶) مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ (۵۹/۹)۔ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ اور مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ (۴۰/۹)۔ میں معنی بچانے کے ہیں۔ لیکن وَاتَّقُوا اللّٰهَ (۵۹/۱۸) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی کو تَقْوٰی کہتے ہیں۔ اور جو اَتْقٰى (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے (۴۹/۱۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ تَقْوٰی قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اسقدر اہمیت دی ہے کہ یہ بچائے خویش گویا ایک مادہ بن گیا ہے جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے۔ اس کے معنی "پرہیزگاری" نہیں۔ "پرہیزگاری" محض سلبی صفت (Negative virtue) ہے لیکن تقوی میں زندگی کی تباہیوں سے بچکر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے۔ یعنی اس میں سلبی صفت کے ساتھ ایجابی پہلو (Positive side) بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے۔ لفظ "تقوی" اسقدر جامع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں ہو نہیں سکتا۔ جس چیز کو عام طور پر کیریکٹر (سیرت اور کردار کی بلندی) کہا جاتا ہے، وہ اس کے اندر آجاتی ہے۔ "کیریکٹر" کی تعریف (Definition) بڑی مشکل ہے اور خود مغرب کے علمائے اخلاقیات بھی اس باب میں باہمدگر متفق نہیں۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل عقدہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، انسان کی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک حیوانی سطح زندگی جس کے تقاضے وہی ہیں جو دوسرے حیوانات کے ہیں۔ تحفظ خویش (Self-Preservation)؛ تغلب (Self-Assertion) اور افزائش نسل (Procreation)۔ تحفظ خویش کا جذبہ اسقدر قوی اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی سے تمام کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

دوسری سطح زندگی وہ ہے جسے "انسانی زندگی" کہہ لیجئے۔ اس زندگی میں مقصد، انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہ نشو و نما ان بلند اور

مستقل اقدار (Permanent Values) کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ حیوانی سطح زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے ( یعنی کسی بلند قدر ) میں تصادم ہو جائے ، ( ان میں Tie پڑ جائے ، تو ، حیوانی زندگی کے تقاضے کو ، بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا چاہئے ۔ یہ "تقویٰ" ہے ۔ اس کو کریکٹر کہتے ہیں ۔ ( نیشنل کیریکٹر نہیں بلکہ انسانی کریکٹر ) ۔ حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آ جائے کہ بلند قدر کی حفاظت کے لئے جان تک بھی دینی پڑ جائے تو جان دیدے اور انسانی قدر کو بچا لے ۔ اس لئے کہ جان کا تحفظ بہر حال حیوانی سطح زندگی کا تقاضہ ہے ۔ اور بلند قدر کی قیمت اس سے زیادہ ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کو محض حیوانی زندگی ( Physical Life ) سمجھتے ہیں اور انسانی سطح زندگی ( انسانی ذات ) پر ایمان نہیں رکھتے ، وہ کافر ہیں ۔ (۴۵/۲۴ ; ۲۷/۱۳) ۔ انسانی ذات پر ایمان رکھنا مومن کی خصوصیت ہے ۔

قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال رکھنا اور نقصان سے بچنا عقل کا تقاضا ہے ۔ جو اپنا نفع نقصان نہ پہچانے اسے پاگل کہتے ہیں ۔ چونکہ مومن کے نزدیک ، انسانی ذات کا تحفظ ، حیوانی زندگی کے تحفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے جب ان دونوں تقاضوں میں تصادم ہو جائے ، تو اس کی عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی قیمت کی شے ( انسانی ذات ) کی حفاظت کے لئے چھوٹی قیمت کی شے ( حیوانی تقاضے ) کو قربان کر دے ۔ لہذا ، صحیح عقل و فکر کے مالک مومن ہی ہوتے ہیں (۳/۱۸۹) ۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللهَ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) ۔ "اے عقل والو ، جو ایمان لائے ہو ، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو" ۔ یعنی بلند اقدار کی خاطر پست اقدار کو قربان کر دینا تقاضائے عقل و ایمان ہے ۔ قرآن کریم انسان میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے خالی جذبات سے اپیل نہیں کرتا ۔ وہ علم و بصیرت (Reason) سے اپیل کرتا ہے اور عقل کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا خود اس کے لئے کسقدر مفید ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کیطرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہے (۱۲/۱۰۸) ۔ اور مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ ، اور تو اور ، قوانین خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے ۔ (۲۵/۷۳) ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقویٰ ۔ اور انہیں کہتے ہیں متقین ۔

# و ک أ

تَوَکَّاَ عَلَى الشَّيْءِ ۔ اس نے اس چیز پر سہارا لیا اور ٹیک لگائی ۔ اَلتُّکَاَۃُ ۔ لاٹھی ، جس پر چلنے میں ٹیک لگائی جاتی ھے ۔ بہت سہارا لینے والا آدمی* ۔ سورۃ طٰہٰ میں ھے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا ھِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا (۲۰/۱۸) ۔ یہ میرا عصا ھے جس پر میں سہارا لیتا ھوں ۔ (اس کے مجازی معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ھوگا کہ جو کچھ احکام و ضوابط مجھے ملے ھیں وہ میرے لئے عصائے زندگی ھیں جن کے سہارے میں سفر حیات طے کروں گا ) ۔ سورۃ طور میں ھے ۔ مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَۃٍ (۵۲/۲۰) ۔

سورۃ یوسف میں ( عزیز مصر کی بیوی کی ضیافت کے سلسلہ میں ھے ) وَ اَعْتَدَتْ لَھُنَّ مُتَّکَاً (۱۲/۳۱) ۔ زجاج نے کہا ھے کہ اس میں مُتَّکَاً کے معنے اس چیز کے ھیں جس پر کھانے پینے یا بات کرتے وقت ٹیک لگائی جائے ۔ بعض نے کہا ھے کہ اس کے معنی خود کھانے (طعام) کے ھیں ۔ چنانچہ کہتے ھیں اِتَّکَاْنَا عِنْدَ زَیْدٍ ۔ ھم نے زید کے پاس کھانا کھایا* ۔

# و ک د

اَلْوِکَادُ ۔ وہ رسّی جس سے دودھ دوھتے وقت گائے کے پیروں کو باندھ دیتے ھیں ۔ نیز تسمہ جس سے زین کستے ھیں ۔ اَلتَّوَاکِیْدُ ۔ اَلتَّاکِیْدُ ۔ اَلْمَیَاکِیْدُ ۔ وہ چمڑے کے تسمے جن سے زین کے اگلے یا پچھلے (حصے کو) کس کر باندھ دیا جاتا ھے ۔ وَکَّدَ الرَّحْلَ ۔ اس نے کجاوہ کو کس کر باندھ دیا ۔ وَکَّدَ الْعَھْدَ وَ الْعَقْدَ وَ اَکَّدَھُمَا ۔ اس نے عقد اور معاملہ کو بہت محکم اور موثق ( پختہ) کر دیا ۔ گرہ کو بہت سختی سے باندھ دیا** ۔

خلیل نے کہا ھے کہ اَکَّدْتُ قسموں کی پختگی کے لئے زیادہ مناسب ھے اور وَکَّدْتُ باتوں کی پختگی کے لئے*** ۔ بعض نے کہا ھے کہ تَاْکِیْدٌ کی نسبت تَوْکِیْدٌ زیادہ فصیح ھے* ۔ قرآن کریم میں ھے لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا (۱۶/۹۱) ۔ اپنی قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و محیط و راغب و ابن فارس ۔ ***راغب ۔

# و ک ز

اَلْوَکْزُ۔ دھکا دینا ۔ گھونسہ مارنا ۔ ضرب لگانا ۔ ٹھوڑی پر مکا مارنا۔ وَکَزَہٗ بِالرُّمْحِ ۔ اس نے اس کے نیزہ گھونپا ۔ وَکَزْتُ اَنْفَہٗ میں نے اس کی ناک توڑ دی* ۔ سورۃ قصص میں ہے فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی (۲۸/۱۵) ۔ موسیٰ نے اسے گھونسا مارا ۔ (مفہوم مارنے کا ہے) ۔

# و ک ل

رَجُلٌ وَکَلٌ یا مُوَاکِلٌ ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے ۔ تَوَاکَلُوْا تَوَاکُلًا ۔ لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنے شروع کر دئے ۔ اِتَّکَلَ عَلَیْہِ فِیْ اَمْرِہٖ ۔ اس نے اپنے معاملہ میں اس پر اعتماد کیا ۔ اَوْکَلْتُ عَلٰی اَخِیْکَ الْعَمَلَ ۔ میں نے تمام کام تمہارے بھائی پر چھوڑ دیا ۔ اس کے سپرد کر دیا ۔ اَلْوَکِیْلُ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے آدمی کے کام کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے** ۔ نیز یہ کَفِیْلٌ کے معنی میں بھی آتا ہے ۔ یعنی کسی بات کا ذمہ دار*** ۔

ہمارے ہاں تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ انسان خود کچھ نہ کرے اور اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کے لئے از خود سب کچھ کر دے گا ۔ توکل کا یہ مفہوم قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے جو ہر قدم پر سعی و عمل اور جد و جہد کی تاکید کرتا ہے ۔

آپ ایک آدمی کو سمندر میں پھینک دیجئے ۔ وہ تیرنا نہ جانتا ہو تو ڈوب کر مر جائے گا ۔ آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پانی میں ڈال دیجئے، وہ جھٹ پانی کے نیچے چلا جائے گا ۔ لیکن اگر آپ اسی لوہے کی چادروں سے ایک خاص قاعدے کے مطابق ایک عظیم القدر جہاز بنا لیں تو وہ سینۂ بحر پر بط کی طرح تیرتا چلا جائے گا ۔ اور اس میں اگر ہزار آدمی بھی سوار کر لیں تو بھی وہ نہیں ڈوبے گا ۔ (بشرطیکہ یہ وزن اس حد کے اندر ہو جسے وہ قاعدے کے مطابق اٹھا سکتا ہے) ۔

آپ جہاز کو سمندر میں کس اطمینان سے چلاتے رہتے ہیں ۔ اور کس اطمینان سے اس میں سوار ہو جاتے ہیں ۔ یہ اطمینان کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

اس ''ایمان'' سے کہ یہ جو قانون خداوندی ہے کہ اتنی جسامت کا جہاز اگر پانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قدر وزن لیے کر تیرتا رہیگا ، یہ قانون کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس قانون پر پورا پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے ۔ اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔ یہ راستے میں دھوکا نہیں دے گا۔ یہ آسرا ٹوٹے گا نہیں ۔ یہ سہارا دغا نہیں دے گا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں ۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی جاری و ساری ہیں جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے جو قانون خدا نے عطا کیا ہے (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اس کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔ اگر تم اس کے مطابق چلوگے تو جس نتیجہ کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ یقیناً برآمد ہوکر رہے گا ۔ اس کا نام تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰہِ ہے ۔ اور انہی معنوں میں خدا اَلْوَكِيْلُ ہے ۔ یعنی جس کے قانون پر پورا پورا بھروسہ کیا جائے ۔ عزم (کسی کام کے کرنے کا محکم ارادہ) اس توکل کی لازمی شرط ہے (۳/۱۵۸) ۔ جماعت مومنین وہ ہے جو اپنے عزم و ارادہ کے ساتھ قانون خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرے ۔ انہی کو مُتَوَكِّلِيْنَ کہا گیا ہے (۳/۱۵۸)۔ جو اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون پر بھروسہ کرے وہ مشرک ہے ۔ (۱۶/۹۹-۱۰۰) ۔

وَكَّلَ کے معنے ہیں معاملہ کسی کے سپرد کر دینا (۶/۹۰) ۔ سورۃ سجدہ میں ہے وُكِّلَ بِكُمْ (۳۲/۱۱) ۔ جس کے تم سپرد کئے گئے ہو ۔

## و ل ت

اَلْوَلْتُ ۔ کے معنے ہیں نقصان اور کم کرنا ۔ وَلَتَہٗ حَقَّہٗ یَلِتُہٗ ۔ اَوْلَتَہٗ اس نے اس کا حق کم کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَلِتْكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ (۴۹/۱۴) ۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم کرکے نہیں دے گا ۔ سورۃ طور میں ہے مَا اَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ (۵۲/۲۱)۔ ان کے اعمال سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے ۔

(اسے ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے) ۔

## و ل ج

وَلَجَ ۔ یَلِجُ ۔ داخل ہونا** ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُلُوْجُ کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں*** ۔ اور بعض کے نزدیک اس

---

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

کے معنی آہستہ آہستہ داخل ہونے کے ہیں * ۔ اَلْوَلِیْجَۃُ ۔ (واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) ۔ دلی دوست ۔ مخلص دوست ۔ وہ شخص جو تمہارے خاندان سے تو نہ ہو لیکن تم اسے بہت ہی قابل اعتماد سمجھو (تمہارے اندر گھسا ہوا) رازدار (۹/۱۶)۔ سورۃ سبا میں وَلَجَ کے بمقابلہ خَرَجَ آیا ہے (۳۴/۲) ۔ دیگر مقامات پر ہے یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ (۳/۲۹ و ۳/۲۶) ۔ اس میں یُوْلِجُ کے بجائے تُوْلِجُ ہے)۔ وہ رات کو دن کے اندر داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات کے اندر ۔

# و ل د

اَلْوَلَدُ ۔ جسے کسی نے جنا ہو ۔ (مذکر ۔ مونث ۔ واحد ، تثنیہ ، جمع ۔ سب کے لئے یہ لفظ آتا ہے ۔ نیز جمع کے لئے اَوْلَادٌ ۔ وِلْدَۃٌ ۔ اور وُلْدٌ بھی مستعمل ہیں)**۔ لیکن یہ لفظ بچہ کے لئے اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب وہ ابھی رحم مادر میں ہو***۔ اَلْوَلِیْدُ۔ جب تک بچہ چھوٹا رہے ، نیز غلام یا ملازم (جمع وِلْدَانٌ) ۔ اَلْوَالِدُ ۔ باپ ۔ اَلْوَالِدَۃُ ۔ ماں ۔ اَلْوَالِدَانِ ۔ ماں باپ ۔مَوْلِدٌ ۔ ولادت کا مقام اور وقت ۔ مِیْلَادٌ۔ ولادت کا وقت** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلتَّوَالُدُ کے معنی ہیں بغیر ماں باپ کے کسی جاندار کا وجود پذیر ہو جانا جیسے گرمی کے موسم میں بند پانی میں جراثیم (یا اور ذی حیات) پیدا ہو جاتے ہیں***۔ (یہ غالباً اس زمانے کی اصطلاح ہے جب جراثیم کے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچی تھیں ورنہ یہ جراثیم بھی بغیر ''ماں باپ'' کے پیدا نہیں ہوتے ۔ اگرچہ ان کی پیدائش کا طریقِ عمل تَوْلِیْد سے مختلف ہوتا ہے) ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق متعدد مقامات پر ہے کہ اس کا وَلَدٌ نہیں (۴/۱۷۱) ۔ اس سے صرف عیسائیوں کے اس عقیدہ ہی کی تردید مقصود نہیں جس کی رُو سے وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں ۔ اس سے مقصود یہ کہنا بھی ہے کہ خدا نے کائنات کو تَوْلِیْدٌ کے سلسلہ سے پیدا نہیں کیا (جس طرح ماں باپ کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے) بلکہ اس نے اسے تخلیقاً پیدا کیا ۔ تولید (Pro - creation) میں ، پیدا کرنے والے (وَالِدٌ) کا ایک جزو ، مَوْلُوْدٌ (جو جنا گیا ہو اس) میں شامل ہوتا ہے ۔ اور والد میں اتنے حصے کی کمی آ جاتی ہے ۔ لیکن تخلیق (Creation) میں پیدا کرنے والے (خالق) کی ذات کا کوئی جزو اس کی مخلوق میں نہیں آتا ۔ اس لئے عمل

*غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

تخلیق سے اس کی ذات میں کوئی کمی (Deficiency) واقع نہیں ہوتی ۔ خدا خالق ہے اور وہ انسانوں سے بھی تخلیق چاہتا ہے ۔ باقی رہا عملِ تولید ، سو یہ ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں ۔ آدمی ، انسانیت کی سطح پر عملِ تخلیق سے آتا ہے اور صرف تولید (اولاد پیدا کرنے) سے وہ حیوانی سطح پر رہتا ہے (اگرچہ افزائشِ نسل کے لئے یہ بھی ضروری ہے ۔ جس طرح تحفظ خویش کے لئے کھانا ، پینا ضروری ہے) ۔ لہذا ، انسان کو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نے "تخلیق" کس قدر کی ہے ۔ نہ یہ کہ اس نے "تولید" کتنی کی ہے ۔ کتنے بچے پیدا کئے ہیں ۔ تخلیق ، فریضہٗ انسانیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کے علاوہ اور خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے ۔ وہ خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ($\frac{۲۳}{۱۴}$) کہہ کر پکارتا ہے ۔ یعنی تمام خالقین میں سب سے بہتر خالق ۔ وہ جس کی تخلیق حسن کی انتہائی شکل لئے ہو ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْوَلَدُ کا استعمال بیٹے اور بیٹے کے بیٹے (وَلَدُ الْوَلَدِ ۔ یعنی پوتے) سب کے لئے ہوتا ہے (لیکن اَلْمَوْلُوْدُ صرف اسے کہینگے جو براہ راست کسی کا بیٹا ہو) ۔ قرآن کریم نے احکامِ وراثت کے ضمن میں کہا ہے یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ ($\frac{۴}{۱۱}$) ۔ اَوْلَادٌ ۔ وَلَدٌ کی جمع ہے ۔ لہذا اس سے مراد صرف اپنے بیٹے اور بیٹیاں ہی نہیں بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں ۔ اگر کسی متوفی کا بیٹا زندہ ہے تو وہ اس کا وَلَدٌ ہوگا ۔ اور اگر بیٹا پہلے مر چکا ہے لیکن اس کا پوتا (بیٹے کا بیٹا) زندہ ہے تو وہ بھی اس کا وَلَدٌ ہوگا اور وہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا ۔ اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی اَوْلَادٌ میں شامل ہوگی ۔ اسی طرح والدین سے مراد صرف ماں باپ نہیں ہونگے بلکہ یہ سلسلہ اوپر تک چلا جائیگا ۔ یعنی دادا ۔ نانی وغیرہ ۔

سورۃ بقرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں ۔ اس کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آرہا ہے ۔ اس ضمن میں کہا کہ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ ($\frac{۲}{۲۳۳}$) ۔ مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں کے کھانے پینے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مَوْلُوْدٌ لَہٗ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ یعنی وہ جس کے لئے اس عورت نے بچہ جنا تھا ۔ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو یہ الفاظ اس کے لئے ہونگے ۔ اگر وہ نہیں تو اس کی جگہ جو اس کا (مذکر) وارث ہوگا یہ الفاظ اس کی طرف رجوع کر جائیں گے ۔

# و ل ی

الوَلْیُ - کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا - ابن فارس نے بھی یہی اس مادہ کے بنیادی معنی بتائے ہیں - دَارٌ وَلِیَۃٌ - قریب گھر*- قریب ہونے کے اعتبار سے اَلْوَلْیُ کے معنی ہوتے ہیں دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بغیر فصل (ساتھ ہی) ہونا**- راغب نے کہا ہے کہ الوَلَاءُ والتَوَالِیْ کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اسطرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، اور اس جہت سے استعارۃ یہ قرب کے لئے استعمال ہوتا ہے***- وُلِیَتِ الاَرْضُ - زمین پر موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد بارش برسی - اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی کے معنے ہیں خرابی اور تباہی تمہارے قریب پہنچ چکی ہے یا ساتھ ہی لگی ہوئی ہے - یہ زجرو وعید اور توبیخ کے موقع پر استعمال ہوتا ہے - ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے - ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کلمہ ہاتھ سے نکل جانے والے فائدے پر افسوس دلانے کے لئے بولا جاتا ہے - هُوَ اَوْلٰی بِکَذَا - وہ اس کا زیادہ حق دار ہے، زیادہ لائق و مستحق ہے* (۳۳/۶) -

قرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مدد گار کو کہتے ہیں - اَلْمُوَالَاۃُ - ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرنا - معاہدہ کرنا - ایک دوسرے کے قریب ہونا - لگاتار و مسلسل آنا - نیز اس کے معنے دو لڑنے جھگڑنے والوں کے درمیان صلح و صفائی کے لئے دخل اندازی کرنا بھی ہیں - لیکن اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ قدرت میں لے لینا - اور اِسْتَوْلٰی عَلَی الاَمْرِ - کسی معاملہ پر غالب آجانا *- اسی لئے الوِلَایَۃُ - سلطنت اور حکومت کو کہتے ہیں**- اور وَالِی - نگران و ناظم اور حاکم کو - اَوْلَیْتُہُ الاَمْرَ - میں نے اسے معاملہ کا ناظم و نگران بنا دیا - الوَلِیُّ بھی نگران و ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں *- تَوَلَّاہُ (۲۲/۴) - اسکو ولی بنا لیا - تَوَلَّی الاَمْرَ - اس نے معاملہ کی ذمہ داری اٹھا لی -

وَلّٰی کے متضاد معنی آتے ہیں - کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور کسی سے اعراض کرنا بھی - وَلّٰی هَارِباً - پیٹھ موڑ کر بھاگا - اور فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے معنی ہیں تو مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کر - تَوَلّٰی عَنْہُ - اس سے اعراض کیا *- تَوَلَّاہُ کے معنی اسکی پیروی کرنا اور اسے اختیار کرنا بھی ہیں *- (۱۶/۱۰۰)

---

* تاج - ** محیط - *** راغب -

قرآن مجید میں یہ مادہ ان تمام مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کسی کی طرف رخ کرنا (۲/۱۱۵) اور رو گردانی کرنا (۲/۱۴۲)۔ حاکم بن جاتا (۲/۲۰۵)۔ وَلَایَۃٌ بمعنی غلبہ و اقتدار (۱۸/۴۵)۔ وَلِیٌّ۔ مدد گار۔ حمایتی (۱۷/۱۱۱) وَلِیٌّ بمعنی وارث (۱۷/۳۳ ; ۱۹/۵)۔ المَوَالِیْ (دور کے) رشتہ دار (۱۹/۵ ; ۴/۳۳)۔

ایک راہ تو یہ ہے کہ انسان جس نظریہ یا تصور کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے (اسے ایمان کہتے ہیں) اس کے سامنے بطیب خاطر جھک جائے اور اس کی پوری پوری اطاعت کرے۔ (اسے اسلام کہتے ہیں)۔ لیکن دوسری راہ یہ ہے کہ انسان اس سے گریز کی راہیں تلاش کرے۔ یہ اعراض ہے۔ اس کو تَوَلِّیْ کہتے ہیں۔ چنانچہ (۲/۱۳۷) میں یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور (۳/۱۹) میں اَسْلَمَ کے مقابلہ میں (نیز ۱۶/۸۱-۸۲ میں)۔ اور (۴/۸۰) میں یہ لفظ اِطَاعَتٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ لہذا تَوَلِّیْ کے معنی یہی نہیں کہ انسان ایک مذہب (یا نظام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب یا (نظام) اختیار کر لے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اسکی پوری پوری اطاعت نہ کرے بلکہ گریز کی راہیں نکالتا رہے۔ اسی لئے تَوَلّٰی بمقابلہ صَلّٰی آیا ہے (۷۵/۳۱-۳۲)۔ صلّٰی کے معنی پوری اطاعت کرنا۔ کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہیں۔ صلّٰی کے مقابل میں تَوَلّٰی کی عام صورت یہ ہے کہ خدا کے دئے ہوئے دین (یا نظام اطاعت) کی جگہ انسان کی خود ساختہ شریعت کو دین قرار دیدیا جائے اور اسکی اتباع کو دین کی اطاعت بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے خدا اور انسان کا تعلق اس قسم کا قرار دیا ہے جسے ہم عام الفاظ میں رفاقت کا تعلق کہتے ہیں۔ اگر انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو خدا خود اسکا رفیق (ولی) بن جاتا ہے۔ اور اس کے قانون کے حیات بخش نتائج اس کے شامل حال ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ان قوانین کی اطاعت سے انسان کے ہاتھوں خدا کے کائناتی پروگرام کی تکمیل ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے)۔ اسطرح انسان خدا کا وَلِیٌّ بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک طرف خدا کو مومنین کا ولی کہا ہے (۲/۲۵۷)۔ اور دوسری طرف مومنین کو اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کہا ہے (۱۰/۶۲)۔ اَوْلِیَاء وَلِیٌّ کی جمع ہے۔ یاد رہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کا کوئی خاص گروہ نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ہر مومن وَلِیُّ اللّٰہِ ہے اور تمام مومنین اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ ہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ وہ ہیں اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳)۔ جو لوگ قرآن کریم

پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی "پہچان" یہ بتا دی کہ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (۱۰/۶۴)۔ انہیں اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ آخرت کی زندگی کو تو یہاں دیکھا نہیں جا سکتا لیکن یہاں کی زندگی تو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے۔ لہذا اَوْلِيَاءُ اللّٰهِ (جماعت مومنین) وہ ہیں جنہیں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں اور وہ دنیا میں نظام خداوندی کو قائم کریں (کیونکہ دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں صرف اسی نظام کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں)۔ انہی کو قرآن کریم نے حِزْبُ اللّٰهِ (۵/۵۶) کہا ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں غیر خدائی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کو حِزْبُ الشَّيْطَانِ (۵۸/۱۹)۔ اس تصور کے علاوہ اَوْلِيَاءُ اللّٰهِ کا جو تصور بھی ہے وہ غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا ہوا۔

سورہ محمد میں سلسلہ کلام یوں چلا آرہا ہے کہ تم اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کرو اور دیکھو کہ جن لوگوں نے وحی کے بتائے ہوئے راستے سے سرکشی برتی ان کا انجام کیا ہوا۔ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام دور حاضر کے مخالفین کا بھی ہوگا۔ اس کے بعد ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷/۱۱)۔ "یہ اس لئے کہ جو لوگ وحی کے بتائے ہوئے راستے پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مولیٰ (دوست۔ رفیق۔ کارساز) اللہ ہے۔ اور جو اس راستے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہو سکتا"۔ یعنی جو شخص یا قوم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے اسے اسکی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں اللہ کے سوا کوئی کسی کا مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جماعت مومنین کا اعلان ہوتا ہے کہ اَنْتَ مَوْلٰنَا (۲/۲۸۶)۔ "تو ہمارا مولیٰ ہے"۔ لیکن اس کے ساتھ سورہ تحریم میں (نبی اکرم کے سلسلہ میں) فرمایا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۶/۴)۔ "اس کا مولیٰ اللہ ہے۔ اور جبریل۔ اور صالح مومنین ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس مفہوم میں اللہ مولیٰ ہو سکتا ہے اس میں اللہ کے سوا کوئی اور مولیٰ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اللہ۔ جبریل۔ اور مومنین کی "مولائیت" کی نوعیت الگ الگ ہے۔ انہیں ایک سطح کا مولیٰ سمجھنا غلط ہے۔ قوانین خداوندی کے خلاف کسی کی مولائیت کام نہیں آسکتی۔ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (۴۴/۴۱)۔ "جسدن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکیگا" اس پر شاھد ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیت کو بتاکید دھرایا ، اور بار بار دھرایا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے اولیاء ہو سکتے ہیں اور مومن کسی غیر مومن ( کافر) کا ولی نہیں ہو سکتا ۔ بات بالکل واضح ہے ۔ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست رفیق ، همراز ، هم نوا وهی هو سکتے هیں جن کی منزل مقصود اوراس تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو ۔ جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ہوں ، وہ ایک دوسرے کے دمساز اور همراز کیسے هو سکتے هیں ؟ غیر مومنین سے اچھے کاموں میں تعاون کیا جا سکتا ہے ۔ انہیں اپنا همراز اور دمساز نہیں بنایا جا سکتا (اس ضمن میں حسب ذیل آیات دیکھئے۔ ( ۳/۲۷ - ۳/۱۱۷ - ۴/۸۹ - ۴/۱۳۹ - ۴/۱۴۴ - ۵/۵۱-۵۵ - ۸/۷۳ - ۹/۱۰-۱۶-۲۳-۲۷ - ۴۷/۱۲-۱۳ - ۵۸/۲۲ - ۶۰/۱-۴ ) -

## و ن ی

اَلْوَنیٰ ۔ تکان ۔ درماندگی ۔ وَنیٰ ۔ یَنِیْ ۔ وَنْیًا ۔ سستی کرنا ۔ تھک جانا ، کمزور اور ضعیف ہو جانا ۔ نَاقَۃٌ وَانِیَۃٌ ۔ تھکی ہوئی اونٹنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کمزوری اور ضعف بتائے ہیں ۔

اَلْمِیْنَا وَ الْمِیْنَاءُ ۔ بندرگاہ ، جہاں پہنچ کر جہاز دم لیتے ہیں ۔ نیز اَلْمِیْنَا ( بغیر همزه کے ) ان پتھر کے ٹکڑوں کو بھی کہتے ہیں جس سے کانچ بنایا جاتا ہے* ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ ۔ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ (۲۰/۴۲) ۔ اور دیکھو اس کشمکش میں ضابطہٗ خداوندی کو آگے بڑھانے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا ۔ اس مقصد کے لئے تمہاری تگ و تاز میں ذرا بھی کمی نہ آنے پائے ۔

## و ہ ب

وَهَبَ يَهَبُ وَهْبًا ۔ هِبَۃٌ ۔ عطا کرنا ۔ دینا ۔ اَلْهِبَۃُ ۔ وہ عطیہ جو نہ کسی چیز کے عوض دیا گیا ہو نہ ہی اس میں دینے والے کی اپنی غرض وابستہ ہو ۔ اَلْمَوْهِبَۃُ ۔ وہ بادل جو جہاں واقع ہو وہاں ہی برس جائے ۔ اَوْهَبْتُ لِاَمْرِ كَذَا ۔ میں فلاں امر پر قادر ہو گیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ بغیر قیاس کے آئے ہیں ۔

سورۃ احزاب میں ہے اِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا (۳۳/۵۰) ۔ اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے حوالے کردے ۔ سورۃ مریم میں ہے قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹/۱۹) ۔ اس نے کہا کہ میں تیرے

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

رب کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ "میں (خدا) تجھے ایک پاکیزہ اورنشوونما یافتہ بچہ عطا کروں گا"۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا۔ ۔ ۔ (۲۶/۲۱) ۔ اللہ نے مجھے قوت فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی ۔ نبوت ایک ایسا علم ہے جو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے ۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ ہے (۳/۸) ۔ یعنی بلا مزد و معاوضہ بہت زیادہ عطا کرنے والا ۔ سورۃ صؔ میں یہ لفظ واپس دینے کے معنوں میں بھی آیا ہے وَ وَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ ۔ ۔ ۔ (۳۸/۴۳)۔ مطلب عطا کرنے سے ہی ہے ۔ کھوئے ہوؤں کا واپس مل جانا بھی تو عطا ہے ۔

## و ہ ج

وَهَجَتِ النَّارُ ۔ وَهْجًا ۔ آگ کا روشن ہونا ، جلنا اور بھڑکنا ۔ اَلْوَهَجُ ۔ آفتاب اور آگ کی حرارت ۔ تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ ۔ جوہر چمک اٹھا* ۔

قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (۷۸/۱۳) ۔ ہم نے (سورج کو) چراغ بنایا جو بافراط روشنی اور حرارت دینے والا ہے ۔

## و ہ ن

اَلْوَهْنُ ۔ کسی کام یا معاملہ میں یا جسمانی طور پر کمزور ہونا ۔ لیث نے کہا ہے کہ وَاهِنٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو کام اور معاملہ میں کمزور ہو ۔ اور مَوْهُوْنٌ ۔ اُسے جو بدنی لحاظ سے کمزور ہو**۔ سورۃ آل عمران میں وَهْنٌ کے ساتھ ضعف اور استکانت کے الفاظ آئے ہیں (۳/۱۴۵) ۔ اس سے اس کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وَهَنَ ۔ کمزور و ضعیف ہوا ۔ اَوْهَنَ کمزور اور ضعیف بنایا۔ سورۃ انفال میں ہے أَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ (۸/۱۸) ۔ اللہ مخالفین، کفار کے منصوبوں کو کمزور (ناکام) بنا دیگا ۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے وَلَا تَهِنُوْا (۳/۱۳۸) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میں کسی قسم کی بھی کمزوری نہیں ہونی چاہئے ۔ نہ جسمانی کمزوری (جس میں مادی اسباب بھی شامل ہیں ) اور نہ ہی عقل و فکر اور علم و بصیرت کی کمزوری، کیونکہ قرآن کریم نے قیادت کے لئے جسمانی اور علمی دونوں صلاحیتوں کو ضروری قرار دیا ہے (۲/۲۴۷) ۔ نہ ہی سیرت و کردار میں کسی قسم کی کمزوری۔ اس طرح ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸) ۔ تم سب سے بلند ہو جاؤ گے ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

# و ھ ی

اَلْوَھْیُ - کسی چیز میں شگاف ھونا - کسی چیز کی بندشوں کا ڈھیلا پڑ جانا - اَوْھَاہُ - اس نے اسے کمزور کر دیا - اَلْحَائِطُ یَھِیْ* - دیوار گرا چاھتی ھے - رَجُلٌ وَاہٍ - بودا - کمزور - احمق آدمی - ناقابل اعتماد - حَدِیْثٌ وَاہٍ - نہایت بودی بات* -

قرآن کریم میں ھے وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَھِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاھِیَۃٌ ($\frac{69}{16}$) - آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن اس کی بندشیں ڈھیلی پڑجائینگی -

# وَیْ (حرف)

وَیْ - تعجب و افسوس یا زجر و توبیخ یا پشیمانی اور تعجب کے لئے آتا ھے**- قرآن کریم میں وَیْکَاَنَّ آیا ھے ($\frac{28}{82}$) - (وَیْ + کَ + اَنَّ یا وَیْ + کَاَنَّ) - ھائے افسوس - یا جیسے ھم کہتے ھیں کہ ''ارے! ھم تو کچھ اور سمجھ رھے تھے اور معاملہ یوں نکلا!''

# و ی ل

وَیْلٌ - شر کا نازل ھونا- یہ مصدر جامد ھے جس کا کوئی فعل نہیں***- اظہار درد و کرب کے موقع پر، نیز عذاب و تکلیف اور بد انجامی کے لئے یہ کلمہ استعمال ھوتا ھے- اَلْوَیْلَۃُ - رسوائی - تباھی - بربادی- ھلاکت*** -

تباھی اور بربادی کے معنوں میں وَیْلٌ ($\frac{104}{1}$) میں آیا ھے - حسرت اور افسوس کے لئے وَیْلَکَ ($\frac{46}{17}$) میں - اور شرم اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے لئے یٰوَیْلَتٰی ($\frac{11}{72}$) میں -

---

*تاج و راغب - **تاج و راغب و محیط - ***تاج -

# ھ

## ہٗ (ضمیر)

ہٗ ۔ یہ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے ۔ واحد مذکر غائب کے لئے آتی ہے ۔

منصوب متصل کی مثال ۔ یَنْصُرُوْنَہٗ (۲۸/۸۱) ۔ "(جو) اس کی مدد کرے" ۔ مجرور متصل کی مثال ۔ مَکَانَہٗ (۲۸/۸۲) ۔ "اسکی جگہ" ۔

[یہ ضمیر کبھی ہِ اورہٖ بھی پڑھی جاتی ہے مثلاً فِیْہِ ۔ بِہٖ ۔ اورکبھی یہ ساکن ہوکر محض وقف کے لئے بڑھا دی جاتی ہے مثلاً مَاھِیَہْ ۔ اور کِتَابِیَہْ] ۔

## ھَا (ضمیر)

ھا ۔ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے ۔ واحد مؤنث غائب کے لئے آتی ہے ۔ منصوب متصل کی مثال ۔ اِنَّھَا (۳/۲۱) ۔

مجرور متصل کی مثال ۔ لَوْنُھَا (۲/۶۹) ۔

## ھَا

ھَا ۔ خُذْ (پکڑو ۔ لو) کے معنے میں آتا ہے ۔ ھَاؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ (۶۹/۱۹) لو ۔ میری کتاب پڑھو ۔ (اس میں جمع کے لئے اُمْ بڑھایا گیا ہے) ھَا ۔ تنبیہ کے لئے بھی آتا ہے ۔ ھَا اَنْتُمْ اُوْلَاءِ ۔ ھاں تم وہی تو ہو ۔

جب ھَا، اَیٌّ کے بعد آئے تو ندا (پکارنے) کے لئے آتا ہے ۔ جیسے اَیُّھَا الرَّجُلُ ۔ اے مرد ! اکثر اَیُّھَا سے پہلے یَا بڑھا کر یَا اَیُّھَا بولا جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ (۴/۱) اے لوگو !

[ھٰکَذَا کے لئے دیکھئے عنوان ھٰذَا] ۔

# ھٰـؤُلَاءِ

ھٰـؤُ لَاءِ ۔ (ھَا + اُولَاءِ) ھٰـذَا اور ھٰذِہٖ دونوں کی جمع ہے ۔ ''یہ سب'' (مذکر و مؤنث)۔ مذکر کے لئے ھٰـاَنْتُمْ ھٰـؤُلَاءِ (۳/۶۵) ۔ خبردار تم ہی وہ لوگ ہو۔ مؤنث کے لئے ھٰـؤُلَاءِ بَنَاتِیْ (۱۱/۷۸) یہ سب میری بیٹیاں ہیں ۔

# ھَاؤُمُ

دیکھئے عنوان ھَـا ۔

# ھٰـذَا

ھٰـذَا ۔ (اسم اشارہ۔ واحد مذکر) ''یہ''۔ ھٰـذَانِ ھٰـذَیْنِ (مذکر۔ تثنیہ) ''یہ دونوں'' ۔ ھٰـذِہٖ (واحد مؤنث) ۔ ''یہ'' ۔ ھَاتَانِ ھَاتَیْنِ ۔ (تثنیہ مؤنث) ''یہ دونوں''۔ (ھٰـؤُلَاءِ ۔ جمع کے لئے آتا ہے) ۔ ''یہ سب''۔ ھٰکَـذَا ۔ (ھَا + کَ + ذَا) ۔ '' اسی طرح ایسا ہی'' ۔ اَھٰکَـذَا عَرْشُکِ (۲۷/۴۲) ۔ کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا؟

# ھَارُوْتُ

اَلْھَرْتُ ۔ نیزہ گھونپنا ۔ کپڑے کو پھاڑنا اور چندی چندی کرنا ۔

اَلْھَرَتُ ۔ منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا ۔ اَلْھَرِیْتُ ۔ وہ شخص جس کی باچھیں وسیع ہوں ۔ رَجُلٌ ھَرِیْتٌ ۔ وہ آدمی جو فحش گوئی کے ساتھ کسی راز کو پوشیدہ نہ رکھے* ۔

ھَارُوْتُ ۔ افسانہ طرازوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو طرح طرح کی چیستانیں مشہور کر رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بابل میں دو فرشتے تھے ۔ ھاروت اور ماروت ۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ قرآن کریم نے ان مزخرفات کی تردید کردی (۲/۱۰۲) ۔ یہ عجمی لفظ ہے ۔

(ماروت اور بابل کے عنوانات بھی دیکھئے) ۔

*تاج ۔

# ھَارُوْنُ

ھَارُوْنُ - یہ عجمی نام ھے - حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام تھا - عربی میں اَلْھَیْرُوْنُ - عمدہ قسم کی کھجور کو کہتے ھیں* -

بعض لوگ اپنے اس ( غلط ) عقیدہ کی دلیل میں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتے ھیں ، حضرت ھارونؑ کی مثال پیش کرتے ھیں اور کہتے ھیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب ملی تھی اور حضرت ھارونؑ ان کے ساتھ بغیر کتاب کے تھے - قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ھے کہ کتاب ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ دونوں کو ملی تھی - وَ آتَیْنٰھُمَا الْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ( ۳۷/۱۱۷ )- ''اور ھم نے دونوں کو واضح کتاب دی'' -

[مزید تفصیل کے لئے ( ن - ب - أ ) کا عنوان دیکھئے] -

# ھَامَان

قرآن کریم میں ھے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون ، ھامان اور قارون کیطرف بھیجا تھا (۴۰/۲۴) - اور یہ تینوں ھلاک ھونیوالوں میں سے تھے(۲۹/۳۹) -

تاریخ انسانیت کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے - ھر جگہ بادشاھت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید ، '' پیشوائیت ،، ( Priesthood ) کا تسلط نظر آئیگا - بادشاہ تو خیر بادشاھی کرتا تھا ، برھمن ( مذھبی پیشوا ) خدائی کرتا تھا - ایسی خدائی جس میں ، سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اسکی رعایا میں سے ھوتا تھا - مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا ) سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا - اس مندر کا بڑا پجاری ، شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز ھوتا تھا - ڈاکٹر سٹینڈروف ، اپنی کتاب '' قدیم مصریوں کا مذھب ،، میں لکھتا ھے -

،،آمن دیوتا کے سردار کاھن کو نبی اول کہتے تھے - وہ محکمہ تعمیرات** کا بھی افسر تھا - مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا - یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا - خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا - نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور

*تاج - ** غالباً مذھبی عمارات مراد ھیں-

مغربی مصر کے تمام مندروں کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا ۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے مندر کے قبضہ میں تمام مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا،، ۔ یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاھن (Head Priest) کی وجاھت ۔ یہی آمن، قرآن کا ھامان ھے [ جیسے تغیر لفظی سے آرون (Aoron) ھارون ھو گیا ] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں ( مصر کے عنوان کے تحت) مذکور ھے کہ

> فراعنۂ مصر کے اٹھارھویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اھمیت اختیار کر لی تھی ۔ اس خاندان کے زمانہ میں آمن رع ( واقع تھیبس) کے کاھن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ھو چکے تھے جنکی وجہ سے وہ بے حساب دولت اور قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا ۔

ڈاکٹر (Breasted) نے بھی اپنی کتاب ،، تاریخ مصر،، میں لکھا ھے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ھوتا تھا ۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ھے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ ھامان کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا (۲۸/۶) ۔ اور فرعون نے ھامان ( محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظام ،، روحانیت ،، کے سب سے بڑے رکن ) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند عمارت یا برجی تعمیر کر دی جائے جس پر چڑھکر وہ ( معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ کے خدا کو جھانک لے (۴۰/۳۶)۔

حقیقت یہ ھے کہ آسمانی انقلاب کی آواز جب بھی اٹھی ھے اس کے مقابلہ کے لئے ملوکیت کبھی براہ راست سامنے نہیں آئی وہ ھمیشہ ،، پیشوائیت،، کو آگے بڑھاتی ھے اور خود اسکی سپر میں محفوظ رھتی ھے ۔ یہی فرعون نے کیا ۔ خود پیچھے رھا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے ھامان اور اس کے ساحرین کو آگے بڑھایا ۔ لیکن عصائے موسیٰؑ نے ان سب کی دسیسہ کاریوں کو نیست و نابود کر دیا ۔ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ (۷/۱۱۷)۔

ملوکیت ۔ پیشوائیت ۔ اور سرمایہ داری ، تینوں بلائیں انسانیت کے لئے ھلاکت آفریں ھیں ۔ قرآن کریم نے ، داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ان تینوں بلاؤں کا ذکر شرح و بسط سے کیا ھے ۔ فرعون ، استبداد ملوکیت کا مجسمہ ۔ ھارون، پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ ۔ اور قارون، سرمایہ داری

کی خون آشامیوں کا پیکر ۔ آسمانی انقلاب ، انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے ۔ اس کا علاج قرآنی نظام حکومت و معیشت میں ہے جس میں نہ کوئی کسی انسان کا بندہ اور غلام ہوتا ہے نہ محکوم اور محتاج ۔

# ھ ب ط

هُبُوْطٌ ۔ اترنا ۔ راغب نے اس کے معنے دب کر مجبوراً اترنا لکھے ہیں***۔ هَبَطَ اَرْضَ کَذَا ۔ وہ فلاں زمین میں اترا*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ کے معنی ہیں وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو گیا** ۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے اهْبِطُوْا مِصْرًا ۔ (۲/۶۱) ۔ جس کے معانی ہیں تم اس بیابانی زندگی سے کسی شہر کی طرف منتقل ہو جاؤ ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب لفظ هُبُوْطٌ انسان کے لئے بولا جائے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے ۔ بخلاف اِنْزَالٌ کے کہ اسے اللہ تعالٰی نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے***۔ هَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَهٗ کے معنی ہیں بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا ۔ اسے لاغر کر دیا ۔ اَلْهَبْطَةُ ۔ نشیبی زمین کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْهَبْطُ کے معنی نقصان کے ہیں ، نیز یہ لفظ ذلت ، عاجزی اور شر میں پڑ جانے کے لئے بھی آتا ہے ۔ اَلْهَبِيْطُ ۔ لاغر اونٹ کو کہتے ہیں *۔ (ابن فارس) ۔

لہذا هُبُوْطٌ کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی جب کہ دوسری حالت میں پہلی حالت کے مقابلہ میں کچھ کمی ہو ۔ قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ اگر انسان وحی کی راہ نمائی میں امۃ واحدہ بنکر رہیں تو یہ زندگی شرف انسانیت کی زندگی ہے لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو یہ اُس مقام سے پستی کی طرف تبدیلی ( ھبوط ) ہے ۔ فَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) ۔ ،، ہم نے کہا کہ تم (اس) مقام بلند سے پستی کی طرف جاؤ ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے ،، ۔ اس هُبُوْطٌ سے ، بلند مقام آدمیت کیطرف تبدیلی اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں (۲/۳۸) ۔ تفصیل ان امور کی (ا ۔ د ۔ م ) اور ( ش ۔ ج ۔ ر ) کے عنوانات میں ملیگی ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

## ھ ب و

اَلْھَبَاءُ ۔ غبار ۔ بہت باریک غبار جو فضا میں بالکل دھوئیں جیسا نظر آئے ۔ یا وہ باریک غبار کہ جب کسی تاریک کوٹھڑی میں ، روشندان سے دھوپ کی کوئی کرن آرھی ھو تو اس میں جو چھوٹے چھوٹے ذرے نظر آتے ھیں ۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والے غبار کو بھی کہتے ھیں ۔*
اَلْھَبْوَۃُ ۔ غبار ۔ ھَبَا الغُبَارُ ۔ گرد اڑی*۔

جَاءَ یَتَھَبّٰی کے معنی ھوتے ھیں وہ خالی ھاتھ ، خاک اڑاتا ھوا آیا ۔
اَلْھَابِیُ ۔ قبر میں گرنے والی مٹی کو کہتے ھیں *۔

قرآن کریم میں ھے کہ مکافات عمل کی میزان میں مجرمین کے اعمال بالکل بے وزن ھونگے ۔ ان کا کوئی منفعت بخش نتیجہ مرتب نہیں ھوگا ۔ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ۔ پھر ھم اسے خاک پراگندہ کی طرح کر دینگے ۔

## ھ ج د

اَلْھُجُوْدُ ۔ اَلتَّھَجُّدُ ۔ سونے اور جاگنے دونوں کے لئے آتا ھے ** ۔ (اضداد میں سے ھے ۔ لطائف اللغۃ) ۔ راغب نے کہا ھے کہ اَلْھَاجِدُ سونے والے کو کہتے ھیں ۔ لیکن ھَجَّدْتُہٗ فَتَھَجَّدَ کے معنی ھیں "میں نے اسکی نیند کو دور کر دیا ۔ پس وہ جاگ گیا" ۔ (جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنی ھوتے ھیں میں نے اس کے مرض کو دور کیا ۔ یا تیمارداری کی) ***۔

قرآن کریم میں ھے وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ (۱۷/۷۹) ۔ رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کے ساتھ) جاگو ۔ یہ وھی چیز ھے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ھے کہ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۷۳/۲) ۔ "رات کو قیام کر مگر تھوڑے حصے کو چھوڑ کر" ۔ قرآنی انقلاب کے اولین مراحل میں پروگرام اسقدر طویل اور سخت ھوتا ھے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ ، راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ھے ۔

صاحب محیط نے لکھا ھے کہ ھُجُوْدٌ دن میں سونے کو کہتے ھیں اور ھُجُوْعٌ رات میں سونے کو****۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی مقام پر ٹھہرنے کے ھیں ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****محیط ۔

# ھ ج ر

اَلْھَجْرُ ۔ اَلْھِجْرَانُ ۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا ۔ ترک کر دینا ۔ الگ ھو جانا ۔ کاٹ دینا ۔ جدا کردینا ۔ قطع تعلق کر لینا ۔ نیز اعراض برتنا ۔ راغب نے اس کے معنے دوسرے سے جدا ھونے کے بتائے ھیں خواہ یہ جدائی زبانی ھو یا قلبی یا بدنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (١) قطع و جدائی اور (٢) کسی کو باندھنا بتائے ھیں۔ قرآن کریم میں ھے ۔ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا (٧٣/١٠) ۔ نہایت خوبصورتی سے ان سے الگ ھٹ کر (اپنی جماعت کی تنظیم میں مشغول ھوجا) ۔ یعنی فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (١٥/٨٥)۔

ھَاجِرَاتٌ ۔ بری باتیں ۔ فحش باتیں ۔ رسوا کن باتیں ۔ ایسی باتیں جنہیں ترک کر دینا چاھئے*۔ بِہٖ سٰمِرًا تَھْجُرُوْنَ (٢٣/٦٧) میں بعض کے نزدیک تَھْجُرُوْنَ کے معنے بکواس کرنا ھیں ۔

اَلْھِجْرَۃُ ۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں کوچ کر جانا ۔ اس سے فعل ھَاجَرَ ھے ۔ ازھری نے کہا ھے کہ دراصل اھل عرب کے نزدیک بادیہ نشینوں کا شہر کی طرف منتقل ھو کر آ جانا ، اَلْمُھَاجَرَۃُ کہلاتا تھا، پھر اس شخص کو جو اپنے مقام رھائش کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے مُھَاجِرٌ کہہ دیتے ھیں* ۔ لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ھے ۔ قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مرد مومن کا فریضۂ زندگی یہ ھے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے کوشش کرے ۔ وہ جس مقام میں رھتا ھے سب سے پہلے اپنی اس کوشش کو وھیں سے شروع کرتا ھے ۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ وھاں کی فضا اس نظامِ نو کے لئے سازگار نہیں ، تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وھیں نہیں بیٹھے رھنا چاھئے ۔ اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاھئے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ھو ۔ مومن کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ نہیں رہ سکتا ۔ مومن کا جہان ھر کہیں ھے ۔ وہ کسی خاص زمین میں زندگی بسر کرکے وھیں مر جانے کے لئے پیدا نہیں ھوتا ۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے پیدا ھوتا ھے ۔ اس مقصد کے لئے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاھئے ۔ مال و دولت ۔ جھوٹی عزت اور قوت ۔ رشتہ دار ۔ وطن ۔ سب کچھ ۔ اس ''چھوڑ دینے'' کا نام ھِجْرَۃٌ ھے اور ایسا کرنے والے کو ''مہاجر'' کہتے ھیں ۔ لیکن صرف ''چھوڑ دینا''

---

*تاج ۔

ھی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں اکثر ھَاجَرُوْا وَجَاھَدُوْا (۲/۲۱۸) ۔ اکٹھا آیا ھے ۔ ھَاجَرُوْا حصہ لا ھے اور اس کے بعد جَاھَدُوْا حصہ اِلّا اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جد و جہد ھی کا ایک پہلو ھے ۔ ھجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں ۔ یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ھونے کا نام ھے ۔

مَھْجُوْرٌ ۔ قرآن کریم میں ھے وَقَالَ الرَّسُوْلُ یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (۲۵/۳۰) ۔ اور رسول ، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کریم کو مَھْجُوْر بنا دیا تھا ۔ اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ھے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا ۔ لیکن مَھْجُوْرٌ کے معنی اس سے کہیں گہرے ھیں ۔ آپ نے دیکھا ھوگا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ھو اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ھیں اور رسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ھیں لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ھیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رھتا ھے ۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ھے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا ۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے ۔ اس طرح بندھے ھوئے جانور کو مَھْجُوْرٌ کہا جاتا تھا ۔ اَلْھِجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا* ۔ رسول اللہ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات ، خیالات ، رسومات ، روایات ، قوانین ، تفاسیر ، وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَھْجُوْرٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا ۔ انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا ۔ سینوں سے لگا رکھا تھا۔ لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ھی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی ان کے خود ساختہ ''مذھب وشریعت،، کی رسی مناسب سمجھتی تھی ۔ یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے ، قرآن کریم ان کے تابع تھا ۔ یہ ھے مطلب قرآن کریم کو مَھْجُوْرٌ بنا دینے کا ۔

ابن قتیبہ نے ھُجْرٌ کے معنی ھذیان بکنے کے بھی لکھے ھیں** ۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ھوگا کہ انہوں نے قرآن کریم کو محض منتر بنا رکھا تھا ۔

*تاج ۔ **القرطبی ج/۲ صفحہ ۴۹ ۔

# ھ ج ع

اَلْھُجُوْعُ ۔ سونا خواہ کسی وقت بھی ہو۔ یا رات کو سونا ۔ کبھی یہ سوئے بغیر صرف لیٹنے اور آرام کرنے کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلتَّھْجَاعُ ۔ ہلکی سی نیند ۔ رَجُلٌ ھُجَعَۃٌ ۔ بیوقوف ، لا ابالی اور غافل آدمی* ۔

قرآن کریم میں ہے کَانُوْا قَلِیْلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (۵۱/۱۷) ۔ وہ رات کو بہت کم سوتے تھے (جس انقلاب عظیم کی وہ تیاریاں کر رہے تھے اور جو کام انہوں نے اپنے ذمے لیے رکھے تھے ، ان کی تکمیل میں وہ دن رات مصروف رہتے تھے اور رات کا بہت کم حصہ سونے میں گذارتے تھے (۷۳/۲۰،۲) ۔

# ھ د د

اَلْھَدُّ ۔ کسی چیز کو سختی سے زور کی آواز کے ساتھ گرا دینا ۔ منہدم کر دینا ۔ عمارت کو توڑ کر گرا دینا ۔ اَلْھَادُّ ۔ سمندر کی آواز جسے اہل ساحل سنتے ہیں اور جس میں ایک گونج سی معلوم ہوتی ہے ۔ اور کبھی یہ آواز زلزلہ کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے ۔ اَلْھَادَّۃُ ۔ گرج (بادلوں کی)** ۔ اَلْھَدَّۃُ کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ ھَدَّ دَتِ الْبَقَرَۃَ ۔ میں نے گائے کو ذبح کرنے کے لئے گرا دیا ۔ اَلْھَدُّ ۔ گری ہوئی چیز*** ۔ ھَدَّدَہٗ تَھْدِیْدًا ۔ اس نے اسے دھمکایا اور خوف دلایا ** ۔

سورۃ مریم میں ہے وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا (۱۹/۹۰) ۔ پہاڑ سخت آواز کے ساتھ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں ۔

اَلْھُدْھُدُ ۔ وہ کبوتر جو زیادہ غٹرغوں کرے ۔ نیز ہر وہ پرندہ جو کبوتر کی طرح زیادہ بولے ۔ ایک معین پرندہ کو بھی کہتے ہیں* ۔ لیکن قصہٗ حضرت سلیمانؑ میں جس ھُدْھُد (۲۷/۲۰) کا ذکر ہے وہ ان کی فوج کے ایک افسر کا نام تھا ۔ اُس زمانے میں پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر قبائل اور افراد کے نام عام طور پر رکھتے تھے ۔ (انگریزوں کے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ وہاں لوگوں کے نام (Fox) اور (Lamb) عام طور پر ملتے ہیں ۔ ہندؤوں میں بھی طوطا رام اور چوہامل جیسے نام پائے جاتے ہیں) ۔ توریت (کتاب اول سلاطین) میں یہ نام (ھد ھد) کئی بار آیا ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ ھَدَا ھِدٌ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا ۔ اور تاج العروس میں ہے کہ ھَدَدٌ ۔ حمیر کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو حضرت سلیمانؑ کا ہم عصر تھا ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

قرآن کریم میں آلْهُدْهُدَ (ال کے ساتھ) آیا ہے - اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نام نہیں تھا ، بلکہ اپنے قبیلہ یا فوج کی نمائندگی کی جہت سے اسے اس طرح پکارا گیا ہے -

## ھ د م

آلْهَدْمُ - عمارت کو توڑ دینا اور گرا دینا - آلتَّهْدِيْمُ کے بھی یہی معنے ہیں لیکن اس میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے - آلْهَدْمُ - کمر توڑ دینا - آلْهَدَامُ - چکر جو کسی کو سمندری سفر میں آتے ہیں - اِنْهَدَمَ الْبِنَاءُ - عمارت گر پڑی* - تَهَدَّمَ الْبِنَاءُ - عمارت تھوڑی تھوڑی کرکے گر پڑی** - دِمَاؤُهُمْ هَدَمٌ - ان کے خون رائیگاں گئے* -

سورۃ حج میں ہے لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ . (۲۲/۴۰) - عبادت گاہیں گرا دی جاتیں - یہاں یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان عبادت گاہوں کی عزت وحرمت کا لحاظ نہ کیا جاتا -

## ھ د ھ د

الهُدْهُدُ - دیکھئے عنوان (ھ - د - د) -

## ھ د ی

هُدًی - کے بنیادی معنی نمایاں اور روشن ہونا - آگے آگے ہونا - اور دوسروں کے آگے آگے چلنا ہیں - چنانچہ روشن ہونے کی وجہ سے دن کو هُدًی کہا جاتا ہے - اور هَادِيَةٌ اس ابھری ہوئی چٹان کو کہتے ہیں جو پانی میں دور سے نظر آجائے*** - قرآن کریم میں ہے أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ (۲۰/۱۲۸) - جس کے معنی ہیں ، کیا یہ امر ان پر واضح ، نمایاں اور روشن نہیں کیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) راستہ بتانے کے لئے آگے بڑھ جانا اور (۲) ھدیہ اور تحفہ بھیجنا -

هَادٍ ( جو اصل میں هَادِیٌ تھا ) - ہر چیز کے اگلے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے پہلے نظر آجاتا ہے - اس لئے جانور کی گردن پر الْهَادِی کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ باقی بدن سے آگے ہوتی ہے - اس اعتبار سے هَدْیٌ اور هَدِیٌّ - اُس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ میں ذبح کرنے کے لئے لے جاتے تھے کیونکہ اُس جانور کو آگے آگے رکھا

*تاج و راغب - **محیط - ***تاج و محیط -

جاتا تھا ۔ هَدِیَّةٌ* ۔ اُس تحفه کو کہتے هیں جو بغیر معاوضه دیا جائے ، اس لحاظ سے کہ وہ ضرورت پڑنے سے پہلے هی دیدیا جاتا ہے۔

هَدَیٰ کے معنی هیں راسته کو پہچنوا دینا ۔ واضح کرنا ۔ راہ نمائی کرنا * ۔ بعض اوقات هُدًی کے معنی راہ نمائی کی بجائے راہ نما هوتا ہے ۔ مثلاً اَوْاَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی (۲۰/۱۱) میں هُدًی (راہ نمائی) کا مطلب الهَادِیْ یعنی راہ نما ہے ** ۔ سورہ بقرہ میں ہے حَتّٰی یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ (۲/۱۹۶) ۔ اس سے مراد وہ جانور ہے جسے مکہ میں (حج کی تقریب) پر ذبح کیا جائے۔ نیز ہر قسم کا سامان اور مال (جو وهاں بھیجا جائے)۔ هَدِیَّةٌ (۲۷/۳۵) تحفه ۔ هَادٍ (۱۳/۷) راسته دکھانے والا۔ مُهْتَدٍ (۵۷/۲۶)۔ هدایت پایا هوا۔

دین کا مدار اس بنیادی حقیقت پر ہے کہ عقلِ انسانی، اُن مستقل اقدار کو نه وضع کر سکتی ہے اور نه هی از خود ان کا انکشاف کر سکتی ہے جنکے مطابق انسانی زندگی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے ۔ یه اقدار خدا کی طرف سے ملتی هیں ۔ اسے وحی کہا جاتا ہے جو آخری بار نبی اکرمؐ کو ملی اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ عقلِ انسانی کو اس وحی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو (سورج کی) روشنی کی ۔ جب انسانی عقل ، وحی کی راهنمائی میں چلیگی تو یه دنیا جنت بن جائے گی ورنه فساد اور خون ریزیوں کا جهنم بنی رہے گی ۔ وحی کی اسی راہ نمائی کو هدایت خداوندی کہتے هیں جو انسان کو زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف لے جاتی ہے ۔ قرآن کریم کی رُو سے هدایت (راہنمائی) صرف وحی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی (۲/۱۲۰) ۔ اس کے مقابله میں انسانوں کی تجویز کردہ راهنمائی ، هدایت نہیں ، ضلالت ہے (۲/۱۶) ۔ یہی راہ سیدھی ہے ۔ اس کے علاوہ هر راسته ٹیڑھا ہے (۳/۷) ۔ رسول ، اسی هدایت خداوندی کو لیکر آتے تھے ۔ لیکن ان کے ذمے اس هدایت کو لوگوں تک پہنچا دینا تھا ۔ اُنہیں اس راسته پر چلا دینا نہیں تھا (۲/۲۷۲ و ۲۸/۵۶) ۔ سیدھے راسته پر انسان خود اپنی رضا و رغبت سے چل سکتا ہے ۔ زبردستی کسی کے چلانے نہیں چل سکتا ۔ اس لئے که دین میں اکراہ نہیں (۲/۲۵۶) ۔ خود خدا نے بھی انسانوں کے لئے زندگی کی راهوں کو روشن اور واضح کیا ہے ۔ انہیں ان راهوں پر چلنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا ۔ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ هم نے اس کے لئے راسته واضح کر دیا ہے ۔ اب وہ چاہے تو اسے اختیار کرلے

---

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

اور چاہے اس سے انکار کر دے''۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ ''ھدایت'' اس کی شہادت دے رہا ہے کہ اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں ۔ راستہ اسی کو بتایا جاتا ہے جو منزل تک پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاہے ۔ انہی کو مُتَّقِیْن کہا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے انہی معنوں میں اپنے آپ کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ( ۲/۲ ) کہا ہے ۔ یعنی جو لوگ غلط راستے کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہیں ان کےلئے صحیح راستے کیطرف راہ نمائی ۔

## ھ ر ب

ھَرَبَ ۔ یَھْرُبُ ۔ ھَرَبًا ۔ وہ بھاگ گیا ۔ ھَرَبَ فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں دور چلا گیا ۔ ھَرَّبَہٗ ۔ اس نے کسی دوسرے آدمی کو بھگا دیا ۔ ھَرَبَ مِنَ الْوَتَدِ نِصْفُہٗ ۔ میخ آدھی گھس گئی ۔ اَھْرَبَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی معاملہ میں منہمک ہوگیا ۔ مستغرق ہوگیا ۔ اَھْرَبَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا نے خاک اڑائی *۔

ھَرَبَ ۔ یَھْرُبُ ۔ وہ زمین میں دور تک چلا گیا**۔

قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَہٗ ھَرَبًا ( ۷۲/۱۲ ) ۔ ''اور ہمارا گمان ہے کہ نہ تو ہم زمین میں (مقابلہ کرکے) اللہ کو عاجز کرسکتے (شکست دے سکتے) ہیں اور نہ ہی بھاگ کر ایسا کرسکتے ہیں''۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بھاگ کر اس کے قانون مکافات کی زد سے نکل جائیں اور اسطرح اسے ہرا دیں ۔

## ھ ر ع

اَلْھَرَعُ ۔ وَالْاِھْرَاعُ ۔ سختی سے ہانکنا ۔ تیز دوڑانا*۔ ھَرِعَ اِلَیْہِ ۔ اضطراب اور تیزی سے اس کی طرف پہنچا ۔ اَلْاِھْرَاعُ ۔ شدت شوق۔ اَلْمُھْرِعُ ۔ شیر کو کہتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے حرکت و اضطراب بتائے ہیں اور اُھْرِعَ الرَّجُلُ کے معنے بتائے ہیں وہ خوف سے کانپا۔ اور ھُمْ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ کے معنے، وہ اس کی طرف کشاں کشاں آئے ۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے متعلق ہے وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ ( ۱۱/۷۸ ) ۔ اس کی قوم اس کی طرف شدت شوق سے تیزی کے

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

ساتھ دوڑتی ہوئی آئی ۔ یُھْرَعُوْنَ میں شوق کی شدت اور مضطربانہ تیزی پائی جاتی ہے ۔ اس لئے اس ایک لفظ نے ان کی اس حرکت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے ۔ یُھْرَعُوْنَ مجہول کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جذبات انہیں ایسا کرنے پر ابھار رہے تھے ۔

## ھ ز ء

ھَزِیَٔ ۔ ھَزْوًا ۔ (اور ھُزُوْءً ۔ اور ھُزُوًا) کے معنی ہیں مذاق اڑانا ۔ رَجُلٌ ھُزْاَۃٌ ۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جسکا لوگ بہت مذاق اڑائیں ۔ اور مَفَازَۃٌ ھَازِئَۃٌ بِالرَّکْبِ ۔ ایسا لق و دق جنگل جو سواروں کا مذاق اڑائے ۔ ( یعنی اسکی وسعت اور ہیبت سے سوار اپنے آپ کو خفیف محسوس کرنے لگ جائیں )* ۔ منافقین اپنی پارٹی کے سرغنوں سے خلوت میں جا کر کہتے تھے کہ ہم جو جماعت مومنین سے جا کر ملتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں ۔ نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ ($\frac{۲}{۱۴}$) ۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ کیا مذاق کرینگے ۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے خود ان کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے ۔ یہ سراب کو حقیقت سمجھ کر اسکے حصول میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں ۔ ان کا خود اپنی نفسیاتی فریب انگیزیوں میں اسطرح مارے مارے پھرنا ان کے ساتھ عملی مذاق ہے ۔ خدا کا مہلت کا قانون ان کی جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے یہ اپنی بے راہ روی میں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حقیقت کی دنیا میں اپنا مذاق آپ اڑواتے ہیں ۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِیءُ بِھِمْ وَ یَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ($\frac{۲}{۱۵}$) ۔

سورہ حجر میں ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی ہے ۔ یہاں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی کارفرما ہے ۔ تو یہ لوگ درحقیقت خدا کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ ($\frac{۱۵}{۹۵-۹۶}$) ۔ ”ہم ان مذاق کرنے والوں کے لئے تیری طرف سے کافی ہیں ۔ یہ جو اللہ کے ساتھ اور معبود اختیار کرتے ہیں“ ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ مذاق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مقام خدا کا ہے اس میں کسی اور کو بھی شریک سمجھ لیا جائے ۔ یا خدا کے متعلق عقیدہ و تصور

---

*تاج ۔

کو یونہی (Lightly) لیا جائے - اور زندگی کے حقائق پر (Seriously) غور نہ کیا جائے -

سورہ بقرہ میں ہے قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (۶۷/۲) - انہوں نے کہا کیا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے ؟

## ھ ز ز

هَزَّهٗ - يَهُزُّهٗ - هَزًّا - کسی چیز کو حرکت دینا (کھینچ کر، دھکا دیکر، یا دائیں بائیں ہلا کر) - راغب نے کہا ہے کہ هَزٌّ - شدت کے ساتھ حرکت دینے کو کہتے ہیں - یعنی زور سے ہلانا *- سورہ مریم میں ہے وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ (۲۵/۱۹) - اسے زور سے اپنی طرف حرکت دے -

هَزَّ الْحَادِيْ الْاِبِلَ هَزًّا - حدی خواں نے اپنی حدی سے اونٹوں کو پرنشاط اور مست کر دیا چنانچہ وہ ہلکے پھلکے ہو کر چلنے لگے - اسی سے اَلْهِزَّةُ - نشاط اور مستی کو کہتے ہیں (جس میں انسان جھومنے لگ جاتا ہے) - اِهْتَزَّ النَّبَاتُ - پودے لہلہانے لگے (ہوا سے ہلنے اور جھومنے لگے)* - قرآن کریم میں ہے فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ (۵/۲۲) - جب ہم مینہ برساتے ہیں تو پودے لہلہانے لگتے ہیں - دوسری جگہ یہ لفظ خَاشِعَةً کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۹/۴۱) جس کے معنی پژمردگی ہیں -

## ھ ز ل

اَلْهَزْلُ - کسی معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ (Seriously) نہ لینا - یونہی مذاق کے طور پر لینا - هِزِّيْلٌ - بہت مذاق کرنے والا - اَلْهُزَالَةُ - مذاق - اَلْهُزَالُ - لاغری کو کہتے ہیں **- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کمزوری ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَزْلُ ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ ہو***- قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے متعلق ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۴-۱۳/۸۶)- یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے - یونہی مذاق کی بات نہیں - یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بحث کرتا ہے، سطحی جذبات کی تسکین کے لئے سرسری گفتگو نہیں کرتا - یہ ''شاعری'' نہیں - اسکے ایک ایک لفظ پر بڑی سنجیدگی سے (Most Seriously) غور کرنا چاہئے - یونہی (Lightly) نہیں لینا چاہئے - نہ ہی اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اس میں خالی پند و نصائح کے

*تاج و راغب - **تاج - ***راغب -

طور پر باتیں کہ دی گئی ہیں ۔ قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور حقیقت کہا گیا ہے نہ محض جھوٹ موٹ ڈرانے دھمکانے کی خاطر۔

## ه ز م

هَزْمٌ ۔ کسی سوکھی چیز کو اتنا دبانا کہ وہ ٹوٹ جائے*۔ پھر اس کے معنی محض توڑ دینے کے ہو گئے**۔ تَهَزَّمَتِ الْقَوْسُ ۔ کمان آواز کے ساتھ پھٹ گئی ۔ اَلْهَزِيْمُ گرج جسکی آواز میں کڑاؤ ہو۔ هَزَمَ الْعَدُوَّ ۔ دشمن کو شکست دیدی** (۲/۲۵۱) ۔

جُنْدٌ . . . مَهْزُوْمٌ ۔ (۳۸/۱۱) شکست خوردہ لشکر۔ سورہ قمر میں ہے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ (۵۴/۴۵)۔ یہ جمعیت شکست کھا جائیگی۔

## ه ش ش

هَشٌّ۔ حرکت دینا ۔ (یہ هَزٌّ کے قریب المعنی ہے)۔ اور عام طور پر نرم چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے ۔ جیسے پتوں وغیرہ کو حرکت دینا*۔ یہیں سے هَشَّ الْوَرَقَ کے معنی ہیں درخت سے پتے جھاڑنا (ابن فارس)۔

حرکت اور نرمی کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی خوش ہونے کے بھی آتے ہیں ۔ اَنَا بِهٖ هَشٌّ بَشٌّ ۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں ۔ اسی سے هشاش بشاش ہے ۔ اَلْهَشِيْشُ ۔ وہ سخی شخص کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ بہت خوش ہو**۔

سورہ طٰه میں ہے کہ جب حضرت موسٰیؑ کو وحی کی راہ نمائی عطا ہوئی اور اللہ نے ان سے پوچھا کہ اس ضابطہ ھدایت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائیگا ، تو آپ نے کہا کہ یہ میرے لئے عمر بھر کا سہارا ہوگا ۔ اور اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ (۲۰/۱۸)۔ میں اس سے اپنی بھیڑوں (بنی اسرائیل) کے لئے غذائے نفس پیدا کرونگا۔ آیت کے لفظی معنی ہیں ''میں اس (عصا) سے اپنی بھیڑوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں ،،۔

## ه ش م

اَلْهَشْمُ ۔ خشک چیز کو توڑ دینا (یا ہر ایسی چیز کو جس کا توڑنا دشوار نہ ہو)۔ اَلْهَشِيْمُ ٹوٹا ہوا ۔ وہ گھاس جو خشک ہو کر چورہ چورہ ہو گئی ہو۔ خشک گھاس یا درخت***۔ سورہ کہف میں ہے فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا (۱۸/۴۵) وہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے ۔ سورہ القمر میں ہے

*راغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب و محیط ۔

فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴/۳۱)۔ وہ ایسے ردی چورے کیطرح ہو گیا جو باڑ بنانے والے کی باڑ سے خستہ ہو کر گرتا ہے ۔ یعنی بالکل ناکارہ ، خستہ و تباہ ۔

تَهَشَّمَ النَّاقَةَ ۔ اس نے پورے ہاتھ سے اونٹنی کا دودھ دوہ لیا (اور اس کے تھنوں کو خشک کر کے یا نچوڑ کر رکھ دیا)۔ اسی سے هَاشِمٌ ۔ روٹی توڑنے یا اس کا چورا کرنے والے کو کہتے ہیں ۔ نیز یہ عمرو العلاء کا لقب تھا جو عبدالمطلب کا باپ تھا کیونکہ وہ حاجیوں کو ثرید بنا کر کھلایا کرتا تھا ۔ روٹی کو توڑ توڑ کر سالن میں ڈالتے ہیں ۔ اسے ثرید کہتے ہیں ۔ اَلْهَشِيْمُ ۔ سخی آدمی کو کہتے ہیں ۔ اور الهَشْمُ خشک اور نشیبی زمین کو*۔

# ھ ض م

هَضْمٌ ۔ کے اصلی معنی ہیں کسی نرم چیز کو کچلنا یا توڑنا ۔ کسی چیز کو کم کرنا ۔ هَضَمَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی پر ظلم کیا ۔ اسے دبایا اور اسکا حق غصب کر لیا ۔ ہماری زبان میں بھی اس مفہوم کے لئے یہی کہتے ہیں کہ فلاں نے اس کی چیز ہضم کر لی ۔ اَلْهَضَّامُ ۔ شیر کو کہتے ہیں ۔ هَضَمَهُ حَقَّهُ اس نے اس کا حق کم کر دیا ۔ اَلْهَضِيْمُ ۔ نرم ۔ لطیف ۔ پختہ ۔ خوشگوار ۔ وہ چیز جسکا ایک حصہ دوسرے میں گھسا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲)۔ اس (جنتی معاشرہ) میں نہ حق تلفی کا خوف ہوگا نہ غصب و نہب کا ۔ اس میں نہ استبداد ہوگا نہ ناجائز انتفاع یا استحصال (Exploitation) ۔ سورہ شعراء میں ہے ۔ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۔ (۲۶/۱۴۸) جن کے شگوفے تہ بہ تہ جمے ہوئے اور ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوں ۔

# ھ ط ع

هَطَعَ هَطْعًا وهُطُوْعًا ۔ تیزی سے کسی چیز کی طرف ڈرتے ہوئے بڑھنا ۔ یا کسی چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے آگے بڑھنا اور نگاہوں کو اس پر سے ادھر ادھر نہ ہٹانا ۔ اَهْطَعَ کے بھی یہی معنی ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و محیط و راغب ۔

اَھْطَعَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِہٖ ۔ اونٹ نے چلنے میں اپنے سر کو سیدھا اور گردن کو لمبا کیا *۔ قرآن کریم نے جنگ کی بدحواسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں کہا ہے کہ مُھْطِعِیْنَ (۱۴/۴۳) ۔ لوگ اسطرح بدحواس ہو کر بھاگ رہے ہونگے کہ انہیں این و آن کی کچھ خبر نہ ہوگی ۔ ڈر اور دہشت کے مارے سیدھا رخ کئے بھاگ رہے ہونگے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں کسی چیز کی طرف رخ کرنے، اسکی طرف بڑھنے، نیز اطاعت و انقیاد کا مفہوم ہوتا ہے ۔

# ھَلْ (حرف)

ھَلْ (۱) استفہام کے لئے آتا ہے ۔ مثلاً ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالاً (۱۸/۱۰۳) ۔ ”کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سخت خسارے میں رکھینگے ؟“

(۲) قَدْ ۔ (یقیناً) کے معنوں میں آتا ہے ۔ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِنَ الدَّھْرِ (۷۶/۱) ”یقیناً انسان پر ایسا وقت بھی گذر چکا ہے“ ....

(۳) کبھی، بطور استفہام، مَانافیہ کے معنوں میں آتا ہے ۔ ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰) ۔ کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی کچھ ہے ؟ (یعنی احسان کا بدلہ احسان کے سوا اورکچھ نہیں) ۔

# ھ ل ع

اَلْھَلَعُ ۔ گھبراہٹ ۔ بے صبری ۔ بہت زیادہ، حد سے متجاوز اور بد ترین قسم کی گھبراہٹ ۔ رنج و حزن ۔ اَلْھَلُوْعُ ۔ حریص اور انتہائی بخیل ۔ تنگ دل ۔ بےصبری کا مظاہرہ کرنے والا ۔ ھَاعَ یَھْلَعُ ۔ وہ بھوکا ہوگیا **۔ جب بھوک اور حرص اکٹھی ہو جائیں تو ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان جتنا ہی چاہے کھا جائے اسکی بھوک مٹتی ہی نہیں، اور ہر وقت واویلا (”ہے نہیں ۔ ہے نہیں“) کرتا رہتا ہے ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ رَجُلٌ ھُلَعَۃٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت جلد گھبرا کر واویلا کرنے لگ جائے اور ہمت ہار دے ***۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعاً (۷۰/۱۹) ۔ انسان کو اگر علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو اسکی حرص کبھی ختم ہی نہیں ہوتی ۔ یہ تو صرف نظام صلوٰۃ ہے جو اس میں سیر چشمی پیدا کر دیتا ہے (۷۰/۲۲) اور اس کے واویلے کو ختم کر دیتا ہے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***ابن فارس ۔

# ه ل ک

هَلَكَ - يَهْلِكُ - کے معنی مر جانے کے ہیں ، اگرچہ عوام اس لفظ کو بُری موت کے لئے بولتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ٹوٹنے اور گر پڑنے کے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ هَلَاكٌ کے معنی عذاب ، خوف اور فقر کے بھی ہوتے ہیں**۔ اِسْتَهْلَكَ الْمَالَ - مال کو خرچ کرکے ختم کردیا - أَهْلَكَ الْمَالَ - اس نے مال کو فروخت کر دیا - اَلْهَلَكُ - قحط کے سال* - اَلْهُلَّاكُ - فقیر اور نادار لوگ - وہ مسافر جو امداد اور صلہ حاصل کرنے کے لئے جائیں اور راستہ بھول جائیں - اَلْهَالِكَةُ - حریص اور لالچی نفس - اَلتَّهْلُكَةُ - ہر وہ چیز جو بالآخر تباہی کی طرف لے جائے* - راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کا اپنے پاس نہ رہنا - کسی چیز کا خراب اور بدحال ہوجانا، مر جانا یا بالکل ضائع ہوجانا، سب کے لئے هَلَاكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے** -

قرآن کریم میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ قدیم میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ کوئی بستی کسی طبعی حادثہ ( مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے) کی وجہ سے بالکل تباہ ہو جائے - لیکن عام طور پر قوموں کی ہلاکت سے مراد ان کی ذلت و رسوائی اور کمزوری و محکومی ہوتی ہے - یعنی اگر کسی قوم سے سروری و سرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہے - یہی وہ ہلاکت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ - وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ( ۲/۱۹۵ ) - نظام خداوندی کے قیام کے لئے اپنے اموال کو کھلا رکھو - ایسا نہ کروگے تو تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لوگے - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی حادثہ یا عارضی سبب سے کوئی قوم وقتی طور پر گر جاتی ہے لیکن حالات کے سدھرنے پر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے (یہ اس کی حیاتِ نو یا نَشْاَۃِ ثانیہ کہلاتی ہے)۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۲/۵۶)۔ ''ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں پھر اُٹھا کھڑا کیا'' - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تباہی عارضی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتی ہے - سورۃ بنی اسرائیل میں پہلی صورت کو عذاب سے اور دوسری کو ہلاکت سے تعبیر کیا گیا ہے ( ۱۷/۵۸ ) نیز ( ۲۱/۹۵ ) - لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں - اس میں بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے -

سورۃ قصص میں ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ" ( ۲۸/۸۸ )۔ اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی

---

*تاج و محیط - **راغب -

ذات باقی رہ جائے گی ۔ اس کی تائید میں سورۃ رحمان کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے ۔ "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷) ۔ لیکن ان آیات کا صحیح مفہوم یہ نہیں ۔ پہلی آیت میں هَالِكٌ اور دوسری میں فَانٍ دونوں اسم فاعل ہیں اور اسم فاعل کو جب تک خصوصیت سے مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کردیا جائے اسکے معنی زمانہ حال کے ہوتے ہیں ۔ مثلاً اِنِّىْ جَاعِلٌ کے معنی یہ نہیں کہ میں بناؤنگا ۔ اس کے معنی ہیں میں بنا رہا ہوں ۔ لہذا هَالِكٌ اور فَانٍ کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہو جائیگی* ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہو رہی ہے ۔ کائنات کی ہر شے حالتِ فنا و ہلاکت سے گزر رہی ہے ۔ فنا کے معنی معدوم ہو جانا نہیں ۔ اس کے معنی ہیں تغیر پذیر ہو جانا ۔ ایک حال پر نہ رہنا ۔ اور ہلاکت کے معنی بھی قوت کے کم ہو جانے کے ہیں ۔ لہذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی ۔ ہر شے میں ہر آن تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں ۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشو و نما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے ۔ وہ تغیرات کے اثر سے مامون رہتا ہے ۔ اسی کو مستقل قدر کہتے ہیں ۔ لہذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر یا روبہ انحطاط ہے ، بجز مستقل اقدار کے جو قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ خدا کی ربوبیت کبریٰ (عالمگیر نشو و نما) ہے ۔ لہذا وہی نظریہ زندگی ، وہی نظام حیات ، وہی قوم ، تغیرات اور انحطاط سے محفوظ رہ سکتی ہے جو اپنا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے ۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کا غلبہ و تسلط اور قوت و اثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہو جاتا ہے ۔ اسی کے متعلق سورۃ اَلْحَاقَّة میں ہے کہ هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطَانِيَهْ (۶۹/۲۹) ۔ "میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا" ۔ قوتیں ضعف سے بدل گئیں ۔

آیات مندرجہ صدر میں "وجہ رب" کے معنی خود ذات خداوندی بھی ہوسکتے ہیں

---

*کائنات کا انجام کیا ہوگا ۔ یہ بھی اس قسم کا راز ہے جس قسم کا راز کائنات کا آغاز ہے ۔ یہ امور انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتے ۔ بہر حال ، کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے ۔ اسی کے قانون کے مطابق قائم ہے ۔ اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا ۔ ابدی تو یہ بہرحال نہیں ۔ یعنی اُن معنوں میں ابدی جن معنوں میں خدا ابدی ہے ۔ ہمارے لئے یہ سوال بھی بیکار ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ ہم نے تو بہر حال ایک دن موجودہ ارضی زندگی کو چھوڑنا ہے ۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جب تک اس میں رہیں اس کے حسن میں اضافہ کرتے چلے جائیں ۔

# ھ ل ل

اَلْھِلَالُ - کے اصلی معنی ہوتے ہیں آواز بلند کرنا* - راغب نے لکھا ہے کہ رویت ہلال کے موقع پر اونچی آواز نکالنے کے لئے بولا جاتا ہے ، بعد ازاں ہر آواز کے لئے بولا جانے لگا** - ھَلَّ الرَّجُلُ - آدمی چیخا - اِسْتَھَلَّ الصَّبِیُّ - بچہ نے پیدا ہوتے ہی رونے کی آواز بلند کی - اَلْھِلَالُ - مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند - بعض نے کہا ہے کہ تیسری تاریخ بلکہ ساتویں تاریخ تک کے چاند کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے - ( اسی طرح قمری مہینے کی چھبیس - ستائیس تاریخ کے چاند کو بھی کہتے ہیں)- ھِلَالٌ کو ھِلَالٌ اس لئے کہتے ہیں کہ لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر بتاتے ہیں* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آواز بلند کرنا لکھے ہیں - اَھَلَّ الشَّھْرَ - مہینہ کا چاند دیکھ لیا* - اَلْھَلَالُ اور اَلْھِلَالُ - پہلی بارش کو بھی کہتے ہیں* - (لیکن اسی بارش کو جسکے برسنے کی آواز آئے) -

اَلْھَلَّلُ - ہاتھی کے مغز کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زہر قاتل ہوتا ہے - یعنی زہر ہلاہل* - ھَلَّلَ - یہودی اور نصرانی اس لفظ کو تسبیح پڑھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو عبرانی اور سریانی زبان کا لفظ ہے** - ہمارے ہاں بھی تسبیح و تہلیل کہتے ہیں - ھَلَّلَ کے معنی ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہنا** -

قرآن کریم میں (کھانے پینے کی حرام اشیاء کی فہرست میں) ہے وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ ( ۲/۱۷۳ )- یعنی وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا جائے - جو چیز بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے وہ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہو جاتی ہے - مؤمن کے لئے خدا کے سوا کسی اور قوت کا تصور شرک ہے - '' منسوب ہونے '' - یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام سے پکارے جانے کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے - مثلاً شاہ مدار کے نام پر بکرا چھوڑ دیا جاتا ہے - بکرا ویسے تو حلال جانور ہے لیکن چونکہ اسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے پکارا گیا ہے ، یا اسے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے ، اس لئے اس کا کھانا حرام ہو جائے گا - اسی طرح کھانا پکا کر کہدیا جائے کہ یہ فلاں پیر صاحب کی نیاز ہے تو اگرچہ وہ کھانا پاک اور صاف ، حلال اور طیب تھا لیکن غیر اللہ کی طرف نسبت سے وہ حرام

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

ہو جائے گا ۔ اس لئے کہ اس نسبت میں شرک کا پہلو آجاتا ہے اور یہ توحید کے منافی ہے ۔ قرآن کریم انسان کے عقائد اور تصورات کو شرک کے شائبہ تک سے پاک رکھنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ شرک وجہِ تذلیل انسانیت ہے ۔

## هَلُمَّ

هَلُمَّ (۱) آؤ ۔ هَلُمَّ اِلَيْنَا (۳۳/۱۸) ۔ ہماری طرف آؤ ۔

(۲) لاؤ ۔ هَلُمَّ شُهَدَآءَ كُمْ (۶/۱۵۱) ۔ اپنے گواہ لاؤ ۔

## هُمْ

هُمْ ۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ هُمْ رِجَالٌ وہ سب آدمی ہیں ۔ سورۃ منافقون میں ہے هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ . . . (۶۳/۷) یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں ۔

(۲) هُمْ ضمیر منصوب متصل بھی ہے ۔ جمع مذکر غائب کے لئے آتی ہے ۔ ضَرَبَهُمْ ۔ اس نے ان سب کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (۲/۳۱) ۔ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے کیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُهُمْ ۔ ان سب کا غلام ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ . . . (۲۰/۶۶) ۔ ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں . . .

## هُمَا (ضمیر)

هُمَا ۔ تثنیہ غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے آتی ہے ۔ هُمَا رَجُلَانِ ۔ وہ دونوں مرد ہیں ۔ هُمَا امْرَاَتَانِ ۔ وہ دونوں عورتیں ہیں ۔ سورۃ توبہ میں ہے اِذْ هُمَا فِى الْغَارِ (۹/۴۰) ۔ "جب وہ دونوں غار میں تھے" ۔

(۲) یہ ضمیر منصوب متصل کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے اور تثنیہ غائب کے لئے آتی ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں طور پر آتی ہے ۔ ضَرَبَهُمَا ۔ اس نے ان دونوں کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ . . . (۲/۳۶) ۔ پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُهُمَا ۔ ان دونوں کے غلام ۔ ( مذکر و مؤنث دونوں کیلئے ) ۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے بِسِحْرِهِمَا (۲۰/۶۳) ۔ (یہ دونوں) اپنے سحر کے زور سے . . .

## ھ م د

اَلْهُمُوْدُ ۔ آگ کا بجھ جانا ۔ خَمَدَتِ النَّارُ اُسوقت کہتے ہیں جب اس کا شعلہ بیٹھ جائے ، اور هَمَدَتْ هُمُوْدًا اسوقت جب وہ بالکل ہی بجھ جائے ۔ اور جب وہ راکھ ہو جائے تو اس کے لئے هَبَا يَهْبُوْ کہتے ہیں ۔ اَلْهُمُوْدُ فِي الْاَرْضِ ۔ زمین میں زندگی کا باقی نہ رہنا ۔ یعنی نہ اس میں درخت و سبزہ ہو نہ اس پر بارش برسی ہو* ۔ قرآن کریم میں ہے وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً (۲۲/۵) ۔ تم زمین کو مردہ دیکھتے ہو جہاں سبزی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا ۔

## ھ م ر

هَمَرَ الْمَاءَ يَهْمِرُهُ ۔ اس نے پانی کو گرا دیا ۔ یا بہا دیا ۔ هَمَرَ الدَّمْعَ ۔ اس نے آنسو بہائے ۔ اِنْهَمَرَ الدَّمْعُ وَالْمَطَرُ ۔ آنسو اور بارش بہے ۔ اَلْهَمَّارُ ۔ خوب برسنے والا بادل ** ۔

قرآن کریم میں حضرت نوح ؑ کے قصہ میں ہے فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ (۵۴/۱۱) ۔ پھر ہم نے آسمان کے دروازے زور سے برسنے والے پانی سے کھول دیئے ۔

## ھ م ز

اَلْهَمْزُ ۔ کچوکا دینا ۔ دھکا دینا ۔ اور مارنا ۔ کاٹ کھانا ۔ اَلْهَامِزُ کچوکے مارنے والا ۔ جماعت میں تفریق ڈالنے والا ۔ دوستوں میں جھگڑا ڈلوانے والا ۔ غیبت کرنے والا ۔ یہی معنی مبالغہ کے ساتھ اَلْهُمَزَةُ میں پائے جاتے ہیں ۔ اَلْمِهْمَزُ ۔ اَلْمِهْمَازُ ۔ لوہے کی نکیلی چیز ( میخ سی ) جو سوار کے جوتے میں لگی ہوتی ہے اور اس سے وہ جانور کو کچوکے مارتا جاتا ہے تا کہ وہ تیز بھاگے*** ۔ اسی کو ہماری زبان میں مہمیز (یا ایڑھ) لگانا کہتے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَمْزُ نچوڑنے نیز غیبت کرنے کو کہتے ہیں**** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دبانے اور نچوڑنے کے لکھے ہیں ، اور هُمَزَةٌ وهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا ۔

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ *** تاج و محیط ۔ **** راغب ۔

سورہ مومنون میں ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ (۲۳/۹۷) آیا ہے۔ سرکش مخالفین کی تمام وہ تدبیریں جن سے وہ جماعت مومنین میں تفرقہ انگیزی چاہتے ہوں۔ سورہ قلم میں ھَمَّازٍ (۶۸/۱۱) آیا ہے۔ سورہ ھُمَزَۃ میں ھُمَزَۃٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے۔ معنی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ یعنی اپنی دسیسہ کاریوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے اور وہ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتا رہے۔ وہ نہ کائنات کے حسن کی تحسین (Appreciation) کا جذبہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرے۔ یہ ذہنیت سرمایہ دار کی ہوتی ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اسقدر مال و دولت ہے تو اس سے دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ جس کے پاس دولت نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں ہو سکتی۔ (المقام المحمود)۔

## ھ م س

اَلْھَمْسُ۔ خفی آواز۔ قدموں کی مخفی ترین آہٹ۔ اَلْھَمِیْسُ۔ اونٹوں کے پاؤں کی آہٹ*۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا۔ تو نہایت ہلکی سی آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا۔

اَلْھَمْسُ۔ منہ کو بند کرکے کھانے کو چبانا تاکہ آواز نہ نکلے۔ اَلْھَمْسُ۔ نچوڑنا۔ کوٹنا۔ اَلْمُھَامَسَۃُ۔ آپس میں راز داری کی باتیں کرنا*۔ سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا ھَمْسًا (۲۰/۱۰۸)۔ تو سوائے ہلکی سی آواز کے کچھ نہیں سنے گا۔

## ھ م م

ھَمٌّ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پگھلنے، بہنے اور آہستہ آہستہ رینگنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْھَمُّ۔ غم اور حزن۔ کیونکہ وہ آدمی کو پگھلا دیتا ہے۔ ھَمٌّ اور غَمٌّ میں فرق یہ ہے کہ غَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی بات کے واقع ہو جانے کے بعد دل میں پیدا ہو۔ اور ھَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی پیش آنے والی مصیبت کے خیال سے پیدا ہو رہا ہو**۔ ھَمَّہٗ وَ اَھَمَّہٗ۔ اسے غمگین اور بے چین کیا۔ سورہ آل عمران میں ہے وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ (۳/۱۵۳)۔ ایک گروہ کو خود اسکی اپنی جانوں نے (اپنے خیالات کے وجہ سے) فکر مندکر رکھا تھا۔ یعنی وہ سچ مچ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھے بلکہ موہوم خطرات کے تصور سے خواہ مخواہ مضطرب و بیقرار ہو رہے تھے۔

*تاج و محیط و راغب۔ **تاج۔

اَلْھَمُّ۔ کسی بات کی دل میں نیت کرنا۔ ارادہ کرنا*۔ ھَمَّ بِالشَّیْءِ۔ کسی چیز کا ارادہ و قصد کیا لیکن اسے کیا نہیں**۔ وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْھَانَ رَبِّہٖ (۱۲/۲۴)۔ عزیز کی بیوی نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا (کہ یوسف کو اپنے دام ھوس میں پھانس کر چھوڑیگی) اور ھو سکتا تھا کہ یوسف بھی ایسی نیت کر لیتا اگر اس کے سامنے خدا کا واضح قانون نہ آچکا ھوتا*۔ یعنی عزیز کی بیوی چونکہ محض اپنے جذبات کے تابع چل رھی تھی اسلئے اسے اس ارادۂ بد سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے خدا کا قانون تھا اسلئے وہ ایسا ارادہ کر ھی نہیں سکتے تھے۔ غور کیجئے قرآن کریم نے اس داستان کے اتنے سے ٹکڑے میں کیسی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ھے۔ جب انسانی جذبات اور کسی مستقل اور بلند قدر میں (Tie) پڑ جائے تو مومن اس بلند قدر کے تحفظ کے لئے جذبات کے تقاضے کو قربان کر دیتا ھے۔ اسی کا نام بلند اقدار پر ایمان ھے۔

سورہ مومن میں ھے وَھَمَّتْ کُلُّ اُمَّۃٍ بِرَسُوْلِھِمْ لِیَاْخُذُوْہُ (۴۰/۵)۔ ھر قوم نے اپنے اپنے رسول کے خلاف (نقصان پھنچانے کی) تدبیریں کیں یا اسکا ارادہ کیا۔ اَلْھِمَّۃُ۔ جس کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پختہ ارادہ۔ آغازِ ارادہ*۔ اَلْمُھِمَّاتُ مِنَ الْاُمُوْرِ۔ نہایت اہم امور*۔

## ھُنَا

ھُنَا۔ ھٰھُنَا۔ یہاں۔ یہیں۔ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ (۵/۲۴)۔ ھم یہاں بیٹھے ھیں (نیز ۳/۱۵۳)۔ ھُنَالِکَ۔ وھاں۔ ھُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا (۳/۳۷)۔ وھاں زکریا نے پکارا۔ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۳/۱۱)۔ وھاں مومنوں کے ابتلاء کا وقت آیا۔

## ھ ن أ

اَلْھَنِیْءُ۔ ھر وہ چیز جسکے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہ ھو اور جسکے نتیجہ میں کوئی برائی نہ ھو۔ یہ لفظ دراصل خوراک کے لئے بولا جاتا ھے، اگرچہ دوسری چیزوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ھے***۔ طَعَامٌ ھَنِیْءٌ۔ خوشگوار کھانا۔ اَلتَّھْنِئَۃُ۔ تعزیت کے خلاف ھے۔ مبارک باد دینا*۔ سورہ نساء میں ھے۔ فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۔ (۴/۴)۔ اسے خوشگواری سے کھاؤ (اپنے تصرف میں لاؤ)۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

## هُنَّ (ضمیر)

هُنَّ - جمع مؤنث غائب کی مرفوع منفصل ضمیر ہے - هُنَّ نِسْوَةٌ وہ سب عورتیں ہیں -

(۲) هُنَّ - ضمیر منصوب متصل بھی ہے - ضَرَبَهُنَّ - اس نے ان سب عورتوں کو مارا -

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُهُنَّ - ان سب عورتوں کا غلام -

سورۃ بقرہ میں ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ (۲/۱۸۷) ''وہ تمہارے لئے (بمنزلہ) لباس ہیں -

سورۃ نساء میں ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ.... (۴/۲۵) ان کے مالکوں کی اجازت سے انہیں نکاح میں لاؤ اور ان کے مہر انہیں دے دو -

## هُوَ (ضمیر)

هُوَ - واحد مذکر غائب کے لئے ضمیر مرفوع منفصل ہے - هُوَ رَجُلٌ وہ ایک مرد ہے - هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ... (۵۹/۲۲) وہی اللہ ہے -

## ھ و د

اَلْهَوْدُ - نرمی اور سہولت کے ساتھ حق کی طرف رجوع کرنا* - قرآن کریم میں ہے - اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ (۷/۱۵۶) - ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں - اَلْهَوْدُ - یہود* - هَادَ - وہ یہودی ہوا - يَتَهَوَّدُ ا - حضرت یعقوب[ؑ] کے ایک بیٹے کا نام تھا* -

سورۃ بقرہ میں ہے اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا.... (۲/۱۱۱) - سوائے ان کے جو یہودی ہوں - اور سورۃ مائدہ میں ہے وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا.... (۵/۶۹) - اور جو لوگ یہودی ہوئے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''موسیٰ[ؑ]'') -

## هود علیہ السلام

قوم نوح کی جانشین، قوم عاد ہوئی (۷/۶۹) - تفصیل عنوان ''نوح[ؑ]'' میں دیکھئے - ان کی طرف ان کے بھائی، حضرت ہود[ؑ] مبعوث ہوئے - (۷/۶۵) - یہ لوگ جسمانی طور پر، مضبوط اور طاقتور تھے - بڑے ڈیل ڈول والے تھے -

*تاج و محیط و راغب -

(۶۹/۷)۔ اور ان کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں (۱۳۴/۲۶)۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی وہ قوم نوحؑ سے آگے تھے ۔ یہ بڑے بڑے مضبوط قلعے بناتے تھے (۱۲۹/۲۶)۔ اور پہاڑوں کی بلندیوں پر یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۱۲۸/۲۶) ۔ اور علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۳۸/۲۹) ۔ لیکن بڑے مستبد اور جبار تھے ۔ غریبوں اور مظلوموں کو اپنے فولادی شکنجوں میں کس کر رکھتے تھے (۱۳۰/۲۶) ۔

حضرت ھودؑ نے انہیں خدا کا وھی پیغام دیا جو اس سے قبل حضرت نوحؑ اپنی قوم کو دے چکے تھے ۔ یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰـهٍ غَيْرُهٗ ۔ ۔ ۔ ۔ (۶۵/۷) ۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا الٰہ اور کوئی نہیں ۔ حسب معمول ، سردارانِ قوم (مترفین کے طبقہ) کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی (۶۶/۷) ۔ اور وہ اس شدت مخالفت میں اس قدر اندھے ہوگئے کہ ان کا علم و بصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا (۳۸/۲۹) ۔ اور تباہ کن آندھی نے انہیں برباد کرکے رکھدیا (۴۲-۴۱/۵۱) ۔ اور ان کی جڑ کٹ گئی (۷۲/۷) ۔ قرآن کریم نے اس قوم کو ”عادِ اولیٰ،، بھی کہا ہے (۵۰/۵۳) ۔

(جو قومیں اس طرح ھلاک ہوئی تھیں، ان کے اعمال اور ان طبعی حوادث میں کیا تعلق تھا ، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں عنوان ”حضرت نوحؑ،، دیکھئے) ۔

## ھ و ر

هَارَ الْبِنَاءَ هَوْرًا ۔ اس نے عمارت کو منہدم کر دیا ۔ فَتَهَارَ ۔ پس وہ منہدم ہوگئی ۔ (لازم و متعدی) ۔ منہدم ہونے اور پھٹ کر گر پڑنے کے لئے اِنْهَارَ بھی آتا ہے ۔ وَ هُوَ هَائِرٌ وَ هَارٍ (اسم فاعل) ۔ تَهَوَّرَ وہ منہدم ہوگیا ۔ تَهَوُّرٌ ۔ کسی چیز کا حوض کے کنارے یا کنویں کے دھانے سے حوض یا کنویں کے اندر گر پڑنا ۔ تَهَوَّرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی معاملہ میں بلا سوچے سمجھے گھس گیا* ۔ یعنی اس میں اس طرح گر گیا جس طرح دریا کا کنارہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے ۔ ایسے تَهَوُّرٌ کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ (۱۰۹/۹) ۔ ایک گرنے والے کنارے کی بالکل آخری حد پر جو اسے لے کر نیچے گر جائے ۔

## ھ و ن

هَانَ ۔ يَهُوْنُ ۔ هُوْنًا ۔ ذلیل ہونا اور هَانَ هَوْنًا سہل اور آسان ہونا ۔ یعنی نرمی اور سہولت اور ذلت و رسوائی دونوں کے لئے یہ مادہ آتا ہے** ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سکون ۔ سکینت و اطمینان یا ذلت کے ہوتے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب انسان اپنے مزاج میں خود ہی ایسی نرمی اور جھکاؤ پیدا کرلے جس میں اسکی سبکی نہ ہوتی ہو تو یہ نرمی اور جھکاؤ محمود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مستبد قوت کسی میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کرے جس میں اسکی ذلت و رسوائی کا پہلو ہو تو یہ مذموم ہوتا ہے **۔ هَوَّنَ الشَّيْءَ وَأَهَانَهُ ۔ کسی چیز کو حقیر سمجھنا ۔ اسکی اہانت کرنا ۔ اَلْهَيِّنُ ۔ ذلیل نیز آسان و سہل ۔ اَلْهَوَانُ وَالْمَهَانَةُ ۔ ضعف اور کمزوری *۔ ذلت و حقارت ***۔

هَيِّنٌ ۔ ساکن اور مطمئن ۔ اِمْرَأَةٌ هَوْنَةٌ ۔ مطمئن اور سہولت کے ساتھ کام کرنے والی باوقار عورت ۔ سَارَ عَلٰى هِيْنَتِهٖ ۔ وہ اپنی عادت کے مطابق نرمی اور سہولت کے ساتھ چلا ۔

سورۃ نحل میں ہے کہ جب ان (بدوؤں) میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر رنج و غم کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ قوم سے چھپتا پھرتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (۱۶/۵۹) ۔ وہ (اس لڑکی کو جس کی پیدائش کی خبر ملی ہے ) ذلت و رسوائی کی خاطر باقی رہنے دے یا اسے مٹی میں دبا دے ۔

سورۃ الفرقان میں جہنم کے متعلق ہے يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (۲۵/۶۹) ۔ اس میں ذلت و رسوائی کا مفہوم ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (۱۹/۹)۔ یہ مجھپر سہل اور آسان ہے ۔ سورۃ نور میں ہے تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۵) ۔ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو حالانکہ قانون خداوندی کی رو سے وہ بہت بڑی بات ہے ۔

سورۃ الفجر میں تنگی رزق کی وجہ سے ذلیل اور کمزور کرنے کے لئے رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) آیا ہے ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۲/۹۰) آیا ہے تو اس کے معنی ہیں ایسی سزا جو ذلیل و رسوا بھی کر دے اور جس سے قوم کی قوت ٹوٹ کر اسمیں ضعف اور کمزوری آ جائے ۔ محکومیت میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں ۔ نیز دوسروں کے آسروں پر جینے والی قوموں میں ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

سورۃ الفرقان میں عبادالرحمٰن کے متعلق ہے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳) ۔ وہ دنیا میں نہایت اطمینان و سکون سے چلتے پھرتے ہیں ۔ نہ ان میں کسی قسم کی افراتفری ہوتی ہے نہ خوف اور گھبراہٹ ۔ اس لئے کہ وہ کمزور اور ذلیل نہیں ہوتے۔ وہ اَعْلَوْنَ ہوتے ہیں (۳/۱۳۸) ۔ سب پر غالب ۔ اگر اس میں صرف رفتار کے انداز کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میانہ روی سے چلتے ہیں اور یونہی اکڑتے نہیں پھرتے (۳۱/۱۷۰۱۸) اور اگر یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کے معنی زمین میں غلبہ و حکومت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت قہر اور استبداد کی حکومت نہیں ہوتی ۔

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سورۃ الفجر میں ہے کہ جب انسان پر رزق کی تنگی کی وجہ سے ذلت و خواری کا عذاب آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) ''میرے رب نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا'' ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا ۔ ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے سرفراز ہوتا ہے اور اعمال ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تمہارے پاس رزق کی فروانی تھی تو لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۷۰۱۸) ۔ تم ان لوگوں کی جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے اور جن کی چلتی گاڑی رک جاتی تھی ان کی روٹی کے انتظام کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے۔ تم وراثت کا مال سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور چاروںطرف سے مال اکھٹا کرتے چلے جاتے تھے۔ (۸۹/۱۹۰۲۰) ۔ یہ تھا تمہارا وہ غلط معاشرہ جس کی وجہ سے تم پر رزق کی تنگی آئی اور تم ذلیل و خوار ہوگئے ۔

## ھ و ی

هَوَى ۔ يَهْوِیْ ۔ هَوِيًّا ۔ اوپر سے نیچے گرنا ۔ هَوَى الشَّيْءُ ۔ چیز اوپر سے نیچے کی طرف گری ۔ هَوَتِ الْعُقَابُ تَهْوِیْ هَوِيًّا ۔ عقاب شکار پکڑنے کے لئے نیچے کی طرف جھپٹا ۔ اَلْمَهْوَاةُ ۔ جو (فضا یا خلا) نیز دو پہاڑوں کے درمیانی نشیبی علاقے کو کہتے ہیں* ۔ اَلْهَوِیُّ ۔ کان میں بھن بھن کی آوازیں آنا** ۔ هَوَاءٌ ۔ ہر خالی چیز کو کہتے ہیں بالخصوص زمین و آسمان کے درمیان خالی فضا کو ۔ نیز بزدل کو بھی کہتے ہیں* ۔ الْهَوَى ۔ انسانی جذبہ اورخواهش کو کہتے ہیں ۔ یہیں سے هَوِيَهٗ ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یَہْوَاہُ ۔ ھَوِیٌ کے معنے چاھنے، محبت کرنے یا پسند کرنے کے آتے ھیں ۔ اِسْتَھْوٰی ۔ اِسْتِہْوَاءٌ ۔ (۶/۷۱) ۔ اس نے اسے گرانا چاھا ۔ اس کی عقل کو لے اڑا ۔ یا اس کی خواھش کو اس کے لئے مزین کیا ۔ ھَوٰی صَدْرُہٗ یَھْوِیْ ۔ اس کا سینہ خالی ھو گیا* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے (۱) خالی ھونا اور (۲) گرنا بتائے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے وَ النَّجْمِ اِذَا ھَوٰی (۵۳/۱) ۔ (طلوع ھونے والا) ستارہ اس پر شاھد ھے جبکہ وہ نیچے کی طرف جا رھا ھو ۔ سورۃ حج میں مشرک کے متعلق ھے ۔ اَوْ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ (۲۲/۳۱) ۔ اسے ھوا اڑا کر کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے ۔ اس میں نیچے گرانا اور دور پھینک دینا، دونوں آجاتے ھیں ۔ سورۃ النجم میں ھے ۔ وَ الْمُؤْتَفِکَۃَ اَھْوٰی ۔ (۵۳/۵۳) ۔ اس نے تباہ شدہ بستیوں کو خالی کر دیا ۔ یا نیچے گرا دیا ۔ سورۃ ابراھیم میں ھے ۔ وَ اَفْئِدَتُھُمْ ھَوَاءٌ (۱۴/۴۳) ۔ ان کے دل جرأت و بسالت سے خالی ھو رھے تھے ۔

سورۃ ابراھیم میں حضرت ابراھیمؑ کی دعا ھے ۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ (۱۴/۳۷) ۔ اور ایسا کردے کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ھو جائیں ۔ سورۃ بقرہ میں لَا تَھْوٰی اَنْفُسُکُمْ کے بعد ھے اِسْتَکْبَرْتُمْ (۲/۸۷) ۔ یعنی جن رسولوں کو تمھارا دل پسند نہیں کرتا تھا تم ان سے انکار و سرکشی اختیار کرلیتے تھے ۔

سورۃ النجم میں وحی کے مقابلہ میں انسان کے ذاتی خیالات کو ھَوٰی کہا ھے ۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۳-۴) ۔ یہ قرآن کریم اس رسول کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ وحی ھے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ھے ۔ سورہ بقرہ میں ھے وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ . . . (۲/۱۲۰) ۔ اس وحی کے بعد اگر تم ان لوگوں کے ذاتی خیالات کا اتباع کروگے تو . . . .

اس سے ظاھر ھے کہ قرآن کریم انسانی جذبات و خواھشات کے خلاف نہیں (۳/۱۴) ۔ وہ ان جذبات و خواھشات کے خلاف ھے جو وحی کے تابع نہ رکھے جائیں ۔ وَ اِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآئِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۶/۱۲۰) ۔ ان میں سے بیشتر وہ ھیں جو اپنے ذاتی خیالات کی بناء پر جنھیں وحی(علم) کی سند حاصل نہیں ھوتی ، لوگوں کو صحیح راستے سے بھکا دیتے ھیں ۔

*تاج ۔

یہی وہ جذبات و خیالات ہیں جو انسان کو شرف انسانیت کی بلندیوں سے حیوانی سطح کی پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں ۔ وَمَنْ یَحْلِلْ عَلَیْهِ غَضَبِی فَقَدْ هَوَیٰ (۲۰/۸۱) ۔ اور جو غلط راستے پر چلکر همارے انعامات سے محروم رہ گیا وہ پستیوں میں جا گرا ۔ وحی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے ۔ لیکن انسان اس راستے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ جاتا ہے اوراس طرح ذلتوں کی پستیوں میں جا گرتا ہے ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰکِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (۷/۱۷۶) ۔ اگر وہ همارے قانون مشیت کے مطابق چلتا تو هم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے ۔ لیکن وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا ۔ یعنی (وحی کو چھوڑ کر) اپنے ذاتی خیالات و مفادات کے پیچھے لگ گیا ۔

یہی وہ پستیوں کی زندگی ہے جسے هَاوِیَةٌ کہا گیا ہے (۱۰۱/۹-۱۱) ۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان کا دل و دماغ کچھ کام نہ دے اور وہ پریشانیوں اور ذلتوں میں مارا مارا پھرے ۔ گری ہوئی حالت ۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں نَارٌ حَامِیَةٌ یعنی بھڑکتی آگ ۔

لہذا اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے ۔ اور اگر وہ سرکش و بے باک ہو جائیں (جسے شیطان کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ جہنم کی پستیاں ہیں ۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم کی رُو سے انسانی جذبات کوئی قابل نفرت چیز نہیں کہ جنہیں دبانے یا فنا کر دینے میں ''روحانی ترقی'' کا راز مضمر ہے ۔ بالکل نہیں ۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے (جذبہ) اور انسانی سطح زندگی کے تقاضے میں (Tie) آپڑے تو اس وقت اسے اس بلند تقاضے کی خاطر پست تقاضے کو قربان کر دینا چاهئے ۔ ''انسانی سطح زندگی کے تقاضے'' ان مستقل اقدار سے وابستہ ہیں جو وحی کی رُو سے ملتی ہیں ۔ انسانی جذبات کو وحی کی روشنی کے تابع رکھنا، یہ ہے وجہ بالیدگی شرف انسانیت ۔ یا انسانی ذات کی نشو و نما (Development) کا طریق ۔ جب دونوں میں تصادم (Clash) نہ ہو تو انسانی جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں ۔

## هی (ضمیر)

هِیَ ۔ واحد مؤنث غائب ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ هِیَ امْرَاَةٌ وہ ایک عورت ہے ۔ قرآن کریم میں ہے هِیَ حَیَّةٌ (۲۰/۲۰) ۔ وہ سانپ ہے ۔

## ھ ی أ

ھَیَّاَ الْاَمْرَ تَھْیِئَۃً ۔ اس نے معاملہ کو درست کر دیا ۔ تیار کیا ، ھموار کیا *۔ سورہ کہف میں ہے وَ ھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸/۱۰) ۔ ھمارے لئے ھمارے معاملہ کی صحیح صورت مہیا کر دے ۔ اَلْھَیْئَۃُ ۔ کسی چیز کی حالت اور کیفیت ۔ شکل و صورت ***۔ راغب نے کہا ہے کہ ہیئت محسوس بھی ہو سکتی ہے ( یعنی شکل و صورت ) اور معقول بھی **۔ ( یعنی کسی کی ذھنی ، قلبی یا دوسری کیفیت جو محسوس شکل میں سامنے نہ آئے لیکن ہم بہ چشم بصیرت اسے دیکھ سکیں ) ۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ (۳/۴۸) ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ”میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند شکل بنا دوں گا“ ۔ اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال فشاں ہو جاؤ گے ۔ تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی ۔ یہاں ہیئت محسوس نہیں بلکہ معقول مراد ہے ( یعنی جسے عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکے ) ۔

## ھ ی ت

ھَیْتَ لَکَ ۔ فراء نے کہا کہ یہ حوران کا لغت ہے جو کسی طرح مکہ میں پہنچ گیا اور وہاں کے لوگ اسے بولنے لگ گئے ۔ بعض کے نزدیک یہ عبرانی ھَیْتَالَخْ سے معرب ہے ****۔ اس کے معنی ہیں ادھر آؤ ۔ جلدی آؤ ۔ ھَیْتَ کلمۂ تعجب بھی ہے ۔ مجاھد نے کہا ہے کہ یہ اکسانے کے لئے بولا جاتا ہے *۔

اَلْھَیْتُ ۔ گہری نشیبی زمین *۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی چیخنا اور ھَیَّتَ بِہٖ کے معنی اسے ”چلا کر پکارا“ لکھے ہیں ۔

سورہ بقرہ میں ہے ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ (۲/۱۱۱) ۔ اپنی دلیل پیش کرو ۔ جلدی سے سامنے لاؤ ۔ بعض اہل لغت نے ھَاتُوْا کو ( ھ ۔ ت ۔ و ) یا ( ھ ۔ ت ۔ ی ) کے تابع بھی لکھا ہے ۔ خلیل نے کہا ہے کہ ھَاتِ دراصل آتیٰ یُؤْتِیْ سے ہے ۔ اس کے الف کو ھاء سے بدل لیا گیا ہے ۔ سورہ یوسف میں ہے ھَیْتَ لَکَ (۱۲/۲۳) ۔ ادھر آؤ ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****لین ۔ بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل ۔

# ھ ی ج

اَلْھَیْجُ ۔ حرکت میں آنا ۔ حرکت میں لانا ۔ ( لازم اور متعدی ) ھَاجَ الْاِبِلَ ۔ اس نے اونٹوں کو رات کے وقت (جب وہ سکون میں تھے) حرکت دی اور چلایا*۔ ھَاجَ الْبَحْرُ ۔ سمندر میں اضطراب اور ھیجان پیدا ھو گیا**۔ ھَاجَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ پیاسے ھو گئے ۔ یہیں سے ھَاجَ النَّبْتُ کے معنی ھیں سبزیاں خشک ھو گئیں **۔ ھَاجَ الْبَقْلُ ۔ سبزی کا لمبا ھونا اور زرد پڑنا اور سوکھنا *۔ اَلْھَائِجَۃُ ۔ وہ زمین جس کی سبزیاں زرد ھو گئی ھوں یا خشک ھو چکی ھوں*۔ قرآن کریم میں کھیتی کے متعلق ھے ۔ ثُمَّ یَھِیْجُ (۲۱/۳۹) ۔ پھر وہ خشک ھو جاتی ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) برانگیختہ ھونا اور (۲) پودوں کا خشک ھو جانا ھیں ۔

# ھ ی ل

ھَالَ عَلَیْہِ التُّرَابَ ھَیْلاً وَ ھَیَّلَہٗ وَاَھَالَہٗ ۔ اس نے اس پر مٹی ڈالی ۔ فَانْھَالَ وَ تَھَیَّلَ پس مٹی پڑ گئی ، اوپر سے نیچے گر گئی ۔ رَمْلٌ ھَالٍ وَ اَھْیَلُ ۔ ریگ رواں ۔ اَلْھَیْلُ وَ الْھَالُ وہ ریت جو گر جائے ۔ کَثِیْبٌ اَھْیَلُ ۔ ریت کا وہ ٹیلہ جس کی ریت گر جائے ۔ اَلْھَیُوْلُ وہ منتشر ذرات جو دوپہر کو روشندانوں میں اڑتے نظر آتے ھیں ۔ اَلْھَالَۃُ چاند کے گرد حلقہ *۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس لفظ کے معنے کسی چیز کو جسے ناپا جاسکے بغیر ناپے دے دینے کے ھیں ۔ یعنی اسے یونہی دھکیل دینا ( جس طرح بہنے والی ریت یونہی آگے بڑھ جاتی ھے )۔

قرآن کریم میں ھے یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّھِیْلاً (۱۴/۷۳) ۔ جس دور ( یا زمانے) میں زمین اور پہاڑ کانپ اُٹھینگے ۔ اور پہاڑ ایسے ھو جائینگے جیسے ریت کا وہ تودہ جو خود بخود ڈھیلا پڑ کر بہ گیا ھو ۔ قرآنی انقلاب کے وقت بڑے بڑے سرداران قوم کی عظمت و اقتدار کے ختم ھو جانے کی کیسی عمدہ تشبیہ ھے ۔ یعنی دکھائی تو وہ ایسے دینگے گویا محکم اور مضبوط پہاڑ ھیں ، لیکن درحقیقت ان کی قوت اور استحکام ختم ھو چکے ھوں گے ۔ بس یوں سمجھئے جیسے دریا کے کنارے ریت کا تودہ جو خود بخود پھسل کر نیچے گرتا جا رھا ھو ۔ غلط بنیادوں پر اٹھے ھوئے تمدن

*تاج ۔ **محیط ۔

کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ زمانے کے تقاضے کے دھچکوں کو سہار نہیں سکتا اور جونہی صحیح انقلاب سے اس کا سامنا ہوتا ہے ریگ رواں کی طرح نیچے آگرتا ہے۔

# ھ ی م

الھُیَامُ۔ سخت ترین پیاس۔ ایک بیماری جسکی وجہ سے اونٹ اس طرح پیاسا ہوتا ہے کہ اسے سیرابی نہیں ہوتی**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی سخت پیاس کے لکھے ہیں۔

اَلْاَھْیَمُ۔ وہ اونٹ جسے پیاس کی بیماری لگ جائے اور کسی طرح اس کی تشنگی دور نہ ہو سکے۔ مؤنث ھَیْمَآءُ ہے۔ اور جمع ھِیْمٌ*۔ قرآن کریم میں ہے فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْھِیْمِ۔ (۵۶/۵۵) "تم پیوگے جسطرح جھوٹی پیاس کے مارے ہوئے اونٹ پیتے ہیں"۔ رَجُلٌ ھَیْمَانُ۔ پیاسا آدمی۔ رَجُلٌ ھَائِمٌ۔ وَ ھَیُوْمٌ۔ متحیر اور حیران آدمی۔ ھَامَ فِی الْاَمْرِ یَھِیْمُ۔ وہ اس معاملہ میں حیران اور پریشان رہا۔ اَلْھَیَامُ۔ وہ ریت جسے ہاتھ میں لیا جائے تو وہ ٹھہرے نہیں بلکہ برابر نیچے کی طرف پھسلتی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی خشک ریت کے ہیں۔ اَلْھَیْمَآءُ۔ لق و دق صحرا جس میں پانی نہ ہو*۔

ھَامَتِ النَّاقَۃُ تَھِیْمُ۔ اونٹنی چرنے کے لئے جدھر کو جی چاہا منہ اٹھا کر چلدی۔ لَیْلٌ اَھْیَمُ۔ وہ رات جسمیں ستارے نہ ہوں (اور اس لئے مسافروں کو راستہ نہ مل سکے)۔ اَلْھِیْمُ۔ ان ریتلے میدانوں کو بھی کہتے ہیں جو پانی کو پی جائیں**۔

ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسکا مفہوم کیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شاعری ایک پیام بر کے شایان شان نہیں ہوتی (۳۶/۶۹)۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر)۔ ایک رسول، خدا کا انقلاب آفریں پیغام لیکر آتا ہے۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اسکا ہر قدم اُسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کبھی ادھر نکل گیا، کبھی اُدھر۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانون خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ فِی کُلِّ وَادٍ یَھِیْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵)۔ وہ ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے شدید پیاس کی

---

*تاج۔ **تاج و محیط و ابن فارس۔

بیماری مارے مارے پھرا رہی ہو ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولا نگاہوں میں جانکلتا ہے ۔ اس کا یہ سارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کہیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے ۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں ۔ شاعر ، جذبات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے ، ایک پیاسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتی اور اسکی پیاس بجھتی ہی نہیں ۔ اس کے سفر کی راہیں تاریک ہوتی ہیں جن میں راستہ دکھانے والے ستارے کہیں نہیں ہوتے ۔ برعکس اس کے ایک پیغامبر ایک متعین منزل کی طرف واضح ، سیدھے اور توازن بدوش راستے پر نہایت جزم و یقین اورسکون و اطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے ۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع ۔ مسلمان کے سپرد "رسالت" کا فریضہ ہوا تھا ۔ یعنی خدا کے دئے ہوئے پیغام پر خود بھی چلنا اور اسے دوسروں تک بھی پہنچانا ۔ لیکن یہ اس راستے کو چھوڑ کر اسطرح "شاعری" میں گم ہوا کہ اب اسے نہ راستے کا پتہ نشان ملتا ہے ، نہ منزل کا ۔ ایک پیاسے اونٹ کیطرح زندگی کے لق و دق صحرا میں مارا مارا پھر رہا ہے اور کہیں اپنی تشنگی کی سیرابی کا سامان نہیں پاتا ۔ اس لئے کہ اسکی پیاس بیماری ہوتی ہے ، سچی پیاس نہیں ہوتی ۔ کسقدر عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی افسوسناک ہے یہ روش ؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ اُمت ( جو شاعروں کی قوم بنکر رہ گئی ہے) راستہ دکھانے والا ضابطہ حیات ہر وقت بغل میں دابے ہوئے ہے ۔ چشمہ شیریں پاؤں کے نیچے اور تلاشِ آب ، صحراؤں کے سراب میں ۔ اب ان کی پیاس کیسے بجھے ؟

# ھ ی م ن

ھَیْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰی فِرَاخِہٖ ۔ کے معنی ہوتے ہیں پرند نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر پروں کو پھیلایا ، اور لٹکایا ۔ ھَیْمَنَ عَلٰی کَذَا ۔ وہ اس کا محافظ و نگران ہوا *۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تمام کتب سابقہ کا مُھَیْمِنٌ کہا ہے (۵/۴۸) ۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں ۔ خود اللہ تعالیٰ بھی اَلْمُھَیْمِنُ ہے (۵۹/۲۳) ۔ یعنی جو کائنات کی اسطرح حفاظت کرتا ہے جسطرح بچوں کی ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے ۔

---

*تاج۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ ھاء ۔ میم ۔ نون کوئی مادہ نہیں ہے ۔ اَلْمُهَیْمِنُ دراصل آمَنَ سے ہے ، جس کا ہمزہ ھ سے بدل گیا ہے ۔

## ھَیْهَاتَ

اَلْهَیَّۃُ ۔ وہ جسے اس کے میلے کچیلے کپڑوں کی وجہ سے ایک طرف ہٹا دیا جائے ۔ هَیْهَاتَ ۔ ایک کلمہ ہے جسکے معنی ''دور ہؤا'' کے ہوتے ہیں*۔ یہ اسم فعل ہے ۔ یعنی ایسا اسم جسکے معنی ماضی کے (یا کبھی امر کے) ہوتے ہیں ۔ اور ایسا فعل جس کی گردان نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم میں منکرین حیاتِ آخرت کی زبان سے کہا گیا ہے هَیْهَاتَ هَیْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ($\frac{۲۳}{۳۶}$) ۔ کس قدر بعید (از قیاس) ہے وہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ ضرور واقع ہو کر رہیگی) ۔ یعنی وہ اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں کہ یہ جو رسول تم سے کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے تو یہ کسقدر بعید از قیاس ہے !

---

*تاج ۔ محیط و راغب ۔

# ی

## ی (ضمیر)

ی۔ ضمیر مجرور متصل ہے۔ واحد متکلم (مذکر اور مؤنث دونوں) کیلئے آتی ہے۔ غُلَامِیْ۔ میرا غلام۔ نیز ضمیر منصوب متصل۔ جیسے یَعْبُدُوْنَنِیْ۔ کبھی یہ ی مفتوح بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے نِعْمَتِیَ الَّتِیْ (۲/۳۰)۔ اور کبھی حذف بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً وَلِیَ دِیْنِ (۱۰۹/۶)۔ میرے لئے میرا دین (یہاں دِیْنِ کے بعد ''ی'' حذف ہوگئی اور ''ن'' پر صرف زیر رہ گیا۔)

## یَا (حرف)

یَا۔ حرف نداء۔ پکارنے کے لئے آتا ہے۔ ''اے'' کے معنوں میں۔ یَاأَرْضُ ابْلَعِیْ (۱۱/۴۴) اے زمین تو نگل لے۔ یہ حرف نداء عموماً حذف بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْداً (۲۱/۸۹)۔ (اے) میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑیو۔ (یہاں رَبِّ سے پہلے یَا محذوف ہے) یَا کے بعد أَیُّهَا کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے۔ جیسے یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا (۲/۲۸)۔ اے ایمان والو!۔

## ی ا س

أَلْیَأْسُ۔ ناامید اور مایوس ہونا۔ یَئُوْسٌ۔ یَئُوْسٌ۔ ناامید ہوجانے والا۔ اِسْتَیْأَسَ۔ ناامید ہو گیا*۔ سورہ یوسف میں ہے فَلَمَّا اسْتَیْأَسُوْا مِنْهُ (۱۲/۸۰) ''جب وہ اس سے مایوس ہو گئے''۔ اور وَلَا تَیْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهٗ لَا یَیْأَسُ ..... (۱۲/۸۷)۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا۔

سورہ رعد میں ہے أَفَلَمْ یَیْأَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا .... (۱۳/۳۱) اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اسکے معنی أَفَلَمْ یَعْلَمْ کے ہیں۔ یعنی کیا

*تاج۔

انھوں نے اسباب کو جان نہیں لیا*۔ ابن فارس نے یہ معنی بھی بنیادی لکھے ھیں ( یعنی جاننا ) ۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ یہ معنی مجازی ھیں**۔ سورہ ممتحنہ میں ہے قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ . . . . . (۶/۱۳) ۔ یہاں اس کے معنی انکار کرنے کے ھیں ۔ یعنی وہ انکار جو ناامیدی کا نتیجہ ھوتا ہے ۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو اوپر درج کی گئی ہے ۔ اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملیگا ۔ آیت ہے وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷)۔ ”اللہ کی رحمت سے نا امید مت ھو ۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ھوتا“ ۔ اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ( نیز ۴۹/۴۳)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاھتا ۔ مومن وہ ہے جو علٰی وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت ، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے ۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ھوتا ہے ۔ اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ھونے دیتا ۔ وہ سنبھلتا ہے ۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرکے ، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے ۔ یہ ہے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ھونے کا مفہوم ۔ ناامید وہ ھوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربۃً اختیار کرتا ہے ۔ جب اُسے ناکامی ھوتی ہے تو وہ وھیں رک جاتا ہے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نا امید ھو جاتا ہے ۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ھو وہ کبھی نا امید نہیں ھوتا ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نا امیدی اور ابلیسیت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے ۔ ( دیکھئے عنوان ب ۔ ل ۔ س ) ۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی ۔ اس کے لئے کہا ہے کہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۔ تم دفع مضرت اور جلب منفعت ، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو ۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷/۵۶) ۔ یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ھوتی ہے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ھیں ۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے ۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی ۔ لیکن

*تاج ۔ **راغب ۔

وہ ہمت نہیں ہارتا ۔ دل نہیں چھوڑتا ۔ وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے ۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا ۔ یہ شخص '' خدا کی رحمت '' سے مایوس نہیں ۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اسوقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں ، تو اس پر مایوسی چھا جائیگی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے ، جسے خود اعتمادی حاصل ہے ، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے پرامید رہتا ہے ۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا ۔ جو اس سے انکار کر دیتا ہے ، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس پر (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خودکشی تک لے جاتی ہے ۔ خودکشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی ۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں ۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے ۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے ۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی ۔

مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ۔ وہ یہ کہیگا کہ اس کے بعد سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا ۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار — اور اس کے بعد مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے ۔ علاوہ بریں ، انسانی ذات پر ایمان سے انسان ، بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں ۔ اسی کی قوت سے وہ طبیعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ حتکہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہوجائیگا لیکن اس کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آئیگی ۔

آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے ۔

## یَاجُوجَ وَمَاجُوجَ

وہ اقوام جن کی یورشوں سے حفاظت کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنا کر دی تھی (۱۸/۹۴) تفصیل عنوان (ا ۔ ج ۔ ج) کے تحت دیکھئے۔

# یَاقُوْتٌ

اَلْیَاقُوْتُ۔ یہ فارسی لفظ ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سخت اور صاف شفاف جواہرات جن کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ عموماً سرخ رنگ مراد ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے کَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸)۔ گویا کہ وہ (مؤنث) یاقوت اور مرجان ہیں۔

# یٰلَیْتَ

یہ حرفِ ندا (یا) اور لَیْتَ کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں "اے کاش" (دیکھئے یَا اور لَیْتَ)۔

# ی ب س

یَبِسَ۔ کسی مرطوب چیز کا خشک ہو جانا۔ اَلْیَبْسُ۔ وہ چیز جو پہلے تر ہو اور پھر خشک ہو جائے۔ شَاۃٌ یَبَسٌ۔ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن خشک ہو جائیں اور وہ دودھ دینا بند کر دے*۔ اَلْیَبَسُ۔ وہ جگہ جہاں پانی ہو اور پھر جاتا رہے۔ تورات میں اَلْیَابِسَةُ خشکی کے لئے آیا ہے بمقابلہ بَحْرٌ کے**۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اسوقت خشک ہے۔

سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹)۔ کائنات کی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں (یا خشک و تر پھل ایسا نہیں) جس کے لئے ضروری قانون اور قاعدہ صحیفہ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو۔

# ی ت م

اَلْیُتْمُ۔ اکیلا اور تنہا رہ جانا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے کہ اَلْیَتِیْمُ اس ریتیلی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے ارد گرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اَلْمَیْتَمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو۔ راغب کے نزدیک ہر منفرد

---

* تاج۔ ** محیط۔

اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے*۔ دُرَّۃٌ یَتِیْمَۃٌ ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی ہو۔

بن باپ کے بچے کو بھی یَتِیْمٌ اسلئے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حرالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یُتْمٌ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ یَتِیْمٌ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ اس کے برعکس لڑکی اُسوقت تک یَتِیْمَۃٌ کہلاتی ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے ، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں یَتِیْمٌ ان بچوں کو کہتے ہیں جنکی ماں نہ رہے اسلئے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے ۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی ۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مر جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے ۔ مُنْقَطِعٌ یا عَجِیٌّ کہتے ہیں ۔ اگر ماں باپ دونوں مرجائیں تو اسے لَطِیْمٌ کہتے ہیں ۔ (یَتِیْمٌ کی جمع اَیْتَامٌ اور یَتَامٰی دونوں آتی ہیں ) ۔ اِمْرَاَۃٌ مُوْتِمٌ ۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے یتیم ہو جائیں۔ یعنی جس کا شوہر مر جائے*۔ لسان العرب میں ہے کہ یَتِیْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں یَتٰمَی النِّسَآءِ ($\frac{۴}{۱۲۷}$) ایسی ہی عورتوں کے لئے آیا ہے ۔

یَتَامٰی کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ ۔ ۔ ($\frac{۴}{۳}$) ۔ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا خدشہ ہو) کہ تم "یتامٰی" کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے ۔ ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے ۔ تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو ۔ دو ۔ تین تین ۔ چار چار تک سے شادی کر لو ۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں ۔ بہت سے بچے لاوارث رہ گئے ۔ بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا ۔ یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا ۔ یہ مشکل اس لئے تھی کہ

*تاج و محیط و راغب ۔

(۱) قرآن کریم کا عام قانون ایک عورت سے شادی کرنے کا تھا (فَوَاحِدَۃً - ۳/۴)

(۲) مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں ، نہ مشرکین سے - نہ اہل کتاب سے - انہیں بہرحال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی - اور مسلمان مردوں کی تعداد اسقدر کم ہو گئی تھی -

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (اَلنِّسَآءَ - ۳/۴) جو اسطرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کر - اور خواہ نا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) - حسب پسند ، ایک سے زیادہ سے نکاح کرکے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو - یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے - قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے - اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے -

یَتِیمٌ - یَتَمَا کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا - قاصر ہو جانا اور تھک جانا - درماندہ ہو جانا - بھی ہوتے ہیں - نیز یَتْمٌ کے معنی فکر و غم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی - اسلئے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے - اَلْیَتَمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں* -

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے ، اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ (۸۹/۱۷) - ان آیات میں یَتِیْمٌ سے مراد وہی نہیں جنکے باپ مر چکے ہوں - اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں - جو بے یار و مدد گار ہوں - لہذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے - اس کا کوئی مدد گار نہیں - اسکی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے - اسکا کوئی مونس و غمخوار اور کوئی یار و مدد گار نہیں - وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے ، کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا - قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے - اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں - یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرمؐ

*تاج و محیط و راغب -

سے کہا کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْماً فَاٰوٰی (۹۳/۶) ۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا ۔ اس سے ظاھر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے ۔ اور ایسے شخص کے لئے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرہ کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا ہو ۔

## یحییٰ علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰؑ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (۶/۸۵) ۔ آپ حضرت زکریاؑ کے بیٹے تھے (۱۹/۷) ۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوتِ فیصلہ کے مالک (۱۹/۱۲) اور صفاتِ حسنہ سے آراستہ (۱۹/۱۳-۱۵) ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہکر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰؑ ہی ہیں ۔ انجیل (لوقا) میں "یوحنا" کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاھر ہونے تک جنگلوں میں رہا (۱/۸۰) ۔

انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا ۔

رینان نے اپنی کتاب (Life of Jesus) میں لکھا ہے کہ "یوحنا" کی تعلیم کا مرکز (Judea) تھا لیکن اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور حضرت عیسیٰ ان سے آ کر ملے تھے ۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ "یوحنا" اور حضرت عیسیٰؑ نے فلسطین کے صحرا میں ایک عجیب انقلاب انگیز نظام قائم کیا تا آنکہ ۲۹ء میں "یوحنا" کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی ۔

## ی د ی

اَلْیَدُ ۔ ھاتھ کو کہتے ھیں ۔ مؤنث استعمال ہوتا ہے ۔ اسکی جمع اَیْدٍ ہے ۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اسقدر متعدد معانی میں ہوتا ہے جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ۔ جیسے ہمارے ہاں "ھاتھ" کا استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً جاہ اور وقار ۔ قوت و اقتدار ۔ غلبہ و تسلط ۔ ملکیت ۔ مددگار ۔ امداد اور فریاد رسی ۔ احسان و انعام ۔ حفاظت و صیانت ۔ حذاقت و مہارت ۔ دوسری طرف یہ لفظ

ندامت وشرمندگی۔ ذلت و انقیاد کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام کے متعلق ہے کہ وہ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵) ۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کے مالک۔ دوسری طرف ان کے مخالفین کے متعلق کہا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) انہیں بات کرنے سے روک دیا جائے۔ ابن قتیبہ نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں***۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئیگا سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی کئے جائینگے۔ قرآن کریم میں بَيْنَ يَدَيْهِ کا محاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے*۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۲/۹۷) کہا ہے۔ لہذا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کے معنی ہیں '' جو اس کے سامنے ہے ''۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مصدّق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض، نزول قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مصدق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔ ''مصدق'' کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ص د ق) ۔

سورۂ ذاریٰت میں ہے وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ (۵۱/۴۷) ۔ ہم نے آسمان (فضائی کروں یا خارجی کائنات) کو قوت و اقتدار کے ساتھ بنایا ہے۔ [ نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ی ۔ د ]

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں عَنْ يَدٍ (۹/۲۹) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے**۔

سورہ فرقان میں ہے يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ (۲۵/۲۷) اس کے معنی، غم و غصہ میں دانتوں سے ہاتھ چبانے کے ہیں۔ اعمالِ انسانی کے متعلق بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ (۲/۹۵) کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود

---

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ (بحوالہ ۔ غریب القرآن میرزا ابوالفضل)

***القرطین ج/۱ صفحہ ۲۳۵

انسان کے ھیں ۔ سورہ بقرہ میں ھے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (۲/۱۹۵) اس کے معنی یہ ھیں کہ اپنے آپ کو اپنے ھاتھوں ھلاکت میں نہ ڈالو ۔ سورہ حجرات میں ھے لَا تُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۴۹/۱) اس سے مراد احکام اور فیصلے ھیں ۔

(سَارِقٌ کے قطع یَد کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ط ۔ ع ۔ اور یَدٌ بَیْضَاءُ کے لئے دیکھئے عنوان ب ۔ ی ۔ ض اور ض ۔ م ۔ م ) ۔

## ی س ر

اَلْیَسَرُ ۔ اَلْیَسْرُ ۔ نرمی ۔ اَلْیُسْرُ ۔ سہولت ۔ آسانی ۔ فراخی ۔ کشائش آسودگی، تونگری ۔ معیشت کی طرف سے فارغ البالی ۔ بہتات ۔ (عُسْرٌ بمعنی تنگی کی ضد ھے )* ۔ یَسَرَ و یَسُرَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ آسان اورسہل ھوا ۔ یَسَّرَ ۔ اس کام کو آسان یا سہل کر دیا ۔ تَیَسَّرَ واسْتَیْسَرَ ۔ آسان ھوا ۔ بآسانی مہیا ھؤا * ۔ (۲/۱۹۶ ؛ ۷۳/۲۰) ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کھل جانا اور ھلکا پھلکا ھونا لکھے ھیں ۔ اَلْیَسَارُ ۔ بایاں ھاتھ ۔ بائیں جانب (یَمِیْنٌ کی ضد ھے) * ۔ اَلْیَسِیْرُ والْمَیْسُوْرُ ۔ آسان ۔ سہل ۔ اَلْیَسِیْرُ ۔ تھوڑی چیز ** ۔ اَلْمَیْسَرَۃُ وَالْیَسَارُ ۔ تونگری ۔ آسودگی ۔ غنی ** ۔ (۲/۲۸۰) ۔ اَلْمَیْسِرُ ۔ قمار ۔ جوا ۔ وہ اونٹ جو جوئے میں ھارا یا جیتا جاتا تھا * ۔

قرآن کریم میں یُسْرٌ بمقابلہ عُسْرٌ آیا ھے (۲/۱۸۵) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں ھے ۔ فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا (۱۷/۲۸) ۔ ان سے نرمی سے بات کرو ۔ ایسی بات جو انہیں گراں نہ گذرے ۔ سورہ احزاب میں یَسِیْرًا (۳۳/۱۴) کے معنی ھیں کم از کم ۔ بہت تھوڑے ۔ قلیل تعداد میں ۔ " کم وقت کے لئے یا کم تعداد میں " دونوں معنی ھو سکتے ھیں ۔

سورہ بقرہ میں خَمْرٌ اور مَیْسِرٌ کے متعلق ھے فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (۲/۲۱۹) ۔ مَیْسِرٌ یُسْرٌ سے ھے جسکے بنیادی معنی آسانی ھیں ۔ اگرچہ عربوں میں مَیْسِرٌ ھر قسم کے جوئے کو کہتے ھیں ۔ اس جوئے کو بھی جو تیروں سے ایک خاص طریق سے کھیلا جاتا تھا اور جس میں اونٹ کے گوشت کے حصے بخرے کئے جاتے تھے ۔ لیکن اس کے مفہوم کو اسکے بنیادی معانی کے پیش نظر مقید نہ رکھا جائے تو ھر وہ مال جو انسان کو آسانی سے ھاتھ آجائے مَیْسِرٌ ھوگا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

اسکی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے (دیکھئے عنوان ا - ث - م) اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس روپے سے حاصل ہوتے ہیں - اسی لئے اس قسم کی دولت کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ کہکر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے - (۵/۹۰) - اور اسے قرآن کریم کے نظام صلٰوۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے (۵/۹۱)- قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دے (۲/۲۱۹) - ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دیگی اور اسطرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائیگی، جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمانے کا اہل ہی نہیں رہتا - اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے - جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے - لہذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت و مشقت) ہاتھ آجائے قرآنی تعلیم کی روح کے مطابق مَیْسِر میں داخل ہے - بالخصوص عصر حاضر کی "تجارت" جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت میسر ہے - اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی میسر ہے - اس میں ہر سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے -

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو - اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴/۵) - جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتیں جو صحیح خوشگواریوں کا موجب بنتی ہیں - البتہ اسے وہ یُسْرٌ حاصل ہوجاتا ہے جو اِثم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے -

## یعقوب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ - اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے - اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر زمرۂ انبیائے کرامؑ میں

کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۳۶) ۔ آپ کا لقب اِسْرَائِیْل (یعنی مردِ خدا) تھا ۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی ۔ قرآن کریم نے بھی آپ کو اس لقب سے یاد کیا ہے ۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ ۔ ۔ ۔ ۔ (۳/۹۲) ۔ ''سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا'' ۔ اور سورہ مریم میں ہے مِنْ ذُرِّیَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْرَائِیْلَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۹/۵۸) ۔ ذریتِ ابراھیم اور اسرائیل سے'' ۔

حضرت یوسف ؑ آپ کے بیٹے تھے ۔

## یَعُوْق

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ قبیلہ بنو ھمدان اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتا تھا ۔

## یَغُوْث

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ خود عرب میں قبیلہ بنو مراد کے لوگ اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے ۔

## یَقْطِیْن

اَلْیَقْطِیْنُ ۔ وہ بیل جو زمین پر پھیل جائے ۔ جیسے خربوزہ ، تربوز ، کدو کی بیلیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یَقْطِیْنٌ کدو کی بیل کو کہتے ھیں ۔ نیز اَلْیَقْطِیْنَۃُ کدو کو کہتے ھیں * ۔ صاحب تاج العروس نے یہ بھی کہا ہے کہ ھر وہ پودا جو ایک سال کے اندر ھی پیدا ھوکر ختم ھو جائے یَقْطِیْنٌ کہلائیگا ۔ نیز ھر بڑا پتہ یَقْطِیْنٌ کہلائیگا ۔ قرآن کریم میں شَجَرَۃً مِنْ یَقْطِیْنٍ (۳۷/۱۴۶) آیا ہے ۔ اس سے مراد ہے چوڑے پتوں والا پودا جو سایہ دیتا ھو ۔

*تاج و راغب و محیط ۔

# ی ق ظ

اَلْیَقَظَۃُ - بیداری - یہ نَوْمٌ (نیند) کی ضد ہے - اس میں ہوشیاری کا مفہوم بھی ہوتا ہے - رَجُلٌ یَقْظٌ وَیَقِظٌ - بیدار آدمی - اسکی جمع اَیْقَاظٌ آتی ہے، بمقابلہ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) - اَبُوالْیَقْظَانِ - مرغ کو کہتے ہیں *-

# ی ق ن

یَقِنَ الاَمْرَ وَاَیْقَنَہٗ وَاسْتَیْقَنَہٗ وَتَیَقَّنَہٗ - اس نے معاملہ کو جانا اور اسکی حقیقت معلوم کر لی - یَقْنٌ وَیَقَنٌ - کسی بات کا واضح اور ثابت ہو جانا - یَقِیْنٌ - شَکٌّ کی ضد ہے - یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایہ ثبوت تک پہنچ جانا *- مَوْتٌ کو بھی یَقِیْنٌ کہتے ہیں کیونکہ ہر مخلوق پر اس کا آنا یقینی ہے اور ٹھوس واقعات ہر روز اسکی شہادت دیتے ہیں *-

سورہ انعام میں حضرت ابراهیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کے مشاہدہ کے بعد یَقِیْنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (۷۵/۶) - سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (۹۹/۱۵) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشوونما دینے والے کے قانون ربوبیت کا کامل اتباع کئے جا، حتکہ کہ تیرا دعوی (کہ اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہونگے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجائے (نیز ۴۷/۷۴) -

لہذا ایْمَانٌ کے معنی ہونگے کسی پر اعتماد کرکے اسکی بات کو صحیح مان لینا اور یَقِیْنٌ کے معنی ہونگے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجانا - لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (۱۰۲/۷) - تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے - قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں - یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۳/۲) - اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتے ہیں - اس طرح ان کا ایمان، یقین میں بدل جاتا ہے (۴/۲) - یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی - اسی

*تاج -

یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے ۔

ہم نے "ایمان" اور "یقین" میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لئے ہے ۔ ورنہ ایمان ، خود یقین ہی کا نام ہے ۔ اور یقین ، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں ۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ "یقین" "ایمان" کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ۔

## ی م م

اَلتَّیَمُّمُ ۔ قصد کرنا * ۔ اَلْیَمُّ ۔ دریا ۔ سمندر کو بھی کہتے ہیں* ۔ (۲۰/۳۹ ; ۲۸/۷ ; ۲۸/۴۰) ۔

اَلتَّیَمُّمُ ۔ کسی کام کا ارادہ کرنا ، قصد کرنا * ۔ (۲/۲۶۷ ; ۴/۴۳ ; ۵/۶)
(دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ ح)

## ی م ن

اَلْیُمْنُ ۔ برکت ۔ اَلْمَیْمَنَۃُ ۔ برکت ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمَنُ ۔ دائیں جانب ۔ اَلْیَمِیْنُ ۔ دایاں ہاتھ ۔ دائیں جانب ۔ (یَسَارٌ کی ضد ہے) ۔ نیز اس کے معنی قوت کے ہیں ** ۔ یَمِیْنٌ ۔ جمع اَیْمَانٌ ۔ قسم ۔ اس لئے کہ عرب قسم کھاتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے* ۔

سورہ کہف میں ہے ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) ۔ یعنی دائیں بائیں ۔ سورہ قصص میں ہے مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰) ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "وادی کے دائیں کنارے سے" اور یہ بھی کہ "مبارک وادی کے کنارے سے" ۔

قسم کے معنوں میں یہ لفظ (اَیْمَانُکُمْ) متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۲/۲۲۴) ۔ نکاح کے لئے عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ آئے ہیں (۴/۳۳) ۔ یعنی تمہارے عہد و پیمان بندھے اور مستحکم ہوئے ۔

برکت کے لئے اَصْحَابَ الْیَمِیْنِ (۵۶/۲۷) ۔ اور اَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃِ (۵۶/۸) آیا ہے ۔ لیکن اس کے معنی "دائیں جانب والے" بھی ہو سکتے ہیں ۔

---

*تاج و محیط ۔ **ابن قتیبہ ۔ (القرطین ج/۲ ۔ صفحہ ۱۸۰)

نیز اَلطَّوْرِ اْلاَیْمَنِ (۲۰/۵۲) ۔ زور اور قوت کے معنوں میں سورہ صفّٰت میں ہے فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (۳۷/۹۳) ۔ (ابراهیم ؑ) نے ان بتوں پر پوری قوت سے بھرپور وار کیا ۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے قَالُوْا اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ (۳۷/۲۸) ۔ وہ کہینگے تم ہمارے پاس بڑی قوت اور زبردست ذرائع کے ساتھ آیا کرتے تھے ۔ (اور اسطرح ہمیں حق کے راستے سے روک دیا کرتے تھے) ۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۔ اس کے لفظی معنی ہیں '' جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے '' ۔ بعض مقامات پر اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں ۔ کسی کے تابع فرمان ہوں ۔ (مثلاً ۲۴/۳۳ میں) ۔ لیکن بعض مقامات پر اس کے معنی غلام اور لونڈیاں ہیں ۔ سورہ نور میں ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتَابَ مِمَّامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۲۴/۳۳) ۔ تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو تم سے مکاتبت کریں ۔ یعنی ایک معاہدہ کے تحت آزادی کی تحریر مانگیں ۔

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا ۔ غلام باہر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال لیتے تھے ۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ہوا ۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان کے ہاں غلام اور لونڈیاں موجود تھے ۔ اسلام غلامی کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اُسوقت موجود تھے) یک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ۔ یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لئے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں ۔ اسلام نے اس صورت حالات کو برقرار رہنے دیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا ۔ لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے احکام دیئے کہ وہ رفتہ رفتہ آزاد ہوکر معاشرہ کا جزو بننے جائیں اور جب تک غلام رہیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے ۔ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ انہی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے ۔ ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ بھی بند ہوجانا تھا اسلئے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہنے تھے ۔ البتہ اگر اس دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان ہو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ہوں تو ان غلاموں پر یہی احکام نافذ ہو جائینگے ۔

مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے ۔ بات صاف ہو جائے گی کہ یہ احکام اُسوقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں ؛ اور بس ۔ مثلاً وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (۲۳ ; ۳۰-۲۹) ۔ وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے) ۔ مزید تفصیل کے لئے عنوان (م ۔ ل ۔ ک) دیکھئے ۔

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لئے بطور سند پیش کر دیا ۔ قرآن کریم پر اس سے بڑا اتہام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے ۔

## ی ن ع

يَنَعَ الثَّمَرُ ۔ يَيْنَعُ ۔ يَنْعاً ۔ پھل کا پک کر بالکل تیار اور توڑنے کے قابل ہو جانا ۔ اَلْيَنِيْعُ ۔ پوری طرح پکا ہوا پھل ۔ اليانع ۔ پختہ پھل ۔ سرخ *۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَيَنْعِهٖ (۶ ; ۱۰۰) پھل کا پکنا ۔ اس کا سرخ ہونا ۔

## یہود

قوم بنی اسرائیل ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''موسیٰ'' اور عنوان (ھ ۔ و ۔ د)

## یوسف علیہ السلام

حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسحٰق ۔ آپ کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف ۔ قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا) ۔ بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا (۱۲ ; ۱۵) ۔ جہاں سے اُنہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے ۔ وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد) ، مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (۱۲ ; ۵۶ ; ۱۲ ; ۱۰۱)

*تاج و محیط و راغب

اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا ۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب ؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہو گئی ۔

سورہ انعام میں حضرت یوسف ؑ کا نام انبیاء کرام کے زمرہ میں آیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دَاوُدَ وَ سُلَیْمَانَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ (۶/۸۵) ۔ اور سورہ مؤمن میں ، دربار فرعون کا مردِ مؤمن اپنی تقریر میں حضرت یوسف ؑ کا ذکر ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے ۔ (۴۰/۳۴) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے اپنا پیغام جو بینات پر مشتمل تھا قوم مصر تک پہنچایا تھا ۔

(حضرت یوسف ؑ کے کوائف حیات اور ان کے حسنِ سیرت کی داستانِ نور پاش ، میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی) ۔

## ی و م

یَوْمٌ ۔ دن ۔ طلوع آفتاب یا طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت ۔ یہ لفظ عربوں کے ہاں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ دن اور رات کی اس میں کوئی قید نہیں ہوتی ۔ صبح اور شام کی گردش بھی یَوْمٌ ہے (یعنی ایک دن) ۔ سال بھی ۔ ایک صدی بھی ۔ ہزار سال اور پچاس ہزار سال بھی ۔ وَقْتٌ اور سَاعَتٌ کی طرح یَوْمٌ کے بعد بھی اِذٍ بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اور یَوْمَئِذٍ کے معنی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو وَقْتَئِذٍ اور سَاعَتَئِذٍ کے ہوتے ہیں* ۔ گویا وَقْتٌ ۔ سَاعَۃٌ اور یَوْمٌ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں ۔ یَوْمٌ کی جمع اَیَّامٌ ہے* ۔ ابن فارس نے یَوْمٌ کے معنے دن بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ استعارۃً یہ لفظ امر عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

نیز اس کے معنی ہیں حکومت اور دولت اور زمانہ ' ولایت** ۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) میں اَیَّامٌ کے معنی حکومت و سلطنت کے لئے گئے ہیں** ۔

اَیَّامٌ ۔ وقائع (یعنی تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات یا معرکے) کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً اَیَّامُ الْعَرَبِ کے معنی وَقَائِعُ الْعَرَبِ ہیں** ۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اَیَّامُ اللّٰہِ انہی معانی میں آیا ہے ۔ مثلاً وَ ذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ (۱۴/۵) ۔ حضرت موسیٰ ؑ اور فرعون کے

*محیط ۔ **تاج ۔

معرکہ کے لئے آیا ہے ۔ یہ آیّامُ اللہ اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۵/۱۴) ۔ تاکہ کسی قوم کو اس کے کئے کی سزا مل جائے ۔ اسی لئے بعض اہل لغت نے آیّام کے معنے عقوبتیں اورسزائیں بھی کئے ہیں* ۔

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے ۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ خدا اپنے امر (ابتدائی قانون مشیت ۔ دیکھئے عنوان ش ۔ ی ۔ أ) کے مطابق جب کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے ۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کی ابتداء پست ترین نقطہ سے کرتا ہے ۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے ۔ یہ منازل ایک ایک یَوْم میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے ۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ظاہر ہے کہ یہاں ''یوم'' سے مراد دور یا مدت یا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے ۔ یہی دور بعض اوقات پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (۷۰/۴) ۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دینگے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں یَوْم کا لفظ آئے گا تو ہر جگہ اس کے معنے اس ''دن'' کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے ۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے ۔ مثلاً مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۴) کے معنے ہونگے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا رہ جائے ۔ یا وہ دور جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل و انصاف کی رو سے مرتب ہوں ۔ یا ظہور نتائج کا وقت ۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۸۲/۱۹) ۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی ۔ (مزید تصریح د ۔ ی ۔ ن کے عنوان میں دیکھئے) ۔

## یونس علیہ السلام

حضرت یونس انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں ۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہو گیا ۔ تورات میں ان کا نوشتہ ''کتاب یوناہ''

*تاج ۔

کے نام سے موجود ہے ۔ ان کا زمانہ اندازاً ۸۰۰ ق ۔ م کا قیاس کیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ ۔ ۔ (۳۷/۱۳۹) ۔

تورات (صحیفہ یوناہ) میں آپ کے متعلق تفصیلی تذکرہ آیا ہے ۔ لیکن (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو خدا کے کسی رسول کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اپنی قوم سے خشمناک ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے ارادہ سے نکلے ۔ راستہ میں کشتی میں سوار ہو گئے ۔ کشتی طوفان میں پھنس گئی ۔ ملاحوں نے (غالباً) فیصلہ کیا کہ کچھ سواریوں کو دریا میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور باقی مسافر محفوظ رہجائیں ۔ آپ کو بھی حوالہ دریا کر دیا گیا جہاں آپ کو ایک بڑی مچھلی نے دبوچ لیا ۔ لیکن آپ صحیح و سلامت کنارے تک آپہنچے ۔ دیکھئے (۲۱/۸۷-۸۸ ؛ ۳۷/۱۳۹-۱۴۶) ۔

حضرات انبیاء کرام[ؑ] کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لئے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس علاقے کیطرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لئے مساعد ہوتی تھی ۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس[ؑ] نے اپنی قوم سے ، اپنے اجتہاد کے مطابق ، ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا ۔ قبل از وقت تھا ۔ اس لئے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (۳۷/۱۴۲) ۔ نبی اکرم[ؐ] سے کہا گیا کہ آپ نے صاحب حوت کی طرح نہ ہو جانا (۶۸/۴۸) [نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ب ۔ ق]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کیطرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسکی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی ۔ (یعنی اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (۳۷/۱۴۷) ۔ انہوں نے آپ کی دعوت سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آ جاتا ، وہ ایمان لے آئے اور اس طرح انہیں مہلت مل گئی (۳۷/۱۴۸) ۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے بچگئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب ۶۹۰ ق ۔ م میں) انہوں نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا ۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) اُنہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا ۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے دریا میں سخت سیلاب آیا ۔ اور اس طرح نینوا کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا ۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸) کہکر بھی پکارا ہے ۔

## الحمد للہ

کہ

لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد بھی مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد اس کا تتمہ آپ کے سامنے آئیگا جس میں، پوری لغات پر نظر ثانی کے بعد، ضروری اضافے اور ترمیمات کی گئی ھیں۔

## اللہ کا شکر ہے

کہ

اس لغات کی تکمیل سے میری عمر بھر کی محنت محفوظ ہو گئی۔ اب "مفہوم القرآن" کی طباعت کا سلسلہ شروع ہو گا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی موجودگی میں، قرآن کریم کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہیگی۔

## یہ بہر حال

ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ مینے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ دیگر ارباب ذوق اور علم دوست حضرات، مزید غور و تدبر سے، اسے بہتر بنا سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرف آخر نہیں کہلا سکتا۔ والسلام۔

پرویز